برائے تنقید و تبصرہ

# مُرقّعِ دکن

یعنی

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے ماہنامہ

# سب رس

کا سالگرہ نمبر بابتہ جنوری ۱۹۳۹ء

زیرِ نگرانی

## ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زورؔ

مجلسِ اِدارت

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکشؔ

سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہدؔ

معین الدین احمد انصاری

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر "ادارہ" رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا
تعداد صفحات ۲۱۶ تعداد تصاویر ۸، قیمت عال

# سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ ادارہ ادبیات اردو کا علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گے

(۳) اُردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اُردو میں منتقل کر کے اُردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی یا دی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

## سب رس کی قیمت

| | سالانہ | شش ماہی | فی پرچہ |
|---|---|---|---|
| بلدہ حیدرآباد کے لئے | چار روپیے | دو روپیے | چھ آنے |
| شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ | چار روپیے آٹھ آنے | دو روپیے بارہ آنے | سات آنے |

## بچوں کے سب رس کی قیمت

| | سالانہ | شش ماہی | فی پرچہ |
|---|---|---|---|
| بلدہ حیدرآباد کے لئے | ایک روپیہ | دس آنے | ڈیڑھ آنہ |
| شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ | ایک روپیہ آٹھ آنے | بارہ آنے | دو آنے |

**محرم نمبر ۱۲/ اقبال نمبر عہ ۴/ دکن نمبر عا/**

**سب رس** کی خریداری اس میں اشتہارات کی طباعت اور ادارہ ادبیات اردو کی رکنیت یا اس کے مطبوعات کی خریداری کے سلسلے میں جو اصحاب صدر دفتر (رفعت منزل خیریت آباد) سے گفتگو یا مراسلت نہیں کر سکتے وہ حسب ذیل اصحاب سے گفتگو یا مراسلت کر سکتے ہیں۔

**بلدہ** (۱) مسٹر ایس اے کریم نمائندہ خصوصی چیلہ پورہ قریب مکان حکیم محمود ہمدانی مرحوم (۲) مسٹر ایس پی اننتا۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ (۳) رحمان کا ٹیج گھانسی بازار۔ **اضلاع** مسٹر محمد فخرالدین ارماں (روضہ شیخ) گلبرگہ شریف ان کے علاوہ نور احمد صاحب عثمانیہ ادارہ کی طرف سے علمی و ادبی دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے یہاں ادارہ کی کتابیں اور رسالے لے کر آئیں گے۔ توقع ہے کہ علم دوست اصحاب ضرور ان کی مدد کریں گے۔

# سب رس مرقع دکن نمبر جنوری ۳۹ء

## فہرست تصاویر

### اعلیحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

## ( سلاطین آصفی )



## ( وزرائے آصفی )



## ( امرائے آصفی )



## ( دیگر تصاویر )



تعداد صفحات ٢١٦ - تعداد تصاویر ٧٨ - قیمت عالی

# سب رس مرقع دکن نمبر جنوری ۳۹ء

## فہرست مضامین

---



ہز ہائینس والاشان نواب اعظم جاہ بہادر

ولیعہد سلطنت آصفیہ وشہزادۂ برار

اپنے فرزند ارجمند شہزادہ کرنل نواب مکرم جاہ بہادر کے ساتھ

# مدحِ خواجہ

معین الدینؒ ہیں قطب الدینؒ سے شاد
تو قطب الدینؒ فرید الدینؒ سے شاد
فرید الدینؒ نظام الدینؒ سے خوش
نظام الدینؒ نصیر الدینؒ سے خوش
نصیر الدینؒ مرے ممدوح سے شاد
مرے ممدوح کا تو نام رکھ یاد

مطیعِ مصطفےٰ سید محمدؒ
مطاعِ باصفا سید محمدؒ
دوئی کیسی؟ یہ ہر فردِ یگانہ
مری نظروں میں ہے قطبِ یگانہ
اُدھر جو ہے وہی ضو پاش ادھر ہے
نمودِ خواجہ ہر سو جلوہ گر ہے

سمجھ کا دُور ہو جائے اگر پھیر
تو گلبرگہ کو بھی تو سمجھے اجمیر
غرض، تنویرِ خواجہ دیدنی ہے
جدھر دیکھو اسی کی روشنی ہے
نگاہِ عارف ان جلووں کی جویا
مری نظریں بھی خوش ان سے ہیں گویا

دکھاتا ہے یہ سلطانِ طریقت
مجازی شان میں شانِ حقیقت
نزول اچھا عروج اچھا ہے اس کا
سلوک اس شان سے کامل ہے کس کا
جو یہ شہباز ہو مائل بہ پرواز
کھلے تشبیہ سے تنزیہ کا راز

عیاں خواجہ کی ہے بندہ نوازی
نہیں کس کو اُمیدِ سرفرازی
سلیمانِ دکن عثمان علی خاںؒ
فروغِ مدعائے آصفستاں
مرے خواجہ کے رُخ سے سب کا ہے ضو
دکن افروز ہے خواجہ کا پرتو

علی منظور

---

۱؎ غریب نواز ۲؎ بختیار کاکی ۳؎ گنج شکر ۴؎ سلطان المشائخ ۵؎ چراغ دہلی ۶؎ بندہ نواز ۷؎ غریب نواز اور بندہ نواز شرف مجاز وسطی ہیں ۱۲ ۸؎ خواجہ کا انتخاب میں ایک لفظ تنہا بیاز بل پرواز بھی

# ادارِیہ

سب رس کا دوسرا سال جس اہتمام کے ساتھ شروع ہو رہا ہے۔ اس کا عملی ثبوت یہ سالگرہ نمبر ہے جو دکن کے ماضی و حال کے متعلق دلچسپ اور اہم تاریخی معلومات کے لئے وقف کر دیا گیا ہے اور ہزار ہا روپیہ کے صرفہ سے تیار ہوا ہے۔ قدیم تاریخی قلمی تصویروں کے فوٹو لینے اور پھر ان کے آتشی بلاکس کی تیاری اور اُن کی چھپائی کے لئے جو وقت اور رقم صرف ہوئی ہوگی صرف اسی کا اندازہ کرنے سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ ادارہ نے اس شاندار تاریخی نمبر کی خاطر کتنا اہتمام کیا ہے اور سب رس کی زندگی اور ترقی کے لئے کس حد تک رقم کا صرفہ اور محنت کرنے کے لئے تیار ہے۔

اسی اہتمام اور غیر معمولی کوششوں میں آسانی پیدا کرنے کے سلسلہ میں ادارۂ ادبیات اردو نے نئے سال سے سب رس کی ایک مجلس ادارت بھی قائم کر دی ہے۔ جو اپنے ہر ماہ نامے کو ہر ذوق اور ہر قسم کی دلچسپیوں سے مالا مال کرنے کی طرف خاص طور پر متوجہ رہے گی۔

مجلس ادارت کے قیام کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ سب رس کا علمی و ادبی معیار بڑھتا جائے اور اس میں اردو زبان اور اردو کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ایسی مفید اور ضروری معلومات بھی درج ہوا کریں جن کا جاننا ہر تعلیم یافتہ کے لئے ضروری ہے۔ اس بارے میں ادارۂ ادبیات اردو کے مختلف شعبے سب رس کا ہاتھ بٹائیں گے۔ مثلاً شعبہ زبان اردو زبان کے ضروری اور اہم مسائل پیش کرتا رہے گا۔ شعبہ تنقید کی طرف سے اردو کتابوں پر سنجیدہ اور ذمہ دارانہ تنقیدیں شایع ہوتی رہیں گی۔ اور تمام ہندوستان کی جدید مطبوعات کی اطلاع بھی وقت بوقت دی جائے گی تاکہ معلوم ہوتا رہے کہ اردو میں کون کونسی کتابیں شایع ہو رہی ہیں۔ شعبہ تاریخ دکن ایسی مفید اور دلچسپ معلومات فراہم کرتا رہے گا جو ملک کی ترقی اور عروج کیلئے اہل ملک کی رہبری کریں گی۔ شعبۂ نسوان ہر ماہ نسوانی فلاح و بہبود سے متعلق مضامین کی فراہمی کے علاوہ اس امر کی کوشش کرتا رہے گا کہ سب رس میں نسوانی دلچسپیوں کے کافی سامان مہیا ہوتے رہیں۔

ساتھ ہی ادارہ کے تمام شعبوں کے ماہوار جلسوں کی روئدادیں بھی سب رس میں شایع ہوں گی تاکہ ہر مضمون سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب مستفید ہو سکیں۔ چنانچہ ان تمام شعبوں کی تفصیل اور ان کے جلسوں کی روئدادوں کے اہم حصے اس مہینے بھی شایع کئے جا رہے ہیں۔

یہ باتیں صرف اس لئے بیان کی گئیں کہ سب رس کے قدر دانوں کو اندازہ ہو جائے کہ سب رس کی ترقی اور اس کے مستقبل کو درخشاں بنانے کے لئے ادارہ کیا کام کر رہا ہے۔

دکن نمبر کے بارے میں زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ خود اس کا مطالعہ اس کی سفارش کرے گا۔ اتنا لکھنا ضرور ہے کہ محض اعلیحضرت ظل سبحانی سلطان العلوم آصفجاہ سابع کی علم نوازیوں اور مسیحا نفسیوں کے باعث آج ہم اس قابل ہو سکے کہ دکن کی قدیم تاریخ کو اس طرح باتصویر پیش کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مرقع دکن اعلیحضرت کے نام نامی اور حالاتِ زندگی سے شروع کیا جا رہا ہے۔ اور اس کا سرورق حضرت ظل سبحانی سلطان العلوم ہی کی تصویر سے مزین ہے۔ اس سلسلہ میں نواب سالار جنگ بہادر کی علم دوستی اور فیاضی کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ جس کی وجہ سے یہ مرقع دکن صحیح معنوں میں ایک مرقع بن سکا۔ اس کی اکثر تصویریں نواب صاحب ہی کے خزائنِ فنونِ لطیفہ سے حاصل کی گئی ہیں۔ اور نواب صاحب نے بکمال مہربانی ان کو سب رس میں شایع کرنے کی اجازت عطا فرمائی ہے۔

سب رس کے قلمی معاونین کا شکریہ بھی لازمی ہے کہ انھوں نے قلیل عرصے میں نہایت مستند دلچسپ اور مکمل مضامین تیار کر دئے۔ خاص کر دکن نمبر کی تیاری کے لئے جو مجلس مشاورت مقرر کی گئی تھی اس کے اراکین (عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ال ال بی۔ میر محمود علی صاحب ایم اے

سید سراج الدین صاحب ایم اے، سید محمد اکبر وفا قانی صاحب بی اے ال ال بی، عبدالقادر سروری صاحب ایم اے ال ال بی اور سید محمد صاحب ایم اے، ہر طرح سے مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے نہ صرف خود مضامین بلکہ دوسروں سے بھی اچھے اچھے تاریخی مضامین لکھوائے۔ مولوی غلام احمد خاں صاحب صوبہ دار اورنگ آباد کی علمی دلچسپی کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ چونکہ انھوں نے نہ صرف اورنگ آباد پر مضمون لکھے بلکہ وہاں کے مختلف مناظر اور تاریخی عمارات کی تصاویر بھی روانہ کیں۔ جن میں سے بعض اس مرقع میں یا یوں کہ دکن نمبر میں شامل ہیں اور بعض آئندہ نمبروں میں چھپیں گی

سب رس کے ناظرین یہ معلوم کرکے خوش ہوں گے کہ حیدرآباد کے مشہور آرٹسٹ مسٹر قیوم نے جس طرح اس شمارہ کے لیے عبدالرزاق لاری کی تصویر بنا دی ہے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ بھی سب رس کو اپنے حسن کارانہ کمالات سے مستفید کرتے رہیں گے

سید محمد اکبر وفا قانی صاحب اور مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب نے بھی سب رس کے اس شمارہ میں کسی نہ کسی طرح مضمون کی تیاری اور اشاعت میں مدد دینے کا ذمہ لیا ہے۔ اگرچہ وقت کی تنگی کی وجہ سے لاری کی تصویر رنگوں میں چھاپی نہ جا سکی تاہم یہ تصویر اپنی تاریخی اہمیت اور ایک مشہور آرٹسٹ کا نتیجۂ قلم ہونے کی وجہ سے قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ عبدالرزاق لاری نے تنہا اس وقت مغل فوج کا مقابلہ کیا جب غداروں نے دروازہ کھول دینے کی وجہ سے مغل فوج قلعہ میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ لاری کو عین وقت پر اس کی اطلاع ہوئی۔ وہ کھلے ہوئے دروازے کے سامنے مقابلہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ زخموں سے چور ہو گیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

اس سب رس میں ایک چیز کی کمی محسوس ضرور ہی ہوگی۔ سب رس میں بالعموم دو ہی کے ہیں۔ صنف نازک کو اس میں سوائے بچوں کے حصہ کے کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے۔ ایسا عمداً کیا گیا۔ کیونکہ ادارہ کے شعبۂ نسواں نے تصفیہ کیا تھا کہ وہ اپنا نمبر علیحدہ شائع کرے گا۔ اس لیے جملہ مضامین متعلقہ شعبۂ نسواں اور سب رس کی مجلس ادارت کی رکن محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کے یہاں روانہ کر دیے گئے۔

انھوں نے ان سب مضامین کو ایک قابل دید شکل میں مرتب کر لیا اور خواتین دکن کے دلچسپ و مفید مضمونوں اور نظموں کا یہ مجموعہ اب نذر دکن کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ اور غالباً پندرہ جنوری تک قدردانوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔ نذر دکن اپنی قسم کی واحد اور قابل دید کتاب ہوگی۔ اور سب رس کے سالانہ خریداروں کو نصف قیمت پر دی جائے گی کیونکہ وہ دراصل سب رس ہی کا ایک حصہ ہے۔

نذر دکن کے علاوہ شعبۂ نسواں کی طرف سے قریب میں اور کتابیں بھی شائع ہوں گی۔ توقع ہے کہ یہ شعبہ ملک کی علم دوست خاتونوں کے تعاون کی وجہ سے خاطر خواہ کامیاب ہوگا۔

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس عاملہ نے حسب ذیل اصحاب کو ان کی علمی و ادبی دلچسپیوں اور ادارہ کے کاموں میں خلوص کے ساتھ ہاتھ بٹانے کے پیش نظر ادارہ کا رفیق منتخب کیا ہے۔

محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ (داعی شعبۂ نسواں)، مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری ایم اے، بی ایس سی آنرز (داعی شعبۂ زبان) مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے، ایچ سی ایس (داعی شعبۂ تراجم) اور نواب کیقباد جنگ بہادر

توقع ہے کہ سب رس کا دوسرا سال نئے انتظامات اور خاص اہتمام کے باعث پہلے سال سے زیادہ کامیاب ثابت ہوگا۔

زور
سید محی الدین قادری

# اعلیٰحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخان بہادر آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

حضرت ظل سبحانی کے حالات زندگی اور عہد میمنت مہد کے متعلق اس وقت تک متعدد کتابیں اور مضامین شایع ہو چکے ہیں ہر سال ملک اور بیرون ملک میں رسائل و اخبارات کے سالنامے اور سالگرہ اقدس کی مبارک باد کے خاص نمبر شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ان سب میں حضرت بندگان عالی کی عظیم الشان شخصیت آپ کے بے مثال تدبر و سیاست، ذاتی علم و فضل شعر و سخن کی دلچسپیوں اور مذہبی و اخلاقی محاسن وغیرہ کے ہر پہلو سے متعلق تفصیلی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں اگر ان سب کو ایک جگہ کر دیا جائے تو اعلیٰحضرت سلطان العلوم کی قابل تقلید ہستی کے متعلق کئی جلدوں کی سوانح حیات مرتب ہو جائے

دوران آصفی میں اعلیٰحضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ کی ذات والاصفات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور علم و عمل و شعر و سخن کی سرپرستیوں میں حضرت جہاں پناہی نے خاص توجہ فرمائی ہے یہی وجہ ہے کہ اعلیٰحضرت خلد اللہ ملکہ کے تذکرہ کو اس موقع دکن کے لئے زیب عنوان قرار دے کر تاریخی حصہ سے بحث کرنے کی جگہ ادارہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اعلیٰحضرت سلطان العلوم خلد اللہ کی حیات کا محض علمی و ادبی پہلو بھی ایسا وسیع ہے کہ اس پر لکھنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر کئی جلدوں کی مبسوط کتاب لکھی جا سکتی ہے اگر موقع ملے تو خود ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے اس موضوع پر نہایت اجمال کے ساتھ پانچ ابواب میں ایک نذر عقیدت پیش کی جائیگی اس سوانح شاہانہ کا پہلا باب حیات سلطانی اور دوسرے چار ابواب ۲۔ اردو شاعری۔ ۳۔ اردو نثر ۴ فارسی شاعری اور ہندی شاعری پر مشتمل ہوں گے۔

**ادارہ**

خسرو دکن مشرق کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز تاجدار ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ آپ کے لئے بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام تھا اسی لئے آپ کو مشرقی و مغربی علوم میں اعلیٰ مہارت حاصل ہے۔ فارسی اور اردو زبان کے اعلیٰ شاعر ہونے کے علاوہ اپنی خداداد ذہانت و اعلیٰ قابلیت اور علوم و فنون کی سرپرستی کی بنا پر بجا طور پر سلطان العلوم کہلاتے ہیں۔

اپنے والد نواب میر محبوب علی خاں کے انتقال پر آپ ۱۹۱۱ء میں ۲۵ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے جس کو آج تقریباً ۳۵ سال کا عرصہ ہوتا ہے اس عرصہ میں حیدرآباد کی ہر جہتی ترقی حیرت انگیز ہے جو کام کہ سلطنت آصفیہ کے قیام کے زمانے سے حالیہ زمانہ تک یعنی دو سو سال کے عرصہ میں نہیں ہوا تھا وہ اس وقت ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور بندگان عالی نے اپنی غیر معمولی روشن خیالی، رواداری، بے انتہا سادہ زندگی، اعلیٰ اخلاق اور خداداد قابلیت سے حیدرآباد کی قومی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی ہے جس کی وجہ سے سارے ملک میں عام بیداری پیدا ہو گئی ہے اور سلطنت آصفیہ میں ترقی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے۔

رعایا کے نہ صرف جان و مال کی حفاظت اور ملکی ترقی کا خیال آپ کے پیش نظر رہتا ہے بلکہ تعلیمی و اخلاقی زندگی کی اصلاح اور رعایا کے آرام و آسایش کی فکر ہمیشہ آپ کے دامنگیر رہتی ہے۔ چنانچہ طبقۂ امراء اور بالخصوص نوجوانوں کو ابھی حال میں جو نصائح آپ نے فرمائے ہیں وہ آب زر سے

سمجھے جانے کے قابل ہیں۔

اعلیحضرت کی تخت نشینی کے وقت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر مدار المہام تھے۔ پھر نواب سالار جنگ بہادر (سوم) مدار المہام ہوئے۔ بعد ازاں پانچ سال تک اعلیحضرت نے نہایت جانفشانی سے یہ فرائض خود انجام دئے۔ آخر پر ۱۹۱۹ء میں باب حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد سر علی امام، سر فرید دن الملک نواب ولی الدولہ بہادر، اور پھر مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یکے بعد دیگرے صدر اعظم مقرر ہوئے۔

جنگ عظیم کے نازک موقع پر اعلیحضرت نے خاندانی روایات کے مطابق اپنی جملہ فوجیں اور تقریباً چھ کروڑ روپیوں سے سلطنت برطانیہ کی مدد فرمائی۔ اس امداد کے اعتراف میں حکومت برطانیہ نے "یار وفادار دولت برطانیہ ہز اگزالٹیڈ ہائینس" کے خطاب سے مخاطب کیا۔

اعلیحضرت کی حب الوطنی اور رعایا پروری ضرب المثل ہے چنانچہ آپ نے بادشاہ ہوتے ہی قدیم محکموں کی از سر نو تنظیم فرمائی اور بہت سے نئے نئے محکمے قائم کئے جیسے محکمہ آثار قدیمہ، محکمہ زراعت، محکمہ صنعت و حرفت، محکمہ آرائش بلدہ، محکمہ امداد باہمی، محکمہ طبابت یونانی، محکمہ لاسلکی وغیرہ۔ کئی ایک بڑے بڑے تالاب بنوائے جیسے عثمان ساگر، حمایت ساگر اور نظام ساگر وغیرہ۔ اسی طرح بے شمار عمارتیں تعمیر کیں۔ جیسے عدالت العالیہ، دواخانہ عثمانیہ، سٹی کالج، معظم جاہی مارکٹ، کتب خانہ آصفیہ، جامعہ عثمانیہ کی عمارتیں، جوبلی ہال وغیرہ۔

خوبصورت عمارتوں کی کثرت، سمنٹ کی کشادہ سڑکوں کی رونق اور ہر قسم کی عصری ترقیوں کی وجہ سے اس وقت حیدرآباد ہندوستان کا بہترین شہر بن گیا ہے جہاں مشرقی اور مغربی دونوں قسم کے تمدنوں کے نمونے موجود ہیں۔ اسی طرح اضلاع اور شہر میں آمد و رفت کی بہت کچھ سہولت پیدا ہوگئی ہے۔ چنانچہ ریلوں اور سڑکوں کا ایک جال سارے ملک میں بچھا دیا گیا ہے اس طرح دور عثمانی میں عمارتوں کی تعمیر اور رعایا کی خوش حالی اور ترقی کو دیکھ کر عہد شاہجہانی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

اعلیحضرت نے پچیس سالہ کامیاب حکومت کا جشن "سلور جوبلی" منایا جاکر ابھی پورے دس سال کا عرصہ نہیں ہوا ہے کہ اس جشن سیمیں کے بعد رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نواز جنگ بہادر کو صدر اعظم مقرر فرمایا گیا ہے۔ سر اکبر نے صدارت عظمیٰ سے قبل ملک میں اشاعت تعلیم، قیام جامعہ عثمانیہ اور ریاست کے مالیہ کے استحکام اور دیگر اصلاحات کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے وفاق کے سلسلہ میں کئی دفعہ لندن جا جاکر آپ نے ریاست کے مفاد کی بھی بہت کچھ حفاظت کی ہے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں حکومت برطانیہ اور اعلیحضرت کے درمیان یہ معاہدہ ہوا کہ "برار میں انگریزی جھنڈے کے ساتھ حضور نظام کا جھنڈا بھی بلند ہوگا۔ اور ولی عہد بہادر ہز ہائینس پرنس آف برار کا خطاب اور اعلیحضرت ہز اگزالٹیڈ ہائینس نظام آف حیدرآباد و برار کا خطاب اختیار فرمائیں گے"۔ اسی طرح علاقہ ریزیڈنسی کی واپسی بھی اعلیحضرت کے زمانے کی ایک بڑی یادگار ہے۔

اعلیحضرت کی تقلید میں خاندان شاہی کے دیگر اراکین بھی ترقی ملک کے لئے ہمہ تن مصروف ہیں چنانچہ ولیعہد سلطنت ہز ہائینس پرنس آف برار والا شان اعظم جاہ بہادر کی سپہ سالاری میں فوجوں کی بہت کچھ اصلاح اور ترقی عمل میں آئی ہے۔ شہزادہ والا شان نواب معظم جاہ بہادر کی میر مجلسی میں محکمہ آرائش و بلدیہ حیدرآباد کے اشتراک عمل سے غربا کی زندگی کو بہتر بنانے، بہبودی اطفال کے مرکز قائم کرنے، معظم جاہی مارکٹ کو ایک نمونے کی مارکٹ بنانے اور شہر کی عام رونق میں اضافہ کرنے میں سرگرم عمل ہے۔ ترکی شہزادیوں یعنی شہزادی ہز ہائینس در شہوار اور شہزادی نیلوفر کی رہنمائی کی وجہ سے حیدرآباد کے طبقۂ نسوان میں بہت کچھ بیداری، اصلاح

اور ترقی کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے ہیں چنانچہ انجمن خواتین حیدرآباد کی سرگرمیاں اس کا بدیہی ثبوت ہیں۔ اسی طرح سے اعلیٰحضرت نے اپنے بھائی صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر کو جو بیدا تعلیمی کمیٹی کا صدر اعلیٰ مقرر فرمایا ہے جن کی صدارت میں بہت کچھ مفید کام کیا جا رہا ہے۔ غرض ۸۲ ہزار مربع میل سے زائد رقبہ ملک پر اعلیٰحضرت کے نام کا سکہ جاری ہے۔ اور تقریباً ڈیڑھ کروڑ رعایا قانون آصفی کے تحت عدل و انصاف سے مستفید ہو رہی ہے۔

صرفِ خاص مبارک، پائیگاہوں، جاگیرات اور سمستانوں کے قطع نظر محض علاقہ دیوانی کی آمدنی اس وقت (۹) کروڑ روپے سالانہ سے زائد ہے جس کی وجہ سے خزانہ معمور ہے اور قوم سازی کے بہت سے کام ہو رہے ہیں۔ زراعت پیشہ طبقہ کی مشکلات کو بڑی حد تک دور کیا گیا ہے صنعت و حرفت کی ترقی کی طرف بھی خاص توجہ کی گئی ہے چنانچہ اس وقت بہت سی صنعتیں جاری ہیں اور بعض بڑے بڑے کارخانہ جات کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے اسی طرح تجارت کیا بلحاظ درآمد اور کیا بلحاظ برآمد ترقی پر ہے

اعلیٰحضرت بندگانِ عالی کی سرپرستی اور فیاضی کا یہ عالم ہے کہ ریاست کے باہر بھی جو باشندے یا جو ادارے مستحق ہیں ان کو یہاں سے مالی امداد دی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ حیدرآباد قدیم کی روایت برقرار ہیں اور بعض امور میں حیدرآباد جدید، دوسری ریاستوں اور برطانوی ہند سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے جیسا کہ انتظامی اختیارات کی علیحدگی کا مسئلہ ہے۔ اس پر اکتفا نہیں بلکہ اس وقت دستوری اصلاحات کے نفاذ اور مزید معاشی ترقیات کی تحریکات پر غور کیا جا رہا ہے۔

آخر پر اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ مبارک دورِ عثمانی کا سب سے اہم اور لافانی کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے جہاں سارے علوم و فنون کی تعلیم ملک کی عام فہم اور سرکاری زبان یعنی ہندوستانی (اردو) کے ذریعہ دی جاتی ہے۔

اس بیس سال کے عرصہ میں جامعہ عثمانیہ نے جو ترقی کی ہے اور اس کو اندرون و بیرون ملک جو غیر معمولی کامیابی اور عام مقبولیت نصیب ہوئی ہے وہ تاریخ میں اپنی آپ نظیر ہے ؎

زندہ کردی چوں مسیحا علم و فن را در دکن
زندہ باش اے حضرتِ عثمان علی خاں زندہ باش

**میر محمود علی**

## سب رس کے گذشتہ سال کے پرچے

سب رس کے گزشتہ پرچوں کی ابھی سے مانگ بڑھ گئی ہے۔ نومبر اور ڈسمبر کے پرچے اصلی قیمت میں خرید لیے جائیں گے۔ اگر کسی صاحب کے یہاں اچھی حالت میں ہوں اور وہ ان کو نکالنا چاہتے ہوں تو دفتر کو مطلع فرمائیں۔ دوسرے مہینوں کے پرچوں کو بھی حفاظت سے رکھئے۔ آئندہ طلب کئے جائیں گے۔

مہتمم

# تمدنِ ہند میں دکن کا رتبہ

تاریخ ہند کی یہ کھلی حقیقت ہے کہ دکن تہذیب ہند کا تنہا محافظ ہے۔ اس حقیقت کو ہم حال اور مستقبل کے آئینہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ تاریخ ہند جو انگریزی اقتدار کا فدیہ بنی ہوئی ہے، ہمارے ماضی کی تقسیم فرقوں کی مذہبیوں سے کرتی، اور اس تنگ نظری کی وجہ سے تاریخ کا تہذیبی پہلو اجاگر نہیں ہوتا۔ ایک وطن پرست تہذیبی تقسیم کے لحاظ سے ہندوستان کو ان عنوانات کے تحت مطالعہ کر سکتا ہے۔ ویدوں کا دور، مثنویوں کے ذریعے ہندوستان ماسبق کی تہذیب، گوتم بدھ کا ہند، ہند کا نشاۃ ثانیہ اور آخر میں وہ تہذیب جو ویدانت اور توحید کے تخیل سے پیدا ہوئی۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس دوسری تقسیم کے تحت ہندوستانی تہذیب میں دکن کی اہمیت پر روشنی ڈالیں۔

آریائی قوم دنیا کی ان بڑی اقوام میں سے ہے جس نے ایک خاص رنگ اور نہج کی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ انسان کائنات اور ان سب کے خالق کے متعلق ان کے نظریوں نے دیومالے پیدا کئے اور یہی دیومالے ایک ایک تمدن کی بنیاد بن گئے۔ مغرب میں یونان اور مشرق میں ہند۔ یہاں پر چونکہ آریائی تمدن سے اصل بحث نہیں ہے اس لئے مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ آریائی تہذیب نے چاروں کی معاشرتی تنظیم کے ذریعے ایک مستقل تمدن پیدا کیا۔ دکن نے اس تمدن کے ابتدائی خط و خال کو خود میں جذب کیا۔ افسانوی دور میں رامائن کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شہ کار مثنوی کا ایک نمایاں ہیرو ہنومان ہے۔ دکن کا یہ راجہ رام کو مدد دیتا ہے۔ صداقت کی تلوار ہے اور مظلوم عورت یا آریہ عورت کی ناک کو دشمنوں سے چھڑاتا ہے اور اس کے صلہ میں آریا اس کو دیوتا بنا دیتے ہیں۔ لیکن اس واقعے سے یہ ثابت ہے کہ دکن نے اپنی جگہ میدانوں میں بسنے والے خوددار متمدن اور دوسروں کو تیغ تلے ... اپنے آریاؤں کو اپنی انسانیت سے منوایا اور اپنی تمدن نوازی کو ثابت کیا۔ اس کے بعد دوسری بڑی مثنوی مہابھارت ہے۔ اس میں بھی دکن نمایاں ہے۔ پانڈوؤں کو دیس نکالا ہوتا ہے تو دکن میں پناہ ملتی ہے اور دوارکا کا روحانی اور بانکا ... پانچ بھائیوں کو سوکھا ... صحیح لیکن ان کا اثر دکن پر دیکھئے کہ یہاں کا ایک ایک مقام انہیں مثنویوں کی وجہ سے مقدس بن گیا۔ مندر جو قدیم تمدنوں ... تھے۔ لاتعداد شکل میں پیدا ہوگئے۔ ہر وہ مقام جہاں رام، سیتا اور لکشمن پہنچے مقدس بن گیا اور وندھیاچل سے لے کر ... ہندو تہذیب کے مختلف اور مستقل ادارے پیدا ہوگئے۔ جنھوں نے آریاؤں کا مذہب، فلسفہ، علوم، ادب، شاعری اور جملہ شعبہ ہائے حسن کاری کو نمونہ اور غیر متبدل بنا دیا۔ اس طرح بیدر نل اور دمینتی کے لافانی عشق کی وجہ سے امر بن گیا۔

افسانوں سے نکل کر جب ہم تاریخ پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہی سے دکن بیرونی اعدا سے محفوظ رہا اور اکثر اوقات یہی ہوا ہے کہ دکن نے شمالی ہند کے میدانوں پر بھی اپنا سیاسی اقتدار جما لیا۔

بدھ مذہب وہ پہلی روحانی تحریک ہے جس نے آریاؤں کی طبقہ واری تقسیم اور آریا اور غیر آریا کے تعصبی فرق مدارج کو دور کر کے ہندوستان کو ایک قومیت میں لانے کی کوشش کی۔ لیکن دکن باوجود اشوک کی کامیابی کے اس ہمہ گیر تحریک کو ... تہذیبی حد تک قبول کر سکا اور ماضی کے تمدنی روایات کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ یہی وجہ تھی کہ باوجود بدھی حسن کاری کے خزانے کے ایلورا، اجنتا دکن میں ہونے کے وہ بدھ تمدن کے تحت آریائی تہذیب کو معدوم نہ ہونے دیا اور جب کبھی موقع ملا۔ از سر نو دکن نے قدیم ہندو عصبیت اور طبقہ واری تمدن کو تمام ہندوستان پر مسلط کر دیا۔ شنکر اچاری کی تحریک حقیقت میں دکن کے بدھ مت پر روحانی تیغ تھی۔ یہ دکن کا انتقام تھا۔ ہماری موجودہ بحث کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ ہندوستان کا یہ سطح مرتفع نہ صرف بلند ہے بلکہ تہذیب دکن کا سپہ دار بھی ہے۔

اس کے بعد وہ دور آتا ہے جب کہ ہندوستان قدیم اور ایشیا کا وہ تمدن جو عرب کی سرزمین سے نکل کر پورے تمدن عالم پر چھا گیا ہو گیا۔ ہندوستان میں ضیا پاشیاں شروع کرتا ہے۔ اسلام ایک ایسا ہمہ گیر سیل رواں ہے جو ہر جگہ مقام اور حالات کے لحاظ سے بظاہر اپنی شکل کو تو بدلتا ہے لیکن فطرت نہیں بدلتا۔ ہندوستان میں بھی اس نے یہاں کی تہذیب میں آکر ایک نیا روپ اختیار کیا اور ایک مستقل اور ہندوستانی تہذیب کی بنا ڈالی۔ دکن میں سب سے پہلے مسلمان جن کو تہذیبی اعمال کا موقع ملا وہ ترک ہیں۔ جو ہندوستان کی تاریخ میں غلام خاندان کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں ترکان دکن نے اس سرزمین کی تہذیب میں ایک چیز کا اضافہ کیا موسیقی، رنگ کاری، آذری، یہاں پہلے ہی سے موجود تھی۔ لیکن پرشکوہ تعمیر کاری کا رواج ترکوں سے شروع ہوا اور دنیا کی سب سے بڑی گنبد، بولی گنبد بیجاپور پر ختم ہوا۔ اس دور میں علاوہ اور چیزوں کے ہندوستانی قومیت کے لیے وہ انمول شئے پیدا ہوئی جس کو قومی زبان کہتے ہیں اور پراکرت، ترکی، فارسی اور عربی عام فہم الفاظ، محاورے اور لسانی اجزا مل کر ہندوستان کی قومی زبان بن گئی ہے جس کو ابتدا میں دکھنی پھر ریختہ، اور اس کے بعد اردو کا نام نصیب ہوا۔ اور موجودہ دور تعصب میں ہندوستانی ہندی، ہندی ہندوستانی کی الجھن میں پھنس گیا۔

یہ مختصر سا خاکہ اس امر کے لیے کافی ہے کہ ایک سوچنے والا اور تجسس کرنے والا عالم اس کو ابتدائی خط و خال سمجھ کر آگے بڑھے اور ایک اور مبسوط کارنامہ پیش کرے جس سے دکن اور اہل دکن کو معلوم ہو کہ حقیقت میں ہندوستانی تمدن میں ان کا درجہ اور رتبہ کیا ہے اور ہندوستان کے مستقبل کے سنوارنے میں ان کی کیا ذمہ داری ہے۔

**سید محمد اکبر وفاقانی**

---

# دکن قدیم اردو شاعروں کی نظر میں

ملا وجہی ملک الشعرائے عہد محمد قلی قطب شاہ مصنف قطب مشتری

(سنہ ۱۰۱۸ھ) و سب رس (سنہ ۱۰۴۵ھ)

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں ۔ پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
مقام ۔ وجود

دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ ۔ انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہے لگ

دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے ۔ کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے
سجی ۔ اور

دکھن ملک بہوتچ خاصا اہے ۔ تلنگانہ اس کا خلاصا اہے
بہت ہی

---

طبعی شاعر عہد ابوالحسن قطب شاہ مصنف بہرام و گل اندام

(سنہ ۱۰۸۱ھ)

جو کوئی یاد کرتا نہیں اپنا وطن ۔ او مردہ ہے پیرن ہے اس کا کفن
نہیں ۔ پیرہن

اگر کوئی غربت میں شاہی کرے ۔ اگر مال ہور ملک لاکھاں دھرے
اور

ایس کوں دیکھے کھل کر انکھیاں ۔ دیوے خاک تن کا وطن کا نشاں
کھول کر ۔ آنکھیں

وطن سب کوں دنیا میں پیارا اہے ۔ سفر ہے سو جوں بادبارا اہے

# اجنتا

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں     جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں     جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں
جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

شرابِ شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں     بہارِ زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں
نوائے سرمدی آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں     بیاں ممکن نہیں وہ لطف آتا ہے دعاؤں میں
یہاں صدیوں سے رائج پرسکوں شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرہ ذرہ مظہرِ شانِ جمالی ہے

در و دیوار پر ہیں نقشِ حسن و عشق کی گھاتیں     پیامِ زندگی دیتی ہیں شرمیلی ملاقاتیں
جواں برسات کے دن، جان لیوا چاندنی راتیں     فضا میں ہر قدم پر گونجتی ہیں دلنشیں باتیں
یہاں پیری پہ ہو جاتا ہے دھوکہ نوجوانی کا
سبق دیتا ہے ہر چہرہ حیاتِ جاودانی کا

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقشِ لاثانی     تصدق جن کے ہر خط پر تحیر خانۂ مانی
مشکل ہے شباب و حسن میں تخئیلِ انسانی     تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی
گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بہانہ مل گیا دستِ جنوں کو حسن کاری کا — اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصلِ بہاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بے قراری کا — سکھایا گر اسے جذبات کی آئینہ داری کا

دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں کر دی
جگر داروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں کر دی

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جاں بھر دی ہے — ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذتِ دردِ جگر دی ہے — کھلیں گے راز اس ڈر سے دہن پہ مہر کر دی ہے

یہ تصویریں بظاہر گو یونہی خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کے بھید کہتی ہیں

کرشمہ ہے یہ سب اہلِ جنوں کی سعیِ پیہم کا — جنہیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی و غم کا
دلوں پر عکس کھینچ آیا تھا جن کے حسنِ عالم کا — قلم کو نقش از بر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا

چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں

جہاں چھوڑا خوشی سے عشق کے پیغام کی خاطر — خوشامد اہلِ دنیا کی نہیں کی نام کی خاطر
نہ چھانی خاک در در کی کسی انعام کی خاطر — جئے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر

زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

سکندر علی وجد

# دکن کی قدیم تاریخ

## دکن کا قدیم جغرافیہ

دکن سنسکرت زبان میں دکشینا کہلاتا ہے یعنی جنوبی علاقہ یعنی وہ علاقہ جو دریائے نربدا کے جنوب میں واقع ہے۔ سنسکرت اور بعض دوسری کتابوں میں اِس علاقہ کا نام دکشینا پتا بھی ہے یعنی جنوبی علاقہ۔ پراکرت زبان میں اس علاقہ کا نام دکھینا بادہا (DAKKINA BADHA) ہے۔ یونانیوں نے اسے دکھینا باڈس (DAKHINABADES) لکھا۔ فاہیان نے اسے اپنے سفرنامہ میں سنسکرت کی تقلید میں صرف TA-TH لکھا جو دکشینا کا مترادف ہے۔

قدیم ہندو جغرافیہ نویس نربدا کے جنوبی حصے کو دکن کہتے ہیں مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے دوران میں دکن کے علاقہ کو صرف کرشنا ہی تک قرار دیا اور حالیہ مورخین بھی دکن سے وہ علاقہ مراد لیتے ہیں جو دریائے نربدا اور کرشنا کے درمیان ہے بعض مورخین دکن کی سرحد کو بالا گھاٹ تک قرار دیتے ہیں اور بعض نے میسور کے شمالی حصہ کو بھی دکن میں شامل کیا ہے۔ جغرافی نقطۂ نظر سے یہہ سرزمین سطح مرتفع دکن کہلاتی ہے کیونکہ یہہ سمندر کی سطح سے زمین ہزار سے پانچ ہزار فیٹ تک بلند ہے۔ عام طور پر ریاست حیدرآباد کو دکن کہتے ہیں

دکن کی سرزمین پہاڑی ہونے کی وجہہ سے یہہ قیاس کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں کوہ آتش فشاں بکثرت تھے۔ انہی پہاڑیوں کے بعض حصے تیز ہواؤں اور بارش کے عمل سے صدیوں بعد زرخیز اور قابل رہائش ہوئے۔ یہہ علاقہ کوہستانی ہونے کی وجہہ سے یہاں کی آب و ہوا خشک ہے۔ اونچے پہاڑیوں کے نہ ہونے سے بارش کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ اس ملک کو نربدا، تاپتی، گوداوری، کرشنا اور ان کے معاون سیراب کرتے ہیں۔ علاقہ دکن پہاڑی ہونے کے باعث بے حد نشیب و فراز ہے جس کی وجہ سے دریا اور ندیاں سرعت سے بہتی ہیں۔ ان کا دار و مدار کلیتہً بارش پر ہے ان میں برسات میں بار بار طغیانیاں آتی ہیں اور گرما میں یہہ پایاب ہو جاتی ہیں۔ انہی وجوہات کی بناء پر یہہ ندیاں کشتی رانی کے قابل نہیں۔

دکن کے شمال میں بندھیاچل اور ست پڑا پہاڑ ہیں اور اس کے مشرق و مغرب میں مشرقی و مغربی گھاٹ ہیں اور جنوب میں دریائے کرشنا ہے جو جنوبی ہند کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ شمال میں کوہ بندھیاچل دکن کی اس طرح حفاظت کرتا ہے جس طرح ہمالیہ ہندوستان کی۔ علاوہ ازیں اس پہاڑ کے باعث ہندوستان دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ غرض بندھیاچل دو مختلف تمدنوں دو مختلف آب و ہواؤں، زمینوں اور اقوام کو ایک دوسرے سے علحدہ کرتا ہے۔ شمالی پہاڑوں اور دریاؤں کے دشوار گزار راستوں کے باعث دکن کا تمدن بڑی حد تک محفوظ رہا۔ یہاں کے قدیم باشندے دراوڑی اسی باعث خارجی اثرات سے محفوظ رہے۔ یہہ اقوام تقریباً اب تک اپنے قدیم اعتقادات، رسم و رواج، اور عادات و خصائل پر قائم ہیں اسی طرح کرشنا کے حائل ہونے سے انتہائی جنوبی ہند کے تمدن میں بہت زیادہ قدامت ہے اس لئے کہ شمالی ہند کے بہت کم فاتحین نے اس طرف توجہہ کی۔

آریا وسط ایشیا سے افغانستان آنے اور پنجاب سے ہوتے ہوئے دوآب کے علاقے میں آباد ہوئے۔ دریائے سرسوتی اور تھانیسر کا درمیانی علاقہ ان کا مقدس مقام تھا یہیں ان کے عقائد اور مذہبی تصورات کا آغاز ہوا۔ رفتہ رفتہ یہہ بندھیاچل تک پھیل گئے لیکن دکن کے شمالی پہاڑوں نے ایک عرصہ تک ان کی روک تھام کی جب آریا جنوب میں داخل ہوئے تو پہلے برار کی وادیوں میں سکونت اختیار کی اس کے بعد اور آگے بڑھے۔ رامائن اور مہا بھارت میں بھی اس دکھنی سرزمین کا تذکرہ ہے۔ رامائن سے عقیدت کے باعث شعرائے اِس علاقہ کو جنت نشان بنانے میں کسر اٹھا نہ رکھی۔ آریاؤں کی آمد کے وقت جنوب میں منظم معاشرت و حکومتیں تھیں

دکن کی قدیم ترین وحشی قومیں گونڈ، بھیل، سنتال اور ٹوڈا ہیں۔ جو اب بھی جنگلوں اور پہاڑوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں اب بھی وہی اگلی بربریت ہے جب آریاؤں نے شمالی ہند میں اپنے قدم جمائے تو قدیم باشندوں یعنی دراوڑیوں کو سوائے جنوب کی طرف راہِ فرار اختیار کرنے یا ان کے تابع ہو کر غلام بنے رہنے کے کوئی اور صورت نہ تھی۔ اسی طرح جب دراوڑ بھی جنوبی ہند میں داخل ہوئے تو انھوں نے بھی آریاؤں کی طرح یہاں کے قدیم باشندوں پر جبر و زیادتی کی ہوگی ایک عرصہ بعد آریاؤں نے جنوبی ہند کا رخ کیا جہاں انھیں قدیم حکومتوں سے سابقہ پڑا جن سے انھوں نے ربط و اتحاد قائم کیا۔

دکن کی قدیم تاریخ بالکل تاریک ہے۔ جس طرح ہندوستان قدیم کی کوئی ہم عصر تاریخی تصنیف نہیں اسی طرح قدیم دکن کی بھی لہٰذا دکن کے قدیم خاندانوں کا حال معلوم کرنا بہت مشکل ہے البتہ تاریخ سے متعلق چند پراگندہ اوراق ملتے ہیں جن کا مرتبہ افسانوی ہے اور کچھ مختصر حالات شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ کتبات سے جو چٹانوں اور تانبے کے پتروں پر کندہ ہیں یہاں کی مذہبی اور معاشرتی تحریکات پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ان تحریکات کی سرپرستی کرنے والے حکمرانوں کے واقعات بھی معلوم ہوجاتے ہیں قدیم سکوں سے حکمرانوں کے نام اور ان کے سنین ظاہر ہوتے ہیں جس مقام سے یہہ سکّے برآمد ہوتے ہیں ان سے حکمرانوں کے حدود سلطنت یا اثرات کا پتہ لگتا ہے۔ پرانوں سے بھی چند بڑے راجاؤں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ سنسکرت ادب کی جن حکمرانوں نے سرپرستی کی ان کے بھی واقعات سنسکرت کی کتابوں میں چیدہ چیدہ ملتے ہیں۔ نیز بعض چینی کتابوں میں صرف مذہبی معاملات کی حد تک ان راجاؤں کے حالات لکھے ہوئے ہیں جنھوں نے جین مت کی حمایت کی لیکن ان میں کوئی ترتیب و تنظیم نہیں، پہلی صدی عیسوی میں بدھ مت جب چین میں مروج ہوا تو بہت سے چینی سیاح بدھ کے مقدس مقامات کی زیارت کرنے کے لئے ہندوستان آئے ان سیاحوں نے جنوب کی بھی سیر کی اور لنکا تک گئے ان کی تحریروں سے بھی دکن کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اشوک کے تیسری صدی ق م کے کتبوں میں دکن کی بعض حکومتوں کا تذکرہ ہے۔ بعض یونانی اور رومی مورخین کے بیانات سے پانچویں یا چھٹی صدی ق م تک کی حکومتوں کے واقعات ظاہر ہوتے ہیں۔ باوجود ان ماخذوں کے دکن کے چند ایسے علاقے رہ جاتے ہیں جن کی قدیم تاریخ کا پتہ لگانے کا کوئی ذریعہ نہیں

دکن میں مختلف اقوام آباد ہیں جن کی مختلف زبانیں ہیں اور انہی زبانوں کے اعتبار سے یہاں کے علاقے موسوم ہیں۔
بیدر سے اوپر شمال مغربی علاقہ میں مرہٹی زبان بولی جاتی ہے۔ یہہ علاقہ مہاراشٹر کہلاتا ہے، اس میں برار کا ایک حصہ، بگلانہ اور کونکن کا علاقہ شامل ہے، تلنگانہ کا علاقہ مہاراشٹر کے مشرق میں ہے اس میں اندھرا اور کلنگ سلطنتیں تھیں یعنی دریائے گوداوری

جنوب میں آندھرا سلطنت اور شمال میں کلنگ، مسلمانوں کے دور میں تلنگانہ کا مرکز ورنگل تھا، کنڑی علاقہ بیدر سے ادھونی تک اور مغرب میں دریائے کرشنا کے منبع تک پھیلا ہوا ہے تلنگانے کے نیچے تامل علاقہ ہے جو راس کماری تک ہے۔

ان علاقوں پر مختلف زمانوں میں مختلف حکمرانوں نے حکومت کی، اشوک کے کتبات اور قدیم پرانوں کے دیکھنے سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ جنوب کے قدیم ترین حکمران پانڈیا، چولا اور چیرا ہیں، ان کا تمدن ۵۰۰ ق م سے بھی پہلے کا ہے، یہاں ۲۵۰ ق م میں بدھ مت کی تعلیم و تلقین کے لئے اشوک نے مبلغین بھیجے جنھوں نے یہاں کے باشندوں کو بدھ مت کے فلسفہ کی تعلیم دی اس زمانہ میں دکن ڈنڈا آرانیا ( DANDAKARANYA ) یا ڈنڈکا (DANDAKA) یعنی صحرائے ڈنڈا کہلاتا تھا۔

## آندھرا سلطنت

رامائن میں لکھا ہے کہ گوداوری اور کرشنا کے درمیان اندھرا خاندان حکومت کرتا تھا جس سے یونانی جغرافیہ نویس بھی واقف تھے، قدیم تاریخی دستاویزوں کے دیکھنے سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ اندھراؤں کی حکومت تقریباً ۱۸۰ ق م سے شروع ہوئی۔ انھوں نے دھنیاکٹکا ( DHANYAKATAKA ) کو اپنا مرکز قرار دیا جو دریائے کرشنا پر تھا۔ ان کی سلطنت شمال میں بندھیاچل سے جنوب میں دریائے کرشنا تک، مشرق میں خلیج بنگال سے مغرب میں بحیرۂ عرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ پروفیسر بھنڈارکر کا خیال ہے کہ اندھرا خاندان دکن پر ۲۳۰ ق م سے ۲۱۸ء تک برسر اقتدار رہا۔ مہاراشٹر اور تلنگانہ کا تمام علاقہ ان کے تابع تھا۔ ونسنٹ اسمتھ کا خیال ہے کہ اندھرا کا پائے تخت سری کاکولم تھا جو دریائے کرشنا پر واقع تھا۔ شاید دھنیاکٹکا کا نام بدل کر سری کاکولم ہوگیا ہو یا بدل گیا ہو۔

اس زمانہ میں گجرات اور بمبئی کے علاقہ میں ستراپوں کی حکومت تھی۔ ستراپ کے معنی صوبہ دار کے ہیں۔ یہہ ایرانی لفظ ہے۔ اندھرا خاندان کے ایک حکمران بل بائے کرنے ۱۲۶ء میں ستراپوں کے علاقہ مہاراشٹر پر قبضہ کیا اسی زمانہ میں مالوہ میں ایک اور ستراپ خاندان حکمران تھا۔ اس خاندان کے ایک راجہ رودرادامن اول نے جس کا پائے تخت اجین تھا اندھرا خاندان کے راجہ سے مہاراشٹر کا علاقہ چھین لیا، جب تلنگانہ کے اندھرا خاندان میں یجن سری یا یجنا سری ۱۷۲ء میں برسر اقتدار ہوا ( جس کا عہد حکومت ۲۰۲ء تک ہے ) تو اس نے مالوہ کے ستراپوں سے جنگ کی اور ان کی سلطنتوں کے بعض صوبے اپنی سلطنت میں شامل کرلئے۔

دکن میں دو آندھرا سلطنتیں تھیں، ایک مشرق میں جس کا پائے تخت دھنیاکٹکا تھا اور دوسری مغرب میں جس کا مرکز پیتھان ( PAITHAN ) تھا جو اب پٹن کہلاتا ہے اور صوبہ اورنگ آباد کے ایک تعلقہ کا مستقر ہے، پٹن دریائے گوداوری کے شمالی کنارے پر ہے۔ یہہ پرتستان ( PRATISTHAN ) بھی کہلاتا ہے یہہ دکن کا قدیم ترین شہر ہے اشوک نے اپنے مبلغ یہاں بھی بھیجے تھے، بطلیموس ( PTOLEMY ) کے قول کے مطابق یہہ آندھرا بادشاہ پلومائی ( PLUMAYE ) دوم کا پائے تخت اور اہم تجارتی مرکز تھا۔ یہہ مشہور آندھرا راجہ سلماہانا ( SALMAHANA ) کی جائے پیدائش ہے اور اس کا پائے تخت بھی رہا۔ اب بھی یہاں بہت سے منادر اس کی قدیم عظمت کی یادگار ہیں۔ آندھرا خاندان کا کب اور کس طرح خاتمہ ہوا کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔

جب کہ آندھرا سلطنت عروج پر تھی شائد راشٹراکوٹ سلطنت اس کی باجگزار تھی جس کا علاقہ بندھیاچل کے شمال وجنوب میں تھا، اٹ قوم یا راشٹراکوٹ سلطنت کے شمال میں گپتا حکومت تھی ان کے علاوہ ایک اور خاندان کدمب پانچویں صدی عیسوی میں مرہٹہ علاقہ میں برسر اقتدار تھا جن کا مرکز ہالسی تھا اس سلطنت میں کنڑ اور میسور کا علاقہ شامل تھا۔

اسی پانچویں صدی عیسوی میں پلوا کو عروج حاصل ہوا اور اس نے آندھرا کے مشرقی پائے تخت اور علاقوں پر قبضہ کیا۔ آندھرا دور میں ملک کی تجارتی حالت بہت اچھی تھی۔ یہاں ایشیا، مصر، روم، یونان، چین اور دوسرے مشرقی مقامات سے سفراء آتے تھے شام میں جنگ میں ہندوستانی ہاتھیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ آندھرا سلطنت کے بعض علاقوں میں رومی سکے بھی دستیاب ہوئے ہیں پروفیسر بھنڈارکر کے قول کے مطابق آندھرا کے خاتمہ کے بعد تین سو سال تک دکن کے حکمران خاندانوں کا حال معلوم نہ ہوسکا۔

## چالوکیا

دکن کی سلطنتوں کے حالات وضاحت کے ساتھ چھٹی صدی عیسوی کے وسط سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں خاندان چالوکیا حکمران تھا۔ چالوکیا یا سولنکی کا تعلق چاب قوم سے ہے جو گرجر کی ایک شاخ ہے، گرجر جو شمال مغربی ہندوستان میں زیادہ آباد ہیں ان کا تعلق ہون سے ہے۔ شمالی ہند کے پرہار اور راجپوت قبائل دراصل ان وحشی اقوام کی تبدیل شدہ شکل ہیں جو پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان میں داخل ہوئی تھیں ان میں سے ادنیٰ درجہ کے لوگ گرجر کہلاتے ہیں اور اعلیٰ درجہ کے راجپوت چالوکیا خاندان کا ابتدائی تعلق شمالی ہند کے راجپوتوں سے ہے جو کچھ عرصہ بعد دراوڑیوں میں خلط ملط ہوگئے۔ چالوکیا نقل مقام کرکے راجپوتانہ سے دکن آئے۔ اس خاندان کی بنیاد ایک سردار پلکیسن اول نے ڈالی۔ یعنی ۵۵۰ء میں واتاپی ضلع بیجاپور (موجودہ مقام بادامی) پر قابض ہوکر اس نے ایک چھوٹی سی سلطنت قائم کی اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے پلکیسن نے اشومیدھ کی رسم منائی تھی اس کے دونوں بیٹوں کیرتی وامن اور منگلیس کے عہد میں سلطنت مشرق اور مغرب کی طرف پھیلی۔ کیرتی ورمن اول ۵۶۶ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ زبردست جنگجو تھا۔ ایک کتبہ میں لکھا ہے کہ اس نے جنوب کے تمام قبائل اور اقوام کو تابع کیا۔ مشہور بدھی راہب دھرماگپتا اسی کے عہد میں گزرا ہے جو مذہبی کتابوں کا چینی زبان میں ترجمہ کرتا تھا کیرتی ورمن وشنو کی پوجا کرتا تھا۔ اس نے بادامی میں ایک غاری مندر تعمیر کروایا، منگلیس نے کونکن اور مغربی گھاٹ کا کچھ علاقہ بھی سلطنت میں شامل کیا۔

منگلیس کے بعد کیرتی ورمن کا بیٹا پلکیسن دوم تخت نشین ہوا۔ اس نے ونگی پر قبضہ کیا اور اپنے بھائی وشنو وردھن کو وہاں کا نائب السلطنت بنایا جس کا صدر مقام پشٹپور تھا جو اب ضلع گوداوری میں پیتھاپورم کہلاتا ہے۔ ۶۱۵ء میں وشنو وردھن خود مختار ہوا اور خاندان چولا، پانڈیا اور کریل سے جنگ کی۔ پلکیسن دوم نے ۶۲۰ء میں ہرش کو پسپا کیا، ۶۲۵ء تا ۶۲۶ء میں اس نے ایک سفارت ایران کے شہنشاہ خسرو دوم کے پاس روانہ کی جس کا طبری نے تذکرہ کیا ہے اجنٹہ کے غار نمبر ۱ میں استرکاری کی ایک بڑی تصویر میں ایرانی سفیر ہندی راجہ کے آگے کھڑا ہوا ہے۔ اس تصویر سے ایرانی اور ہندی فنون لطیفہ کے اختلاط کی جھلک ظاہر ہوتی ہے۔

۶۴۱ء میں ہیون سانگ چینی سیاح پلکیسن دوم کے دربار میں حاضر ہوا، اس نے اجنٹہ کی تعریف کی ہے۔ اس وقت چالوکیا سلطنت کا

مرکز واتاپی نہ تھا بلکہ ناسک، ہرش کے مقابلہ میں سہولت پیدا کرنے کے لئے پلکیسن نے ناسک کو موقتی پایۂ تخت قرار دیا تھا۔ اس نے کونکن کے موریا کو شکست دی۔ راشٹرکوٹ کی طاقت توڑ دی اور کدمب کا بھی خاتمہ کیا اور مشرقی ساحل سے بڑھ کر پتھاپورم کے قلعہ پر قبضہ کیا، کلنگ کے راجہ کو زیر کیا جس کا پایۂ تخت پوری تھا جو اب بھی جگناتھ کے مندر کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ اس نے چولا، پانڈیا اور کریل سلطنتوں پر بھی حملہ کیا۔

جنوبی ہند میں پلوا خاندان بہت طاقتور تھا، اگرچہ مسلسل کوشش کرکے چالوکیا راجاؤں نے ان کی قوت توڑ دی تھی پھر بھی ۶۴۲ء میں کانچی کے پلوا خاندان کے راجہ نرسمہاورمن نے پلکیسن دوم کو شکست فاش دے دی اور بادامی کو اس بری طرح برباد کیا کہ تیرہ سال تک بادامی پر کسی نے حکومت نہ کی۔ جب ۶۵۵ء میں وکرماجیت اول (پلکیسن دوم کا بیٹا دور حکومت ۶۵۵ء تا ۶۸۰ء) تخت نشین ہوا تو اس نے پلوا سے اپنے باپ کا بدلہ لیا اور شہر کانچی پر قبضہ کیا اس نے چولا کو بھی شکست دی۔ وکرماجیت کے پوتے وجیادیتا کے راشٹرکوٹ سے اچھے تعلقات تھے جن کی بنا پر راشٹرکوٹ کے اندرا راجا نے چالوکیا شہزادی سے شادی کی جس کے بطن سے دنتی درگا پیدا ہوا جب کیرتی ورمن دوم برسر اقتدار ہوا تو اس کے دور میں دنتی درگا نے بادامی پر قبضہ کیا جس سے مغربی چالوکیا سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ اسی چالوکیا دور میں شاید پلوا کی مخالفت کے سلسلہ میں راجمندری کی بنیاد پڑی اور یہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا گیا کیونکہ جنوب والوں کے لئے کرشنا سے ہوتے ہوئے شمال کی طرف جانے کا راستہ یہیں سے گزرتا ہے۔

مغربی چالوکیا کا پایۂ تخت بادامی ضلع بیجاپور میں ہے۔ یہاں جینوں کا ۶۶۵ء کا ایک غاری مندر ہے۔ اس کے علاوہ تین غار برہمنی اثر کے ہیں۔ ان میں سے ایک ۵۷۹ء کا ہے یہاں دو قلعے ہیں ایک باون بندی اور دوسرا رن منڈل، چھٹی صدی عیسوی میں پلوا نے اس پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے بعد چالوکیا اس پر قابض ہوئے ساتویں صدی عیسوی میں مشہور چینی جاتری ہیون سانگ یہاں آیا تھا اس نے لکھا ہے کہ اس کی راجہ (پلکیسن دوم) سے ملاقات ہوی چھتری ذات کا ہے یہہ راجہ وسیع النظر اور بلند حوصلہ ہے اس کے ماتحت وفاداری کے ساتھ اس کی خدمت بجالاتے ہیں اور راجہ کو ان سے خاص ہمدردی ہے۔

یہاں کی زمین زرخیز ہے۔ غلہ خوب اگتا ہے۔ موسم گرم ہے یہاں کے باشندوں کے خصائل سادہ اور دیانت دارانہ ہیں ان کے قد اونچے ہیں اور طبیعت کے غاٹے ہیں اگر ان کی توہین کی جائے تو بری طرح بگڑتے ہیں اور بدلہ لیتے ہیں۔ جنگ میں ڈٹ کر لڑتے اور غنیم کا خوب تعاقب کرتے ہیں لیکن جب کوی اپنے آپ کو ان کے حوالہ کر دیتا ہے تو وہ اسے ایذا نہیں پہونچاتے۔ جب کبھی جنگ میں سردار ہار جاتا ہے تو اسے مارتے نہیں بلکہ اسے زنانی لباس پہناتے ہیں اور اسی طرح اسے زندگی کاٹنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ملک میں بے شمار پہلوان ہیں جو اکثر کشتی لڑتے رہتے ہیں۔ یہہ لوگ خوب پیتے اور لڑتے ہیں۔ اگر وہ کسی کو سڑک پر ماردیں تو قانوناً انھیں گرفتار نہیں کیا جاتا۔ یہاں ہاتھیوں کو بھی خوب پلایا جاتا ہے۔ اپنے پہلوانوں اور جنگی ہاتھیوں پر راجہ کو فخر ہے۔

واتاپی کے حکمرانوں کے دور میں بدھ مذہب آبادی کے ایک بڑے حصے میں رائج تھا جس کا ہیون سانگ نے ذکر کیا ہے۔ اس وقت یہاں بدھ مت کے بہت سے منادر اور خانقاہیں تھیں، لیکن بدھ مت کو زوال ہو رہا تھا۔ کیونکہ برہمنی مذہب کے اثرات بڑھ رہے تھے

چنانچہ خود راجہ پلکیسن اول نے اشومیدھ کی رسم منائی، برہمنی مت کی ترقی کے ساتھ ان کے مناد بھی چوطرف بننے لگے اور پران کے دیوتاؤں برہما، وشنو اور شیوا وغیرہ کی پوجا ہونے لگی، بادامی غاری مندر میں منگلیس کے عہد میں دشنو کی پوجا ہوتی تھی جو اس کا تعمیر کردہ ہوا تھا ان مختلف مذاہب کا سلطنت میں پایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ چالوکیا راجہ تمام مذاہب کے ساتھ رواداری برتتے تھے ۔ باوجود اس کے بدھ مت بتدریج برہمنی مذہب اور جین مت کے مقابلہ میں معدوم ہوگیا۔ ہندو خاص طور پر قربانی کی طرف توجہ کرنے لگے۔ اس زمانہ میں بدھ اور جین مت والوں سے ہندؤں نے غاروں میں مندر تراشنے کا فن سیکھا مرہٹوں کے علاقہ کے جنوبی حصے میں عام طور پر جین مذہب مقبول تھا، آٹھویں صدی عیسوی میں زرتشتی مذہب بھی ہندوستان میں رائج ہوا۔ خراسان کے جلاوطن پارسی ۷۳۵ء میں پہلی دفعہ احاطہ بمبئی کے ضلع تھانہ میں بمقام سنجان آباد ہوئے، پلی کیسن دوم اور وکرما جیتا دوم نے جینیوں کی مدد کی اور ان کے مناد تعمیر کروائے، ۶۷۸ء میں یہاں مشہور قواعد کا عالم (PUUYAPADA) تھا۔ او پر بیان ہو چکا ہے کہ سلطنت زیادہ وسیع ہوجانے سے انتظامات کی خاطر پلی کیسن دوم نے دنگی پر اپنے بھائی وشنو وردھن کا تقرر کیا جس نے کچھ عرصہ بعد اپنی علیحدہ حکومت قائم کرلی اور اس طرح دو چالوکیا خاندان ہوگئے مغربی چالوکیا کا مرکز بادامی تھا اور مشرقی کا ونگی۔ ونگی گوداوری اور کرشنا کے دہانوں کے قریب ہے۔ بدھ مت کا زبردست دشمن اور ذی اثر شخص شنکر اچاریہ اور مشہور عالم (AKALANKA) اسی زمانہ کے ہیں آٹھویں صدی میں کلنک اور مشرقی دکن پر مشرقی چالوکیا اور دکن کے وسطی اور مغربی حصہ پر راشٹر کوٹ حکمران تھے ۔ دسویں صدی کے اختتام پر راشتہ کوٹ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئے جس کے باعث مغربی چالوکیا کا دوسرا دور شروع ہوا جو مغربی چالوکیا خاندان کی رجعت کہلایا جاسکتا ہے۔ تیلا دوم نے ۹۷۳ء میں راشٹر کوٹ کے آخری راجہ ککہ دوم کو شکست دی اور نئے مغربی چالوکیا خاندان کی بناء ڈالی، اس نے راشتہ کوٹ شہزادی سے شادی کی اس کا عہد حکومت ۹۷۳ء سے ۹۹۶ء تک ہے، اس کے دور میں سلطنت بلاری اور میسور کے بعض بعض حصص تک پھیل گئی تھی۔

اسی زمانہ میں چولا حکمران راجا راجہ نے دنگی پر قبضہ کیا اور چالوکیا خاندان کے ایک لڑکے کو تخت نشین کرکے واپس ہوا اس راجہ نے جس کا نام دی مالا دیتا ہے راجا راجہ کی لڑکی سے شادی کی اس کی اولاد نے مشرقی چالوکیا اور چولا سلطنت پر حکومت کی بالآخر مشرقی چالوکیا حکومت کا ۱۰۷۰ء میں خاتمہ ہوگیا جس سے مغربی چالوکیا کا اقتدار بہت بڑھ گیا اور وہ تمام دکن پر حاوی ہوگئے۔ ۱۰۴۲ء میں مغربی چالوکیا خاندان میں سومیسورا اول تخت نشین ہوا تھا جس نے کلیانی کو دارالسلطنت قرار دیا جس کے باعث یہ چالوکیاں کلیانی کہلاتے ہیں۔ کلیانی ممالک محروسہ سرکارعالی میں ہے۔ اس خاندان نے بھی قدیم چالوکیا کی طرح دو سو برس حکومت کی سمیسورا اول نے چولا کے راجا راجہ کو شکست دی، دھارا (مالوہ کے علاقہ میں ہے) اور جنوبی کانچی پر حملہ کیا اور ان دونوں کو فتح کیا۔

۱۰۷۶ء میں وکرماجیت اول یا بکرمانک تخت نشین ہوا۔ اس نے کانچی فتح کیا اور دوارا سمدرا کے خاندان ہوسل سے سخت جنگ کی دوارا سمدرا کو دوارا وتی پور بھی کہتے تھے مسلمان مورخین نے اسے دوارا سمندر لکھا اس کے کھنڈر ضلع حسن میسور میں موجود ہیں، اس نے اپنے نام سے ایک سنہ جاری کیا جو کبھی مقبول نہ ہوا، وکرماجیت نے دشنو کا ایک بڑا مندر تعمیر کروایا اور اس کے آگے ایک تالاب بنوایا اور اس کے قریب ایک شہر آباد کیا جو وکرماپورا کہلاتا تھا، اس کے عہد میں رعایا خوش حال تھی کشمیری پنڈت

(BILHANA) کے قول کے مطابق ملک میں ہر طرف امن تھا۔ کہیں چوروں کا خوف نہ تھا جو اچھے انتظام کی دلیل ہے۔ علاوہ اس کے بادشاہ نیک منش، فیاض اور ہمدرد تھا اس نے علم کی خوب سرپرستی کی، یہہ کلیانی کا بڑا راجہ تھا جس کے عہد میں سلطنت انتہائی عروج کو پہونچی، اور بقول بلہانا، کلیان ہر اعتبار سے عدیم المثال تھا، یہی مشہور قانون داں وجنانیسور کا وطن ہے جس کی تصنیف متاکشرا ہندو قانون کی سب سے زیادہ مستند کتاب ہے۔ کلیانی احاطہ بمبئی کے ضلع تھانہ میں ہے۔ (PRIPLUS) کے قول کے مطابق کلیانی کی اہمیت دوسری صدی عیسوی سے شروع ہوئی، یہہ شہر تجارت کے اعتبار سے مشہور تھا، بڑے بڑے تجار یہاں آتے تھے شائد یہہ شہر ۵۳ء میں آباد ہوا یہاں پیتل اور شیشم کا کام اچھا ہوتا تھا اور کپڑے بھی اچھے بنتے تھے، چودھویں صدی میں مسلمان حکمرانوں نے اس کا نام اسلام آباد رکھا۔

وکرماجیت کے مرنے کے بعد چالوکیاں کلیانی کو زوال شروع ہوا، راجہ تیل سوم کے عہد میں سپہ سالار افواج بجل یا وجالا یا بجالا نے بغاوت کی اور تمام سلطنت پر قابض ہوگیا ۱۱۶۲ء سے ۱۱۸۳ء تک بجل اور اس کے جانشینوں نے حکومت کی جس کے بعد خاندان چالوکیا کے ایک شہزادہ سومیسور چہارم نے بجل کے جانشینوں سے ملک کا بہت بڑا حصہ حاصل کیا لیکن یادوا خاندان دیوگری اور ہوسل خاندان دوارا سمدرا کے عروج کے باعث اس کا اقتدار جاتا رہا یعنی ۱۱۹۰ء میں کلیان سلطنت کا خاتمہ ہوا۔

بجل کے عہد میں ایک مذہبی انقلاب ہوا جس سے شیو کے مذہب نے دوبارہ زندگی پائی اور ایک نیا فرقہ قائم ہوا جس کا نام ویراسیوی یا لنگایت ہے جو اب تک موجود ہے۔ بجل مذہباً جین تھا، اس کے متعلق یہہ مشہور ہے کہ اس نے فرقہ لنگایت کے دو برہمن گاروں کو بلا وجہہ اندھا کیا تھا جس کے بدلہ سر برست مذہب لنگایت بسوا (BASAVA) کے اشارہ ۱۱۶۷ء میں راجہ کو قتل کیا گیا اس مذہب کے ماننے والے عام طور پر کنڑی علاقوں میں آباد ہیں۔

وکرماجیت کے عہد میں تاجروں نے بدھ مذہب کے لئے خانقاہیں تعمیر کروائیں اور ان کے اخراجات کے لئے رقمیں اور زمینیں فراہم کیں اس زمانہ میں جین مت کو تفوق حاصل نہ تھا، لنگایت فرقہ کے نکلنے کے بعد تو جین مت کا اثر اور بھی زائل ہوگیا، لنگایت مذہب زیادہ تر تجار میں پھیلا جو پہلے جین مت کے طرفدار تھے۔ لنگایت لنگ کو حیات کا مبدا سمجھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ یہہ ویدوں، تناسخ بچپن کی شادی کے مخالف ہیں۔ یہہ بالکل حقیقت ہے کہ ان کے مذہب کا بانی بسوا برہمن تھا لیکن انھیں برہمنوں سے سخت نفرت ہے اس مذہب کے جاری ہونے سے نہ صرف بدھ مت جنوب سے ناپید ہوا بلکہ جین مت کو بھی زوال شروع ہوا۔

## راشٹراکوٹ

### ۷۵۳ء تا ۹۷۳ء

راشٹراکوٹ یادو نسل کے تھے راجہ (RATTA) کے ایک بیٹے کا نام راشٹراکوٹا تھا جس کے نام سے یہہ خاندان مشہور ہوا۔ آٹھویں صدی کے درمیان میں دنتی درگا نامی ایک سردار نے جو راشٹراکوٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا خاندان چالوکیا کے راجہ بکرماجیت دوم کے بیٹے کیرتی ورمن دوم کو شکست دی اور راشٹراکوٹ سلطنت قائم کی۔ جب عوام اس کی طرف سے بدظن ہوئے تو اس کے چچا کرشنا اول نے

اسے تخت سے اتار دیا اور خود راجہ بنا، بعض کتبوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنتی درگاہ لاولد تھا شائد اس کے مرنے کے بعد کسی اور وارث تخت کو ہٹا کر کرشنا تخت نشین ہوا، دنتی درگا کو تخت سے علٰحدہ کرنا اس لئے ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت طاقتور حکمراں تھا۔

کرشنا اول کے عہد میں ایلورا کا مشہور کیلاس کا مندر تعمیر ہوا۔ یہ مندر ایک چٹان میں ترا شا گیا ہے جو فن تعمیر کے اعتبار سے غیر معمولی ہے۔ اسی خاندان کے ایک حکمران گوبند سوم نے ۷۹۳ء تا ۸۱۵ء سلطنت کو شمال میں بندھیاچل اور مالوا اور جنوب میں کانچی تک وسعت دی اور اپنے بھائی اندر راج کو جنوبی گجرات میں نائب السلطنت مقرر کیا، اس کے بعد اموگھورش تخت نشین ہوا۔ (۸۱۵ء تا ۸۷۷ء) اس نے زیادہ تر وینگی کے مشرقی چالوکیا راجاؤں سے جنگ کی۔ اس نے اپنا دارالسلطنت ناسک سے مانیاکھیت بدل دیا اسی شہر کو عرب مورخین نے مانکیر لکھا ہے، اب یہ مالکھیڈ یا ملکھیڑ کے نام سے ریاست نظام میں ہے، یہ اس زمانہ کا بہت مشہور اور بارونق شہر تھا، اموگھورش کے جانشین کرشنا دوم نے جینیوں کے ننگے فرقے دگمبر کی بہت سرپرستی کی جن سین، گنبھدرا اور دوسرے علما کی توجہ کے باعث اس فرقہ کو بہت تقویت حاصل ہوی جس کی بدولت بدھ مت کے اثرات دکن سے رفتہ رفتہ زائل ہوتے گئے، اور بارھویں صدی تک یہ مذہب دکن سے معدوم ہوگیا۔

اسی خاندان کا ایک راجہ اندر سوم نے قنوج پر کامیاب حملہ کیا، اور ۹۴۹ء میں چول خاندان کے راجہ دت پر فوج کشی کی اس زمانہ میں ہندؤں اور بدھ مت والوں میں زبردست رقابت تھی، راشٹر کوٹوں کے ابتدائی دور میں برہمن وید کی تعلیم کے مطابق خوب قربانی کرتے تھے، اس زمانہ میں جین مت کو بھی فروغ حاصل ہوا، راشٹراکوٹوں کی علمی سرپرستی کے باعث ان کے دربار میں شعرا کا اجتماع ہوا

آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں یعنی ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کی فتح سے سندھ پر اسلامی سیاسی اثرات غالب آئے، راشٹراکوٹ خاندان کے ان عرب حملہ آوروں سے دوستانہ تعلقات تھے اور گرجروں سے مخالفت تھی، گرجروں نے عربوں سے اچھے تعلقات نہ رکھے جس کے باعث انھیں نقصان پہونچا، اس سے بچنے کے لئے راشٹراکوٹوں نے ان نووارد حملہ آوروں سے اتحاد کرلیا تھا، جس کے باعث مسلمان سوداگر اور سیاح مغربی علاقوں میں بہ آسانی تجارت کرتے تھے اور بہت سے مغربی ساحل پر آباد ہوے، ان مسلمان تاجروں اور سیاحوں نے اپنے سیاحت نامے لکھے جن میں یہ راشٹراکوٹ راجاؤں کو بل ہرا لکھتے ہیں جس کے معنی ہندوستان کا سب سے بڑا راجہ ہیں، انھیں بل ہرا اس لئے لکھتے ہیں کہ یہ خود کو ولبھ کہتے تھے۔ اور یہ لفظ رائے کے ساتھ مل کر بلہرا ہوگیا، چالوکیا راجہ بھی ولبھ اپنے نام کے ساتھ لکھتے تھے، شائد انہی سے یہ طرز راشٹراکوٹوں نے اختیار کی، ولبھ رائے یا بلبا رائے مقامی استعمال سے بلہرائے ہوا اور عربوں نے اسے بلہرا لکھا۔

راشٹراکوٹ راجاؤں کی مسلمان سیاحوں نے بہت تعریف کی، ان کے عہد کا کیلاس کا مندر دنیا کے عجائبات میں ہے۔ ان راجاؤں نے سنسکرت ادب کی سرپرستی کی اور بہت سے مندر شاہی مصارف سے تعمیر کروائے۔

ان تمام سلطنتوں میں چالوکیا سلطنت زیادہ عرصہ تک باقی رہی یہ ایسے زمانہ میں یعنی ۱۱۹۰ء میں ٹوٹی جب کہ تمام ہندوستان کی سیاسی حالت بدل رہی تھی کیونکہ اسی سنہ میں مسلمانوں نے شہاب الدین غوری کے تحت ہندوستان پر حملے کئے اور یہاں اپنی

حکومت قائم کی جو صدیوں تک برقرار رہی، جغرافی اعتبار سے چالوکیا جیسی وسیع سلطنت میں مختلف زبانوں کے علاقے تھے جو فطرتاً زبانوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے علحدہ ہو کر اپنی علحدہ حکومتوں کے علم بردار ہو گئے، مرہٹواڑی کے علاقہ میں یادوا سلطنت قائم ہوئی جس کا پائے تخت دیوگیر موجودہ دولت آباد تھا آندھرا یعنی تلنگانہ میں کیتیا سلطنت جس کا مرکز ورنگل تھا، تیسرے کنڑی علاقہ میں ہوسلیا خاندان برسراقتدار تھا جس کا پائے تخت دوارا سمدرا تھا۔

ککیتیا خاندان سنہ ۱۱۰۰ء کے بعد نمایاں ہوا ۱۳۰۰ کے طاقتور راجہ پرتاپا رودرا دیو گنپتی تھے۔ اس خاندان نے مسلمانوں کے حملے تک اچھی طرح حکومت کی، یادوا خاندان کے راجہ خود کو سری کرشنا کی نسل سے سمجھتے تھے۔ یہ لوگ جنوب میں ہوسلیا حکومت سے برسرپیکار تھے اور شمال میں گجرات تک اپنی سلطنت کو وسعت دی، ان کا بڑا حکمران سنگھنا (سنہ ۱۲۱۰ء تا سنہ ۱۲۴۷ء) تھا، اس خاندان نے سنسکرت کی سرپرستی کی علاء الدین خلجی (سنہ ۱۲۹۶ء تا سنہ ۱۳۱۶ء) نے اپنے آخری دور حکومت میں نہ صرف دکن بلکہ تمام جنوبی ہند کو مستقل طور پر حکومت دہلی کے تابع کیا لیکن اس کے انتقال کے بعد مرکزی حکومت کی کمزوریوں سے جنوب کے حکمرانوں نے فائدہ اٹھایا، جب محمد تغلق (سنہ ۱۳۲۵ء تا سنہ ۱۳۵۱ء) برسراقتدار ہوا تو اس نے ۱۳۲۶ء میں دیوگڑھی کا نام دولت آباد قرار دے کر اسے اپنا پائے تخت بنایا لیکن فوراً ہی بعض اسباب کی بنا پر اپنے ارادہ سے باز آیا مگر جنوب کو اپنے قابو سے نکلنے نہ دیا اور ورنگل پر فوج کشی کر کے اس کا نام سلطان پور رکھا محمد تغلق کے آخری عہد میں گجرات اور دکن کے امرا نے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی، چنانچہ موقع پا کر انھوں نے سنہ ۱۳۴۶ء میں حسن گنگو بہمنی کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا جس نے دکن میں ایک طاقتور حکومت قائم کی جو بہمنی سلطنت کہلاتی ہے جس کا دارالسلطنت گلبرگہ تھا۔

دکن کی قدیم تاریخ کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شمالی ہند اور دکن اکثر ایک دوسرے کے مرہون منت رہے چنانچہ آندھرا سلطنت جو موریا کی ہم عصر تھی، اس کے ایک فرد نے اشوک کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد مگدھ پر حکومت کی اور یہ مگدھ کا آندھرا خاندان کہلاتا ہے حملوں کے سلسلہ میں بھی دکن کے حکمرانوں کو بعض دفعہ تفوق حاصل رہا یعنی پلی کیشن دوم نے ہرش کو شکست دی اور اندر سوم نے قنوج پر کامیاب حملہ کیا، قدیم دکن کی تہذیب و تمدن اور سیاسی حالات کا پتہ لگانا اس لئے مشکل ہے کہ اس خطہ میں سنہ عیسوی سے بھی صدیوں پہلے سے حکومتیں قائم تھیں جن کی کوئی مفصل سند نہیں ملتی نیز یہ سرزمین مختلف اقوام کی آماجگاہ ہے کیونکہ یہ خطہ شمالی و جنوبی ہند کے درمیان واقع ہے۔ علاوہ ازیں اپنی قدرتی خوبیوں کے باعث بھی یہ ہمیشہ سے دلکش اور جاذب نظر رہا۔

**سید سراج الدین**

# نقوشِ اجنٹہ

نگاہ عشق سے دھوئی ہوئی ہیں تصویریں … چمک رہی ہیں یہاں آرزو کی تقدیریں
پگھل گئے ہیں کہیں صاف ہوگئے ہیں کہیں … وہ سختیٔ دلِ ناکام پتھروں میں نہیں
یہہ حسن وعشق کی پوجا کے کارنامے ہیں … یہہ رنگ ونور کے درد آشنا فسانے ہیں
دکن کی خاک میں ہے بدھ کی زندگی خاموش … دکن کی خاک میں اندر کے ہے پریم کا جوش
نقوش حسن کو خونِ جگر سے دھوتے ہیں … یہہ پتھروں میں نہیں بزم دل میں سوتے ہیں
ہے دیوتاؤں کی تعبیر زندگی میں حُسن … ہے پارساؤں کی تصویر زندگی میں حُسن
چمک ہے روح کی، رنگوں کی راجدھانی میں … لچک ہے عشق کی، پتھر کی سخت جانی میں
نظر نواز بنا، اور جاں گداز بنا ! … زمینِ شوق کا ہر ذرہ عشق باز بنا
زمیں پہ رفعتِ جاں خود نمائی کرتی ہے … وہ دیکھ بزم تصور خدائی کرتی ہے!

باقی

---

## خواتین دکن نمبر

اس مرقع دکن کے ساتھ اس کا ایک **ضمیمہ خواتین** علحدہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے جس میں دکن کی بیش انشاء پرداز خاتونوں کے نہایت دلچسپ اور مفید مضمون اور نظمیں شامل ہیں، یہہ اصل میں اسی دکن نمبر کا حصہ ہے جو صنف لطیف کے رشحات قلم پر مشتمل ہے۔ اور ادارہ ادبیات اردو کے شعبۂ نسوان کی طرف سے اس کی سرگرم معتمد مخدومہ سکینہ بیگم صاحبہ کے پُرخلوص مساعی کی وجہ سے نہایت خوبی، نفاست اور بطافت کے ساتھ مرتب اور شایع ہو رہا ہے۔ اس کی عام قیمت ۸؍ رکھی گئی ہے۔ لیکن صرف سب رس کے خریداروں کو ختم فروری تک نصف قیمت پر مسض اس وجہ سے دیا جائے گا کہ یہہ سب رس ہی کا ایک حصہ ہے۔ اس خواتین دکن نمبر کے بعض مضمون نگاروں کے نام یہہ ہیں:-

| | | | |
|---|---|---|---|
| رالعہ بیگم صاحبہ (زنانہ کالج) | فاطمہ بیگم صاحبہ اداؔ | تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ | قمر النساء بیگم صاحبہ |
| کبریٰ اقبال عبدالروف | زبیدہ ضیاء الدین انصاری | بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیرؔ | رالعہ بیگم صاحبہ (معلمہ محبوبیہ اسکول) |
| افسر النساء بیگم صاحبہ | ممتاز جہاں بیگم صاحبہ صوفی | صفیہ صدیق فریدہ بیگم صاحبہ | جہاں بانو بیگم صاحبہ بی، اے |
| لطیف النساء بیگم صاحبہ بی، اے | ذاکرہ بنت فضل اللہ احمد صاحب | تسنیم ربانی بی، اے | مسز صوفی ام، اے - |

# دکن کی اسلامی فتوحات

## "دورِ وسطیٰ میں دکن اور شمالی ہند کے تعلقات" (۱۲۹۴ء تا ۱۳۵۱ء)

سنہ ۱۲۰۶ء میں جب دہلی کی اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو اس کے حدود زیادہ وسیع نہ تھے۔ بنگال، گجرات، مالوہ، قنوج، اجمیر اور دوآبہ کے کچھ حصے اس میں شامل تھے۔ سنہ ۱۲۹۴ء تک اس کو بنگال سے سندھ اور جنوب میں دریائے نربدا تک وسیع کیا گیا۔ جب دہلی کی حکومت خلجی خاندان کے ہاتھ آئی تو جلال الدین خلجی کے پیش نظر کسی قسم کا فتوحاتی یا تعمیری کام باقی نہ رہا۔ علاء الدین خلجی صوبہ دار کڑہ شاہی فوجوں کے ہمراہ مالوہ کے قریب بھیلسہ کی فتح میں مصروف تھا یہاں اس کو دکن کی مہاراشٹرا سلطنت کے حالات معلوم ہوئے جس کا مرکز دیوگری تھا۔ یہ سلطنت کوہ ست پڑا کے جنوب میں واقع تھی۔ چونکہ یہ خطہ نامخیلا واقع ہوا تھا اور اس کے پیش نظر سلطنت دہلی پر قبضہ کرنے کا منصوبہ پہلے ہی سے تھا اس لئے اس نے بغیر سلطان کی اجازت کے آٹھ ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ دیوگڑھی کا رخ کیا۔

یوں تو جنوبی ہند کے ساحلوں پر مسلمان عرب تاجروں نے آباد ہوکر اسلامی آبادکاری کی بنیاد ڈال دی تھی لیکن فرشتہ اور شہریار کی تحریروں کے بموجب ان تاجروں نے کوئی سیاسی حیثیت حاصل نہ کی۔ بلکہ وہ دوسرے فرقوں کی طرح آباد ہوئے۔ ان عرب تاجروں کے ہمراہ بعض بزرگ فقیر اور درویش بھی آئے جن میں بابا ظاہر، خواجہ خضر اور شیخ عبداللہ خفیف بھی تھے۔ ان بزرگوں نے سماجی اتحاد میں نمایاں حصہ لیا جس سے مخلوط تہذیب و تمدن کا وجود ہوا۔ انسانی برادری اور وحدت کا پیام سرزمین دکن پر بالکل نئے اصول سے پیش کیا گیا جو آگے چل کر شمالی ہند پر بھی پھیلا اور ہندلمانی تشکیل کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

علاء الدین کے حملے کے وقت دکن میں تین خودمختار سلطنتیں تھیں۔ سنہ ۱۱۹۰ء میں جب چالوکیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا تو مہاراشٹرا، تلنگانہ اور کرناٹک کے صوبے خودمختار ہوگئے۔ مہاراشٹرا کا پایۂ تخت دیوگڑھی تھا جہاں یادو خاندان کا راجہ رام دیو حکمراں تھا۔ تلنگانہ کے مرکز ورنگل پر کاکتیا خاندان کی ایک عورت رودر ما دیوی اپنے پوتے کی کمسنی کی وجہ سے حکمران تھی۔ کرناٹک کے مرکز دوار وتی پور پر بلال خاندان کا راجہ بیر بلال حکمران تھا۔ یہ سلطنتیں بہت متمول تھیں کیونکہ ان کے حدود میں سونے، چاندی اور جواہرات کی کانیں تھیں اور اس کے علاوہ گھوڑے ہاتھی کافی تعداد میں موجود تھے۔

علاء الدین خلجی کی روانگی سے قبل بعض صوفی اور فقیر منش بزرگ دکن کی طرف روانہ ہوچکے تھے جن میں سے بعض تو راستہ کی گھاٹیوں پر آباد ہوگئے اور بعض آگے بڑھتے چلے گئے۔ ان لوگوں سے علاء الدین کو راستہ معلوم کرنے میں بڑی مدد ملی۔ دولت کی ہوس اور اپنے منصوبوں کو کامیاب بنانے کی کوشش میں اس نے راستہ کی مشکلات کا مطلق خیال نہ کیا۔ اس کی فوج بالاگھاٹ سے ہوتی ہوئی ایلچپور پہونچی جو مہاراشٹرا سلطنت کی فوجی چھاؤنی تھی یہاں معمولی جھڑپ ہوئی اور ایلچپور پر قبضہ کرلیا گیا جو دکن کا باب الداخلہ ہے۔ یہاں اس نے ٹھیر کر معلومات حاصل کیں۔ اس کے بعد آگے بڑھ کر دیوگڑھی (دولت آباد) کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔

راجہ رام دیو قلعہ بند ہوگیا۔ اس زمانہ میں اس کا بیٹا شنکر دیو کسی جاترا میں گیا ہوا تھا۔ راجہ نے اس اچانک حملے سے پریشان ہوکر صلح پیش کیا۔ اس صلح نامہ میں فرشتہ کے بیان کے بموجب علاء الدین کو چھ سو من سونا، سات من موتی، دو من جواہرات اور ہزار من چاندی اور اس کے علاوہ ریشمی تھان، گھوڑے، ہاتھی وغیرہ ہاتھ آئے۔ سالانہ خراج کا وعدہ لے کر یہ واپس ہو رہا تھا کہ شنکر دیو آگیا اور اس نے علاء الدین کی فوج پر حملہ کردیا۔ لیکن اس پر بھی علاء الدین کو کامیابی ہوئی اور اس نے نئے صلح نامہ کی رو سے دوگنا تاوان حاصل کیا۔ ایلچپور پر اس نے مستقل قبضہ رکھنا ضروری سمجھا کیونکہ اس کو آئندہ بھی دکن سے تعلقات قائم رکھنے تھے۔ یہ واپس ہوگیا لیکن بعض صوفی اور درویش ایلچپور اور اطراف و اکناف کی

پہاڑیوں پر آباد ہوگئے یہی سب سے پہلی دکن کی اسلامی آبادکاری کی ابتدا ہے۔ علاءالدین کا یہ حملہ محض اتفاقی اور اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل کے سلسلہ میں دولت کے حصول کی خاطر ہوا۔ دکن پر براہ راست حکومت کرنے کا کوئی خیال علاءالدین کے دماغ میں نہ تھا۔ اس حملے کے بعد دکن کا راستہ شمالی ہند کی طاقتوں کے لئے کھل گیا اور ساتھ ہی ساتھ دکن کے سیاسی حالات پر بھی اس کا اثر پڑا۔

علاءالدین خلجی کو دکن میں وہی درجہ حاصل ہے جو محمود غزنوی کو تاریخ ہند میں۔ جس طرح محمود نے ہندوستان کی دولت سے اپنی سلطنت کو مستحکم اور مالامال کرلیا اسی طرح علاءالدین نے دکن کی دولت سے سلطنت دہلی کو حاصل کیا اور بادشاہ بننے کے بعد اسی دولت سے اپنے مخالفین کے منہ بند کردیئے۔ اور وہ قوت حاصل کی جو آج بیسویں صدی میں آمروں کو حاصل ہے۔

دکن پر دوسرا حملہ سنہ ۱۳۰۶ء میں ہوا کیونکہ دیوگری کے راجہ نے خراج ادا کرنا روک دیا تھا۔ علاءالدین اس دوران میں سلطنت کے کاروبار اور فتوحات میں مصروف رہا اور دکن کی طرف سے کسی قدر غافل بھی ہوگیا جس سے فائدہ اٹھاکر رام دیو نے تین سال تک مسلسل خراج ادا نہ کیا۔ سلطنت دہلی کی جانب سے ملک کافور کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی گئی لیکن راجہ نے بغیر مقابلہ کے اطاعت قبول کرلی اور دہلی جاکر ایک ماہ تک شاہی مہمان رہا۔ دربار سے اس کو رائے رایاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اور سرخ چتر لگانے کی اجازت دی گئی۔ گجرات کا ضلع نیسری بھی اس کی عملداری میں دے دیا گیا۔ اس طرح دیوگری پر پورا سیاسی اقتدار حاصل ہوگیا۔

سنہ ۱۳۰۹ء میں تلنگانہ کے مرکز ورنگل پر حملہ کیا گیا۔ اس حملہ سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ سلطنت دہلی کے پیش نظر دکن پر حملہ کرنے کا ایک خاکہ موجود تھا۔ ملک کافور کی ماتحتی میں شاہی فوجیں ورنگل کی طرف روانہ ہوئیں۔ ضیاءالدین برنی نے لکھا ہے کہ علاءالدین نے ملک کافور کو یہ حکم دیا تھا کہ ورنگل پر قبضہ کرنے کے بجائے دولت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ شاہی فوجیں الچپور، قندھار، دیوگری سے ہوتی ہوئی ورنگل پہونچیں۔ راستہ میں دیوگری کے راجہ کی جانب سے شاہی فوج کیلئے ضروری انتظامات کردیئے گئے تھے۔ ہنمکنڈہ پر قبضہ کرکے قلعہ کا محاصرہ کرلیا گیا۔ قلعہ بہت مضبوط اور مستحکم تھا۔ تھوڑے دنوں کے اندر ہی راجہ رودر دیو نے صلح کرلی اور سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا اور نذرانہ و تاوان کے سلسلہ میں کثیر مقدار سونا، چاندی اور زر و جواہرات پیش کیا جو ایک ہزار اونٹوں پر لادا گیا۔ ہاتھی اور گھوڑوں کی ایک کثیر تعداد بھی ہاتھ آئی۔ پروفیسر کرشنا سوامی اینگار نے امیر خسرو اور برنی کے بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ورنگل کی پوری دولت ملک کافور کے ہاتھ آگئی تھی۔ اس طرح دکن کی دو متمول سلطنتوں پر سیاسی اقتدار قائم ہوگیا۔ اب صرف جنوب ہند میں دو اور سلطنتیں باقی رہ گئی تھیں۔ ایک دوارسمدر کی ہوسیلا سلطنت اور دوسری سلطنت پانڈیہ جو مالابار میں واقع تھی۔

ملک کافور نے ورنگل کی فتح کے وقت ہی جنوبی سلطنتوں کے حالات معلوم کرلیے تھے۔ دہلی پہونچنے کے بعد اس نے سلطان سے مالابار پر حملہ کی اجازت لے لی چنانچہ سنہ ۱۳۱۰ء میں ایک بڑی فوج کے ساتھ مالابار کی طرف روانہ ہوا۔ اس حملہ کو امیر خسرو نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے کیونکہ وہ خود اس میں ہمراہ تھے۔ دکن کی پہاڑیوں اور دشوار گذار راستوں کا حال بہت ہی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ راستہ میں رام دیو نے رسد کا انتظام کردیا تھا۔ اور کچھ فوجی ہاتھی بھی پیش کئے۔ نربدا، تاپتی کے علاوہ اس فوج کو تین اور دریا، گوداوری، سینی اور بھیما عبور کرنے پڑے۔ باندری کے مقام پر ملک کافور ٹھیر گیا تاکہ مالابار سلطنت کے حالات معلوم کرے۔ اس وقت سلطنت کے لئے دو دعویداروں ہیرا پانڈیہ اور سندرا پانڈیہ کے درمیان جنگ ہورہی تھی جو حقیقی بھائی تھے۔ دوارسمدر کا راجہ بلال دیو اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاکر اپنی فوج کے ساتھ حملہ کے لئے آگیا لیکن جونہی

اس کو مسلمانوں کے آمد کی اطلاع ہوئی وہ واپس ہوگیا۔ ملک کافور نے اس کا تعاقب کیا اور اُس کو دوارسمدر (دوارو تی پور) میں محصور کر لیا جو سلطنت کرناٹک کا مرکز تھا۔ بلال دیو نے صلح نامہ پیش کیا جس پر ملک کافور نے سالانہ خراج کی پابندی عاید کی اور تاوان جنگ جو ایک کثیر مقدار میں ہاتھ آیا مع ویر بلال سوم کے دہلی روانہ کردیا تاکہ علا ءالدین کے روبرو اپنی اطاعت کا اقرار کرے۔

مالابار سے سندر پانڈیہ نے بھاگ کر دہلی کا رخ کیا اور علاءالدین کے پاس پہونچا اور سلطنت پر ویر پانڈیہ قابض ہوگیا۔ مسلمانوں کی آمد پر راجہ نے پایۂ تخت کو چھوڑ کر ایک جزیرہ میں پناہ لی۔ ملک کافور نے بغیر کسی جھگڑے کے کثیر مال و دولت پر قبضہ کرلیا۔ واصف اور خسرو کے بیان کے بموجب اس نے ۳۲۰ ہاتھی ۲۰ ہزار گھوڑے ۵۰۰،۲۷ پونڈ سونا اور جواہرات کے کئی صندوق حاصل کئے۔ اس دولت سے اس کے خیالات پلٹ گئے اور ایک خودمختار سلطنت کے قیام کا منصوبہ اس کے دماغ میں آیا لیکن حالات سے مجبور ہوکر اپنے منصوبہ کو کامیاب نہ بنا سکا۔ اس شکست سے اس کی ہمت بڑھ گئی اور یہ آگے بڑھتا ہوا رامیشورم تک چلا گیا جہاں اس نے یادگار کے طور پر ایک مسجد بھی تعمیر کروائی۔ یہاں اس نے مسلمانوں کو بھی دیکھا جن کا طرز معاشرت، نسلی تمیاز اور زبان وہاں کے ماحول اور جغرافی حالات کی وجہ سے بہت کچھ بدل گئی تھی۔ سنہ ۱۳۱۱ء میں یہ شمالی ہند کی سب سے پہلی اور انتہائی پیش قدمی تھی۔ اورنگ زیب صرف دریائے کاویری تک بڑھ سکا۔ اس طرح تاریخ ہند کا یہ دور جنوب ہند کی فتح اور سیاسی اقتدار کو حاصل کرنے میں سب سے نمایاں رہا۔

علاءالدین خلجی کے بعد اس کا دوسرا بیٹا مبارک خلجی جب سنہ ۱۳۱۶ء میں تخت نشین ہوا تو دیوگری میں بغاوت ہوگئی۔ وہاں ہرپال دیو نے شنکر دیو کو ہٹاکر تخت پر قبضہ کرلیا تھا۔ مبارک خلجی نے ہمت سے کام لے کر دیوگری پر حملہ کردیا۔ اس نے پہلے خسرو کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ بھیجا اور اس کے بعد خود گیا۔ ہرپال دیو کو شکست ہوئی اور دیوگری پر براہ راست قبضہ کرلیا گیا۔ اس طرح مہاراشٹر اسلطنت براہ راست شمالی ہند کے زیر حکومت آگئی۔ گلبرگہ اور ساگر پر فوجی عہدہ دار مقرر کردیے گئے اور دیوگری پر ایک ترکی النسل صوبہ دار مقرر کیا گیا جس کا نام یک لاکی تھا ان انتظامات کے بعد مبارک خلجی نے خسرو کو ورنگل کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ . . . . ورنگل کے راجہ نے اطاعت قبول کرلی اور کثیر مال و دولت نذرانہ کے طور پر پیش کیا جس کی تفصیل ابن بطوطہ نے لکھی ہے یعنی ایک سو ہاتھی ۱۲ ہزار گھوڑے ۶۰ صندوق جواہرات ۲۵۰ پونڈ سونا۔ ورنگل کی سلطنت کے پانچ اضلاع بھی دیوگری میں شامل کردیے گئے۔

خسرو اس فتح کے بعد جنوبی ہند کی طرف روانہ ہوگیا۔ ضیاءالدین برنی نے خسرو کی اس جنوبی مہم کو بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ جن جن شہروں سے یہ فوج گزرتی تھی وہاں کے راجہ شہر چھوڑکر بھاگ جاتے تھے۔ اس نے ان خالی شہروں سے بہت بڑی دولت حاصل کی دولت کی فراوانی نے اسے باغی بنادیا اور یہیں سے اس نے سلطنت دہلی پر قدم جمانے کے منصوبے شروع کردئے۔ دکن کی دولت نے ہر جنرال کو شاہی کے خواب دکھائے اور انھوں نے اسی قوت کے نشے میں سلطنت دہلی پر قبضہ بھی حاصل کیا۔

خلجی دور کے بعد تغلق دور میں غیاث الدین تغلق نے جب شاہی خزانہ خالی پایا تو اپنے بیٹے الغ خان کو ورنگل پر حملے کے لئے روانہ کیا۔ اس لئے یہاں کے راجہ نے دہلی کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھاکر خراج دینا بند کردیا تھا۔ یہ حملہ سنہ ۱۳۲۲ء میں ہوا۔ جب شاہی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کرلیا تو فوج میں یہ غلط خبر مشہور ہوگئی کہ غیاث الدین تغلق کا انتقال ہوگیا ہے جس کی وجہ سے محاصرہ پر برا اثر پڑا۔ راجہ کی فوج نے محاصرین کو سخت شکست دی۔ الغ خاں نے دیوگری میں پناہ لی۔ ضیاءالدین برنی اور ابن بطوطہ کے بیانات میں کچھ اختلاف ہوگیا ہے کیونکہ برنی اس غلطی کا ذمہ دار الغ خاں کو

بتاتا ہے اور بطوطہ اس کو موردِ الزام نہیں سمجھتا۔ بہرحال واقعات کچھ بھی ہوں غیاث الدین تغلق نے اکثر لوگوں کو جو دہلی بھاگ آئے تھے سخت سزائیں دیں۔ اور ایک دوسری فوج الغ خاں ہی کی سرکردگی میں روانہ کی جس کے بعد قلعہ فتح ہوگیا اور راجہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرکے تلنگانہ کے علاقے کو بھی براہ راست دہلی کے تحت کردیا گیا۔

سلطنت دہلی جو ۱۲۹۴ء میں صرف دریائے نربدا تک پھیلی ہوئی تھی ۱۳۳۰ء میں مالابار تک پھیل گئی۔ مسلمانوں کی اتنی وسیع سلطنت اس سے قبل یا اس کے بعد کبھی قائم نہ ہوئی۔ خاندیس کے علاقے میں پٹھانوں کی نوآبادی اسی زمانہ میں قایم ہوئی۔ ان حملوں سے مسلمانوں کے اکثر قبیلے اور خاندان شاہانِ دہلی سے جاگیریں حاصل کرکے دکن کے مختلف علاقوں میں آباد ہوگئے تھے۔

سلطان محمد تغلق (الغ خاں) کے ابتدائی زمانہ میں اس کے بھانجے بہاء الدین گرشاسپ نے جو گلبرگہ کے قریب ساگر میں متعین تھا بغاوت کردی۔ اس کی سرکوبی کے لئے خواجہ جہاں کی قیادت میں شاہی فوجیں روانہ کی گئیں۔ بہاء الدین نے شاہی فوجوں کی آمد سے مرعوب ہوکر دریائے کرشنا اور تنگبھدرا کی درمیانی سلطنت کمپلی میں پناہ لی۔ یہاں اس کا تعاقب کیا گیا۔ یہاں سے یہ دوار سمدرا چلا گیا اور وہاں بھی اس کا تعاقب کیا گیا۔ اس تعاقب میں ان دونوں سلطنتوں کا خاتمہ کردیا گیا اور ان کو براہ راست دہلی کے تحت کردیا گیا۔ بہاء الدین یہاں گرفتار ہوا اور قتل کردیا گیا لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ روپوش ہوگیا اور پھر اس کا پتہ نہ چلا۔

محمد تغلق کے پیشِ نظر سب سے زیادہ مشکل مسئلہ مرکزی قوت کا قیام تھا اس لئے کہ مرکز کو موثر بنائے بغیر اتنی وسیع سلطنت پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ اس نے اس مسئلہ کا حل یہ سوچا کہ دہلی کے بجائے دیوگری کو مرکز بنایا جائے تاکہ شمال، جنوب، مشرق اور مغرب چاروں طرف سے اس کا فاصلہ یکساں رہے۔ دہلی میں بیٹھ کر جنوب ہند کے علاقے مالابار وغیرہ پر تسلط قائم رکھنا بہت ہی مشکل تھا اور پھر ایسے زمانہ میں جب کہ ذرایع حمل ونقل میں بڑی دشواریاں تھیں۔ نظری اعتبار سے اس کا یہ حل بہت ہی مناسب اور بہتر تھا لیکن عملی اعتبار سے اس کا یہ منصوبہ بیکار ثابت ہوا۔ اس نے اپنے اقتدار سے دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو بسالیا لیکن بہت ہی تھوڑے عرصے میں پھر دہلی واپس ہونا پڑا۔ اس ردوبدل سے دولت آباد (دیوگری) میں مسلمانوں کی ایک کافی تعداد آباد ہوگئی اور امرائے صدہ کا ایک بڑا حصہ یہیں مقیم ہوگیا۔ جس کے بعد انھیں امراؤں نے دہلی سے بغاوت کرکے ایک علیحدہ اسلامی سلطنت دکن میں قائم کی جو بعد میں سلطنت بہمنی کے نام سے مشہور ہوئی۔ دکن کی یہ خود مختار سلطنت محمد تغلق کی زندگی ہی میں قائم ہوئی اور بعد میں تاریخ ہند اور تاریخ دکن کی سیاسیات میں ایک بڑے انقلاب کا باعث ثابت ہوئی۔

سید کرار علی

---

افغانی قندھار نہیں۔ دکن کا قندھار جسے قندھار شریف کہا جاتا ہے۔ کیونکہ محمد تغلق کے ساتھ دکن میں آئے ہوئے اولیا واللہ کی چودہ سو پالکیوں میں کا ایک کثیر حصہ قندھار شریف ہی کے حصہ میں آیا۔ یہ دکن کا بلگرام ہے، یہاں سے اولیا، صوفیا، علما، شعرا، مورخین اور مشاہیر پیدا ہوئے جن کے حالات اور کارنامے ” مشاہیر قندھار دکن “ میں پڑھئے جس کو اکبر صدیقی صاحب بی اے نے مرتب کرکے باتصویر شایع کیا اور اب ادارۂ ادبیات اردو کو اس کا حق تصنیف دے دیا ہے۔ (مہتمم)



سلطان مجاهد شاہ بہمنی
۷۷۵ھ تا ۷۸۰ھ



سلطان احمد شاہ ولی بہمنی
۸۲۵ھ تا ۸۳۸ھ

# دکن پر بہمنی خاندان کی حکومت

سلطنت بہمنی کی مبارک تاسیس جو ۱۳۴۷ء میں عمل میں آئی وسط چودھویں صدی کا عظیم الشان واقعہ تھا۔ اس سلطنت کی حقیقی عظمت اس کے جلیل القدر سلاطین کی علمی و عملی شخصیت اور ان کے غیر معمولی سیاسی اور تمدنی کارناموں میں مضمر ہے۔ ان علم برداروں نے دکن کو ایک بلند پایہ سیاست اور پاکیزہ تمدن کے زیور سے اس قدر سنوارا کہ دنیا اس کو پہچاننے لگی اور اب بھی اس کی یاد تازہ ہے دکن کی اصلی عظمت اسی خاندان کی وجہ سے ہے اس وقت دکن کو جس تمدن پر ناز ہے وہ سب شاہان بہمنیہ کا سرمایہ ہے انہیں سلاطین نے دکن کے طول و عرض میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی اور اس کو پھیلایا۔ بہمنیوں کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے بہت جلد دکن کو اپنا گھر بنالیا۔ اس ملک کی جغرافی خصوصیات اپنے میں جذب کرلیں اور اپنی حکومت انہیں خصوصیات کے مطابق بنائی۔ یہ سلطنت اس وقت قائم ہوئی تھی جب کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کمزور ہونے کی وجہ سے سیاست منتشر ہورہی تھی۔ اس کے ذمہ دار کچھ تو اس زمانے کے سیاسی حالات تھے جو خلجی خاندان کے خاتمہ کے بعد ہندوستان میں رونما ہوئے بعض خاندان میں ہندوستان جیسے وسیع ملک کی رہنمائی کی اہلیت نہ تھی مرکز کی کمزوری سے ہر صوبے میں جداگانہ عمل داری قائم ہوگئی۔ دکن کی انفرادیت جس طرح پہلے زمانے میں قائم تھی پھر ابھری ہوگئی اور امرائے صدہ کی بدولت جو دکن کے تاریخ ساز ہیں سلطنت بہمنی کی داغ بیل پڑگئی

## سلطنت بہمنی کا پہلا دور

سلطنت بہمنی کی تقریباً ڈیڑھ سو سال کی تاریخ ہے اس کا ابتدائی زمانہ جب کہ اس سلطنت کے بانی علاءالدین حسن اور اس کے بیٹے محمد شاہ اول نے حکومت کی عہد تاسیس تھا اس دور میں سلطنت کی بنیاد رکھی گئی اور دکن کے طول و عرض اور اس کی قومی اور جغرافی خصوصیات کا صحیح مطالعہ کرکے ایک نہایت خوشگوار نظام حکومت قائم کیا گیا۔ یہ سلاطین بہمنیہ کا سیاسی کرشمہ سمجھنا چاہئے کہ انھوں نے ابتدا ہی سے دکن کو اپنا گھر بنالیا تھا۔ اس جدید ماحول میں اپنے آپ کو اس قدر جذب کرلیا کہ قدیم اہل دکن ان کو اپنا بادشاہ تسلیم کرنے لگے۔ نظام حکومت اس طرح مرتب کیا گیا جو سب کے لئے خوش گوار تھا ہندوؤں کو حکومت میں شریک کیا گیا جس کو تاریخ ہند کا پہلا واقعہ سمجھنا چاہئے، مرکزی حکومت کی بنیاد ڈالی گئی اور سلطنت مقامی حلقوں میں تقسیم کرکے صوبہ داری اور ضلع داری حکومتیں قائم کی گئیں، اگرچہ اس انتظام کا سہرا ان بادشاہوں کے سر ہے جو اس سلطنت کے بانی اور معمار تھے لیکن اس میں اسی سلطنت کے پہلے وزیر اعظم سیف الدین غوری کا بھی ہاتھ تھا۔ محمد شاہ کو اس بات کا امتیاز ہے کہ اس نے شاہی رعب و داب کے لئے خاص اہتمام کیا تھا دربار کو مختلف طریقوں سے سجایا گیا، امراء و رؤسا کے کھڑے رہنے کی جگہ مقرر کی گئی۔ اور بادشاہ کے بیٹھنے کے لئے تخت فیروزہ کے نام سے ایک تخت بنایا گیا جس کی بہت شہرت تھی اور ہندوستان کی تاریخ میں اب تک ایسا تخت نہیں بنا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں اسی تخت کی شہرت سے متاثر تھا اور تخت طاؤس کو بہمنی تخت کا نقش ثانی سمجھنا چاہئے نیز محمد شاہ کے دربار کا تزک و احتشام بھی بہمنیوں کی خاص اختراع ہے۔ اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔

محمد شاہ اول کا انتقال ۷۷۵ھ میں ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مجاہد شاہ تخت نشین ہوا جو تین سال سے زیادہ بادشاہی کرنے نہ پایا کیونکہ اس کے چچا داؤد نے اس کا خاتمہ کرکے خود تخت پر قبضہ کرلیا مجاہد شاہ کے ہمدردوں نے بہت جلد اس کا بھی خاتمہ کردیا اور علاء الدین حسن کے ایک پوتے کو جس کا نام محمد شاہ دوم ہے تخت نشین کیا گیا، محمد شاہ دوم کی تخت نشینی سے اس سلطنت کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس میں نہ صرف ملک کو خانہ جنگی سے نجات ملی بلکہ تمدنی ترقی کی نئی راہیں کھل گئیں محمد شاہ بہت تعلیم یافتہ اور علم دوست آدمی تھا اس کی وجہ سے دکن میں سب سے پہلے علمی سرگرمیاں شروع ہوگئیں جو اس سے پہلے نہیں ہوئی تھیں۔ اور ظاہر ہے کہ محمد شاہ دوم سے پہلے جو زمانہ گذرا تھا وہ تاسیس اور تشکیل کا زمانہ تھا۔ اس میں علمی ترقی نہیں ہوسکتی تھی۔ جب تک استحکام سلطنت کے ساتھ ملک میں سیاسی اطمینان نہ پیدا ہوجائے اہل علم اطمینان کے ساتھ علمی کام نہیں کرسکتے۔ محمد شاہ دوم کے کامیاب نظم و نسق کی وجہ سے ایک طرف تو امن قائم ہوگیا اور دوسری طرف اس کی علم دوستی نے ملک میں علمی دلچسپیاں پیدا کردیں۔ لائق علما جمع کئے گئے مدرسے کھول دئے گئے۔ استادوں کے لئے خاطر خواہ تنخواہیں اور طلبہ کے لئے وظائف مقرر ہوگئے ان علما میں سے جو اس زمانے میں دکن آتے تھے فضل اللہ انجو کا نام ہمیشہ یادر ہے گا جو دنیائے اسلام کا بہت بڑا عالم تھا اسی شخصیت کی وجہ سے دکن میں علم کی دیا روشن ہوئی اور اس کی روشنی ایسی پھیلی کہ دکن علم کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

## سلطنت بہمنی کا انتہائی عروج

جس طرح محمد شاہ اول کے انتقال کے بعد خانہ جنگی کی بدنما شکل پیدا ہوئی تھی اور چند روز تک تمدنی ترقی مسدود ہوگئی اسی طرح محمد شاہ دوم کے بعد بھی بہت سی سیاسی بدمزگیاں پیدا ہوگئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز کے لئے سلطنت بہمنی کے وقار کو دھکا لگا محمد شاہ کا انتقال ۷۹۹ھ میں ہوا۔ اس کے جانشین غیاث الدین اور شمس الدین جو چند مہینوں کے فصل سے اس کے بعد تخت نشین ہوئے اس گراں بار کے متحمل نہیں ہوسکے۔ ایک ترک غلام تغلچین نامی سلطنت پر بری طرح حاوی ہوگیا اور بادشاہ کٹھ پتلی ہوگئے اس وقت ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو ملک کی صحیح رہنمائی کرسکیں۔ علاء الدین حسن کے دوسرے پوتے محمود خاں اور احمد خاں جو بہت لائق اور ذی علم تھے بہمنی سلطنت کے وقار کو بچانے کے لئے میدان میں آگئے اور سازش کرکے تغلچین کو ماردیا اور فیروز خاں تاج الدین فیروز شاہ کے لقب سے تخت فیروزہ پر بیٹھ گیا۔ جو اس خاندان بہمنیہ کا سب سے زیادہ جلیل القدر اور نامور بادشاہ تھا اس کے عہد حکومت میں دکن کی جس قدر ذہنی اور اخلاقی تربیت ہوئی اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے بہمنیوں کا تمدن حقیقت میں اسی عہد کی پیداوار ہے۔ فیروز شاہ فضل اللہ انجو کا شاگرد تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے استاد کے تمام سرمایۂ علم سے فائدہ اٹھایا تھا بلکہ اپنی رسا طبیعت اور غیر معمولی ذہن کی وجہ سے ایسی علمی شان پیدا کردی تھی کہ دنیا کے سلاطین میں اس کی مثال نہیں ملتی اس نے تمام ملک میں اشاعت علم کے تمام ذرائع استعمال کئے۔ دور دراز سے علما جمع کئے اور ان کی خاطر خواہ تواضع کی۔ علم کی مجلسیں منعقد کیں اور ان میں وہ خود بھی ایسا حصہ لیتا تھا کہ گویا وہ بادشاہ نہیں ہے اسی پر حصر نہیں ہے بلکہ فرصت کے اوقات میں وہ بلند پایہ طلبہ کو جمع کرکے ان کو انتہائی مضامین میں درس دیا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ

فیروز شاہ کی ذی علم شخصیت کی وجہہ سے دکن کے در و دیوار علم و فضل سے گونجنے لگے اور گلبرگہ علم کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

علمیت کے ساتھ فیروز شاہ میں سیاسی تدبر بھی کچھ کم نہیں تھا۔ ملک کی کامیاب سیاسی رہنمائی کی اور ہمسایہ سلطنتوں پر اس قدر رعب داب قائم کیا کہ سب سلطنت بہمنی کا لوہا مانتے تھے۔ نیز فیروز شاہ کے پاکیزہ ذوق کی وجہ سے دکن کے تمدن میں بڑی شگفتگی پیدا ہوگئی لباس وضع قطع نئے انداز میں ڈھل گئے لباس کی بعض اختراعیں جو فیروز شاہ نے بنائی تھیں وہ اب تک موجود ہیں اگر فیروز شاہ سے کوئی غلطی ہوئی تھی تو وہ صرف یہہ ہی کہ اس نے اپنے بھائی احمد خاں کی جگہ اپنے بیٹے حسن خان کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔ احمد خاں عمر رسیدہ اور لائق آدمی تھا۔ اس نے خود فیروز شاہ کی تخت نشینی میں مدد دی تھی۔ اسی بناء پر اس زمانے کے مشہور بزرگ حضرت بندہ نوازؒ نے بھی احمد خاں کے لئے اپنا روحانی فیصلہ صادر کردیا تھا اس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ دونوں فریقوں میں ان بن ہوگئی اور احمد خاں کو تلوار کے زور سے تخت حاصل کرنا پڑا

## سلطنت بہمنی کا آخری دور

احمد خاں جو اپنی روحانیت کی وجہہ سے احمد شاہ ولی بہمنی کے نام سے موسوم ہے ۱۴۲۲ء میں تخت نشین ہوا اس کی تخت نشینی سے سلطنت کے استحکام و توسیع میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ علم و فن کی سرگرمیاں اسی طرح قائم رہیں جس طرح فیروز شاہ کے عہد میں تھیں۔ لیکن اس کے عہد میں گلبرگہ کی جگہ بیدر کو پائے تخت بنایا گیا۔ اس انتظام سے یہہ فائدہ ہوا کہ پائے تخت کے لئے بیدر جیسی ایک بلند جگہ مل گئی لیکن گلبرگہ جو ایک زمانے میں علم و فن کا مرکز بن گیا تھا اس کی آب و تاب گھٹ گئی۔ اب دنیا کی توجہہ بیدر کی طرف منعطف ہونے لگی۔ شیخ آذری جو اس زمانے کا مشہور عالم ہے اسی زمانے میں دکن آیا تھا اور دربار کی فیاضیوں سے فائدہ اٹھا کر ملک کی علمی خدمت کرتا تھا۔ اس کو دربار سے یہہ کہا گیا تھا کہ بہمن نامہ کے نام سے سلطنت بہمنی کی تاریخ لکھے۔ چنانچہ اس نے اپنی آخری عمر تک اس کی تکمیل بھی کی تھی لیکن افسوس ہے کہ وہ ناپید ہے۔ ان چند ظاہری چیزوں کے قطع نظر جو بہت کچھ حوصلہ افزا معلوم ہوتی ہیں سلطنت کی تہہ میں بہت سی چیزیں ایسی بھی تھیں جو آگے چل کر اسی سلطنت کے زوال کا باعث ہوگئیں یعنے اسی عہد سے طبقہ واری کشمکش کے بدنما آثار ظاہر ہونے لگے۔ علاء الدین حسن کے عہد سے جو امرائے صدہ اور ان کے خاندان دکن میں آباد ہوگئے تھے وہ اپنے آپ کو دکھنی کہتے تھے اور انھیں اس کا حق بھی تھا کیونکہ دکن کے حقیقی آبادکار اور سلطنت بہمنی کے بانی تھے۔ اور اس پر تقریباً ایک صدی گذر گئی اس کے بعد جو نو وارد ترکستان اور ایران سے یہاں آتے تھے وہ ان میں گھل مل نہیں سکے اور اہل دکن ان کو اپنا دشمن سمجھنے لگے طبقہ واری کشمکش۔ احمد شاہ کے بیٹے علاء الدین ثانی کے عہد میں جو ۱۴۳۴ء میں تخت نشین ہوا بری طرح ظاہر ہوگئی یعنے دونوں فرقوں میں سخت خوں ریزیاں ہونے لگیں ایک ہنگامہ تو اس قدر زبردست ہوا کہ جس میں تمام باہر کے لوگ مار دیے گئے۔ اگرچہ علاء الدین ثانی نے اپنے آہنی پنجہ سے اس آگ کو فرو کردیا لیکن اس کے جانشینوں کے عہد میں اس کی چنگاریاں پھر بھڑک اٹھیں اور بالآخر سلطنت بہمنی کو جلا کر خاک کردیا۔

علاء الدین ثانی کے بعد جس کا انتقال ۱۴۵۸ء میں ہوا تھا اس کا بیٹا ہمایوں اس کا جانشین ہوا لیکن یہ تین سال سے زیادہ حکومت نہیں کر سکا ۔ اس کی بے وقت موت سے بہت نقصان ہوا ۔ اس کے بیٹے چھوٹے تھے، ایک بیٹا نظام شاہ بہمنی کے نام سے تخت نشین کیا گیا تھا وہ جلد مر گیا اور دوسرا بیٹا محمد شاہ لشکری کے نام تخت پر بٹھایا گیا چونکہ اس کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی اس لئے اس کی ماں نرگس بانو مخدومہ جہاں ملک کی سیاسی رہنمائی کرتی تھی لیکن وزارت کی بڑی خدمت پر محمود گاواں ثانی ایک نووارد برسر اقتدار ہو گیا ۔ یہ اگرچہ علاء الدین ثانی کے عہد میں باہر سے آیا تھا اور تجارت کرتا تھا لیکن محمد شاہ لشکری کی کمسنی کے زمانے میں اس نے بہت ترقی کرلی ۔ اور سلطنت کے تمام سیاہ و سفید اس کے سپرد ہو گئے ۔ محمد شاہ کے سن رشد کے پہنچنے کے بعد بھی اس کے اقتدار میں کمی نہیں ہوی محمود گاواں کے اقتدار سے بہت سے فائدے بھی ہوئے چنانچہ ملک میں علمی کام ہوے اور دستور میں اضافے ہوے لیکن اس کی تنگ نظری سے دکھنی فریق بیزار ہو گیا اور اس کو مارنے کے درپے ہو گیا چنانچہ ایک خاص موقع پر جب کہ بادشاہ اور محمود گاواں مشرقی اور شمالی ٹنگانے کی مہم میں مصروف تھے ایک سازش ہو گئی ۔ بادشاہ کو محمود گاواں کی طرف سے بدظن کیا گیا ۔ بادشاہ نے ناعاقبت اندیشی سے اس کو مارنے کا حکم صادر کر دیا ۔

محمود گاواں کا قتل جو ۱۴۸۱ء میں ہوا دکن کا بڑا واقعہ ہے اسی واقعہ کے بعد سے سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا ۔ کیونکہ جو لوگ اس کے قتل کے ذمہ دار تھے ان میں سیاسی رہنمائی کی صلاحیت نہ تھی ۔ ملک حسن بحری جو نظام الملک کے خطاب سے سرفراز تھا اس فعل کا ذمہ دار تھا اگر اس میں محمود گاواں کی وزارت کے سنبھالنے کی صلاحیت ہوتی تو سلطنت اپنی جگہ قائم رہتی اور شیرازہ نہیں بکھرتا لیکن افسوس یہ ہے کہ نظام الملک اور اس کا فریق بالکل خود غرض تھا ۔ ان کی نااہلیت اور خود غرضی کی وجہ سے ہر قدم پر ملک کو نقصان پہنچنے لگا جو لوگ محمود گاواں کے آوردہ تھے سب حکومت سے متنفر ہو گئے اور ہر جگہ انحراف کرنے لگے محمد شاہ لشکری کی زندگی تک جو ۱۴۸۲ء میں ہوا تھا حالات کسی قدر رو براہ تھے لیکن اس کے انتقال کے بعد جب اس کے کمسن بیٹے محمود شاہ بہمنی کو تخت نشین کیا گیا تو علانیہ خود سری ظاہر ہونے لگی ۔ اکثر صوبہ دار باغی ہو گئے چنانچہ ۱۴۹۰ء میں احمد نگر اور بیجاپور اور برار کے صوبہ داروں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا چند سال بعد گولکنڈہ بھی خود مختار ہو گیا ۔ ۱۴۹۰ء کو سلطنت بہمنی کی آخری تاریخ سمجھنا چاہئے بیدر میں جو سلطنت کا مرکز ہے قاسم برید ذی اختیار ہو گیا جو در اصل شہر کا کوتوال تھا ۔ محمود شاہ اور اس کے تمام جانشین سب اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو گئے تھے ۱۵۱۸ء میں محمود شاہ کے مرنے کے بعد اس کے چار بیٹے احمد شاہ، علاء الدین ثالث، ولی اللہ، کلیم اللہ یکے بعد دیگرے برائے نام تخت پر بٹھائے گئے تھے لیکن یہ سب بریدیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھے ۔ بالآخر کلیم اللہ حق ناشناس بریدیوں کی دست درازیوں سے تنگ آکر ۱۵۲۷ء میں احمد نگر بھاگ گیا اور اس کے ساتھ تخت فیروزہ پر بیٹھنے والے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے ۔

عبدالمجید صدیقی

# مُجاہد شاہ بہمنی

مجاہد شاہ سلطنت بہمنی کا تیسرا تاجدار ہے۔ اس کی جگہ ایسی صف میں ہے جہاں بالعموم کسی کی نظر نہیں پڑتی لیکن اپنے درجہ میں بھی وہ مطالعہ کے قابل ہے۔ اگرچہ اس کی مختصر زندگی کچھ زیادہ جاذبِ نظر نہیں مگر اس کے بعض پہلو نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ سبق آموز ہیں۔

مجاہد شاہ محمد شاہ کا بیٹا اور علاء الدین حسن گنگو کا پوتا تھا۔ یہ ۱۳۷۵ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۳۷۸ء میں قتل کر دیا گیا۔ اس طرح اس نے صرف تین سال حکومت کی۔ اس کا قاتل خود اس کا چچا داؤد شاہ تھا۔ جب مجاہد شاہ نے وجیانگر پر حملہ کیا اور وہاں کے راجہ کشن رائے کو بری طرح شکست دی تو واپسی میں وہ دریائے کرشنا کے کنارے آرام کے لئے ٹھیرا اس کے دشمنوں نے موقع پا کر اسے یہاں قتل کر دیا۔

مجاہد شاہ ایک بیدار مغز حکمران اور ایک نہایت اچھا سپاہی تھا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی سلطنت کے چاروں طرف نظر ڈالی اور ان اسباب کو بغور دیکھا جہاں سے حملے ہوتے تھے۔ اگرچہ سلطنت بہمنی کو خاندیش، مالوہ اور گجرات کی شمالی سلطنتوں سے بھی خطرہ تھا لیکن جنوبی سلطنت وجیانگر ہمیشہ پریشانی کا باعث رہتی تھی۔ علاء الدین اور محمد شاہ کے عہد میں اس سلطنت سے لڑائیاں ہو چکی تھیں اور کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ مجاہد شاہ کی نظر سب سے پہلے اسی ہمسایہ سلطنت پر پڑی۔ اس نے بین سلطنتی سمجھوتہ کرنا چاہا اور وجیانگر کو لکھا کہ آئندہ نزاع کا سدباب اس طرح ہو سکتا ہے کہ تمہارے اور ہمارے درمیان حدود کا تعین ہو جائے۔ چنانچہ مجاہد شاہ نے اپنی طرف سے یہ تجویز کی تھی کہ دریائے تنگبھدرا حد فاصل ہو۔ لیکن کشن رائے اس تجویز پر راضی نہیں ہوا۔ وہ رائچور اور مدگل کا دوآبہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس نے تنگبھدرا کی بجائے دریائے کرشنا کو حد فاصل بنانا چاہا۔ لیکن مجاہد شاہ اس کو کیسے مان لیتا۔ چنانچہ اپنی تجویز کو منوانے کے لئے اس نے حملہ کر ہی دیا۔

مجاہد شاہ کے غیر معمولی توائے جسمانی اور اس کے ساتھ اس کی شجاعت اور جوانمردی اس کی زندگی کے روشن پہلو ہیں۔ سلطنت بہمنی کا عام دستور تھا کہ وہ اپنے شاہزادوں کو خاطر خواہ تعلیم و تربیت دیتے اور درس و تدریس کے لئے لائق اساتذہ فراہم کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ تمام سلاطین بہمنی اچھے تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ بعض تو اونچی قابلیت رکھتے تھے۔ نیز ان کو جسمانی اور فوجی تربیت دی جاتی تھی اور وہ اچھے سپاہی ہوتے تھے۔ چنانچہ تمام معرکوں میں سلاطین بہمنی بذات خود حصہ لیتے تھے۔ اسی ماحول میں مجاہد شاہ کی بھی اٹھان ہوئی تھی۔ چونکہ اس کے قویٰ بھی کافی اچھے تھے اس لئے اس پر تعلیم و تربیت کا غیر معمولی اثر ہوا تھا۔ فرشتہ کے قول کے مطابق وہ شمشیر نیزہ اور خنجر کے سوا بات نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ مجاہد شاہ کے اس شوق شمشیر آزمائی کے متعلق بہمن نامہ کے اشعار یہ ہیں۔

زگہوارہ چوں پائے بیروں نہاد — بہ تیر و کمان دست و بازو کشاد
ببستہ تند گردن کفش پیل زور — کہ نشنید گفت کسے وقت شور
چناں بر سر کنگرہ می دوید — کہ انگشت حیرت فلک می گزید

مجاہد شاہ سلطنت بہمنی کا بہت بڑا سپہ سالار تھا۔ اس کی سپہ سالاری کے حقیقی جوہر اس وقت ظاہر ہوئے جبکہ سلطنت وجیانگر سے اس کی ان بن ہو گئی تھی۔ وہ ۱۹ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا اور حملۂ وجیانگر کے وقت اس کی عمر مشکل سے ۲۲ سال ہو گی۔ اس نو خیز عمر میں اس کا دلیرانہ معرکہ اس کی زندگی کا اعجوبہ تھا۔ کشن رائے کے مقابلہ سے پہلے گنگاوتی کے آگے اس نے جو خونخوار شیر کا سر نکال کیا تھا وہ دکنیوں میں عرصہ تک زبان زد خاص و عام رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس اقدام جرأت کا وجیانگر پر اتنا رعب پڑا تھا کہ کشن رائے اور اس کی فوج سہم کر رہ گئی تھی۔

کشن رائے کے عہد میں سلطنت وجیانگر کی جو عظمت تھی وہ سب کو معلوم ہے۔ اس کی فوجی طاقت بہت زیادہ تھی۔ ایسی طاقتور سلطنت کا مقابلہ کچھ آسان نہیں تھا۔ اس موقع کی نزاکت کے باوجود مجاہد نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ یہ بڑے گھمسان کا معرکہ تھا۔ گو اس حملے کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا تھا لیکن اس میں مجاہد شاہ نے جو کارنامے دکھائے تھے وہ ہمیشہ یاد رہیں گے۔ کوئی معرکہ ایسا نہ تھا جس میں اس نے حصہ نہ لیا ہو۔ وجیانگر کی چڑھائی، شرنگا حملہ، قلعہ ادھونی کا محاصرہ، اور رامیشورم تک کشن رائے کا تعاقب اس کے مشہور کارنامے ہیں جو بھلائے نہیں جا سکتے۔ ان چڑھائیوں میں ایک امتیازی بات یہ تھی کہ کہیں قتل عام نہیں کیا گیا۔ جو دشمن مقابلہ کرتا تھا اسی کو مارا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مجاہد شاہ کے باپ محمد شاہ کی وصیت تھی جس کی پابندی کی گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر شجیع سپہ سالار کے اوصاف میں یہ چیز داخل ہے۔

اگر مجاہد شاہ کی زندگی مہلت دیتی تو شاید دنیا کے بڑے بادشاہوں میں اس کا شمار ہوتا۔ دریائے کرشنا کے کنارے جہاں اس کے دشمنوں نے اس کا خاتمہ کرنا چاہا تھا اس وقت بھی اس نے اپنی فطری شجاعت کے جوہر دکھائے۔ یہ کیمپ میں سو رہا تھا کہ دشمنوں نے اس پر وار کیا۔ داؤد خاں نے خنجر بھونکا تو اس کی آنتیں نکل آئیں تھیں لیکن اس کے باوجود اس نے داؤد کو اس کے خنجر کے ساتھ پکڑ کر کھینچا اور قریب تھا کہ داؤد مر جاتا لیکن اس کے ایک ساتھی مسعود خاں نے اس کو مار دیا اور اس طرح دکن کا یہ ہونہار حکمراں موت کے گھاٹ اتار گیا۔

## سلطان احمد شاہ ولی بہمنی

عبدالحفیظ صدیقی

احمد خاں بہمنی بن سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے دوسرے بیٹے تھے۔ ولادت ۷۷۴ھ م ۱۳۷۲ء میں بعہد سلطان محمد شاہ بن سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی ہوئی۔ باپ کے انتقال کے وقت یہ اور ان کے بھائی فیروز شاہ صغیر سن تھے۔ اور ان دونوں کی پرورش و پرداخت ان کے چچیرے بھائی محمد شاہ ثانی نے کی۔ ان دونوں کو تیر اندازی، چوگان بازی، سواری، پڑھنا، لکھنا غرض کہ ہر شاہی علم و فن کی اچھی تعلیم دی۔ اور شیراز کے مشہور اور متبحر عالم میر فضل اللہ انجو کو ہر دو کی تعلیم و تربیت کے لئے مقرر کیا اور اپنی دونوں بیٹیاں ان دونوں بھائیوں کو بیاہ دیں۔

جب فیروز شاہ بادشاہ ہوا تو احمد خاں کو خانخاناں کا خطاب دیا اور امیر الامرا مقرر کیا۔ وہ نہایت شجاع اور خوبصورت جوان تھے چہرہ روشن اور پیشانی خندہ تھی۔ خلوص ارادت سے حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو دراز سے بیعت کی۔ بصرف زر کثیر حضرت کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کرائی اور ہمیشہ حاضر خدمت ہو کر اسرار معرفت کا سبق لیتے اور ہر محفل سماع میں شریک ہو کر نکات تصوف سے محظوظ اور توجہ حضرت سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ چنانچہ حضرت نے ان کی نسبت بادشاہی کی پیشین گوئی کی تھی جس کی وجہ سے فیروز شاہ بہت رنجیدہ ہوا اور حضرت کو شہر گلبرگہ سے باہر جا کر رہنے کا حکم دیا۔ اور مصاحبین کے ورغلانے سے احمد خاں سے بھی بدظن ہوا اور اپنے دو غلاموں ہوشیار عین الملک، بیدار نظام الملک کی صلاح سے ان کو اندھا کرانے کا ارادہ کیا۔ جب ان کو اس کی اطلاع ملی تو اپنے فرزند علاء الدین کے ساتھ شہر سے بھاگ نکلے اور حضرت کے ارشاد و خوشی کر مطمئن ہو کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

جب ان کے بھاگ جانے کی خبر فیروز شاہ کو ہوئی تو ایک فوج اپنے دو غلام ہوشیار اور بیدار کے ساتھ پکڑ لانے کے لئے روانہ کی۔ انھوں نے بھی اطلاع پاکر مختصر سی فوج تیار کرکے شاہی فوج کا مقابلہ کیا جس میں ان کو کامیابی حاصل ہوئی۔

فیروز شاہ ان کی فتح کی خبر سن کر قلعہ کا دروازہ کھلوا کر اپنے پاس بلوایا۔ وہ فیروز شاہ کے پاس گئے اور اس کے قدموں پر سر رکھ کر

جوحالت بیماری میں فریش تھا زار و قطار رونے لگے۔ فیروز شاہ نے سر اٹھا کر خوشی کے لہجہ میں کہا کہ میں نے تم کو اپنے عین حیات بادشاہ دیکھا تم شایان سلطنت ہو اور استحقاق اس کا تمہیں کو پہونچتا ہے۔ میں شفقت پدری سے حسن خاں کی ولیعہدی کی سعی کرتا رہا جب کارفرمایان قضا و قدر میرے بعد تاج سلطنت تمہارے لئے نامزد کر چکے ہیں تو دوسرے کے لئے کوشش بے فائدہ ہے۔ حسن خاں کو تمہارے سپرد کیا۔ اٹھو آج ہی سے مہمات سلطنت کو انجام دینا شروع کرو۔ غرض شوال پانچویں ۸۲۵ھ کو تاج بادشاہی کا زیب سر کر کے تخت فیروزہ پر جلوہ گر ہوئے اور اپنا نام "احمد شاہ بہمنی" رکھا۔

مہمات سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلے خلف حسن بصری کو وکیل امور سلطنت کر کے ہزار و صدی کا منصب عطا کیا اور ملک التجار خطاب دیا۔ اور ہوشیار و بیدار غلاموں میں سے ایک کو خطاب امیر الامرائی اور دوسرے کو دولت آباد کی فوج کی سپہ سالاری کے منصب سے سرفراز فرمایا۔ اور فیروز شاہ کے بیٹے حسن خاں کو جو وارث تاج و تخت تھا اور جمیع ارکان دولت جس کے قتل یا قید کرنے کی صلاح دیتے تھے منصب پانصدی عطا کیا اور فیروز آباد جاگیر میں دیا اور وہاں اس کو آزادی سے رہنے اور سیر و شکار کرنے کی اجازت بھی عطا کی۔ یہ شہزادہ چچا کی زندگی تک وہاں سیر و شکار میں مشغول رہ کر اپنی زندگی خوب مزے سے بسر کرتا رہا۔

راجہ دیجیا نگر نے سرکشی شروع کی اور خراج دینے سے انکار کیا۔ علاوہ اس کے گزشتہ جنگ میں مسلمانوں کا بیدردی سے کشت و خون ہوا تھا اس کا بدلہ لینا بھی ضروری تھا۔ اس لئے پچاس ہزار سوار جرار ہمراہ رکاب لے کر دیجیا نگر کی طرف روانہ ہوئے۔ راجہ رائے ورنگل کی مدد سے مقابلہ میں آیا۔ دونوں فوجیں دریائے تنگبھدرا کے کنارے ایک دوسرے کے سامنے اتریں لیکن دونوں میں سے کوئی آگے بڑھ کر اول حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر بہمنی فوج کا ایک دستہ یکایک ایسی پھرتی سے دریا پار اترا کہ راجہ دیو رائے بھی حیران رہ گیا اور اس کی فوج فوراً منتشر ہو کر بھاگ نکلی۔

ایک دن احمد شاہ چند سواروں کے ساتھ شکار کو نکلے۔ ہندوؤں نے جو موقع کی تاک میں تھے پیچھا کیا اور چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے سلطان کے سب ساتھی کام آنے مگر اس اثناء میں کمک آپہونچی اور دیجیا نگر کی تسخیر کا مصمم ارادہ کیا۔ دیو رائے نے گھبرایا اور اس نے حیرانی میں کئی سال کے خراج کی بقایا رقم کو ہاتھیوں پر لاد کر فی الفور بارگاہ سلطانی میں داخل کر دیا۔ اور بہت ہی عجز و انکسار سے صلح کی درخواست کی۔ دونوں میں صلح ہو گئی۔ بوقت واپسی تلنگانہ پر چڑھائی کی۔ رائے ورنگل نے بافوج کثیر آپ کا مقابلہ کیا۔ آخر مارا گیا۔ ملک تلنگ کو اپنے تصرف و اقتدار میں لیا اور مظفر و منصور ہو کر واپس ہوئے۔

انہیں ایام میں سلطان بیدر کے ایک میدان سے گزرے جو نہایت پرفضا تھا۔ حکومت کے لئے ایک مرکزی مقام کی ضرورت تھی جہاں سے پورے دکن پر حکومت کی جا سکے۔ بیدر چونکہ دکن کے وسط میں نہایت بلندی پر واقع تھا اس لئے سلطان نے اس کو پسند فرما کر یہیں شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام احمد آباد بیدر رکھا۔ اور رجب ۸۲۶ھ م ۱۴۲۳ء میں گلبرگہ کے بجائے بیدر کو پائے تخت قرار دیا۔ یہاں قلعہ حصار اور محلات شاہی و باغات وغیرہ چار سال کے قلیل عرصہ میں تعمیر کرائے۔

بیدر میں سلطنت کرتے ہوئے چند سال گزرے تھے کہ امساک باراں سے سخت قحط پڑا نہریں اور باؤلیاں خشک ہو گئیں انسان و حیوان مرنے لگے۔ سلطان نے خزانہ کا منہ کھول دیا۔ اور غلہ کے شاہی ذخائر غرباء اور مساکین میں لٹا دئے۔ جب ایک سال اس طرح گذرا اور دوسرے سال بھی بارش نہ ہوئی سلطان نے علماء و مشائخ اور زہاد کو ساتھ لے کر نماز استسقا ادا کی لیکن جب یہ بھی بے سود ہوا تو سلطان

بنفس نفیس صحرا کی طرف تشریف لے گئے اور تنہا بلندی پر چڑھ کر چند دوگانے ادا کئے۔ دعا مقبول ہوئی اور اس قدر مینھ برسنے لگا کہ لوگ خوش ہوگئے اور اسی دن سے سلطان "احمد شاہ ولی" کے لقب سے مشہور ہوگئے۔

سلطان کو قواعد لشکر کشی اور آئین فرمانروائی میں کافی مہارت تھی۔ وہ ہر کام میں بھائی کی پیروی کرتے سادات علماء اور مشائخ کی تعظیم و تکریم کرتے۔ فقیروں اور درویشوں سے بہت عقیدت رکھتے۔ صوم و صلوٰۃ کے اتنے پابند کہ کبھی تہجد اور اشراق تک قضا نہیں ہونے دی اور کل مہام سلطنت بذات خود انجام دیتے۔ غریب سے غریب رعایا کی فریاد سنتے اور انصاف فرماتے اور گاہے گاہے مثل ہارون رشید خلیفۂ بغداد کے بھیس بدل کر رعایا کے حالات دریافت کرتے۔ کبھی مسجدوں اور مدرسوں میں جاکر وہاں کے حالات دیکھتے اور کبھی دفاتر میں جاکر ملک کے نظم و نسق کو ملاحظہ فرماکر اصلاحیں جاری فرماتے۔ غرض آپ نے اخلاق حسنہ سے خاص و عام کو مطیع و فرمانبردار بنالیا تھا۔

جن دنوں میں سلطان جنگ میں مصروف تھے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نے رحلت فرمائی۔ جس کا سلطان کو بہت صدمہ ہوا۔ ایک روز بھرے دربار میں اپنے صاحبزادوں کو طلب کیا اور سب کی طرف مخاطب ہوکر بولے۔ جب مالک اپنے بندہ کو اپنے پاس بلائے تو کیا کرنا چاہیئے۔ مجمع نے جواب دیا کہ اپنے مالک کا حکم بجالانا چاہیئے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ جناب الٰہی مجھے طلب فرماتے ہیں اور حضرت پیر و مرشد بندہ نواز گیسو دراز کی یاد ستا رہی ہے۔ اب باغ عالم کی سیر سے دل کو سیر ہوگیا۔ یہ کہہ کر آپ نے ملک کے مختلف علاقوں پر فرزندوں کو حاکم مقرر فرمایا۔ چنانچہ ولایت "رام نگر" "مدھول" "کلم" "برار" اور ولایت "ماہور" کا شاہزادہ محمود خاں کو حاکم مقرر کیا۔ شاہزادہ داؤد خاں کو رائچور اور تلنگانہ کا اور ولیعہد علاء الدین کو اپنی جگہ بادشاہی دی اور چھوٹے شہزادہ محمد خاں کو بڑے بھائی کا شریک شاہی کیا اور عدم مخالفت کے بارہ میں چاروں سے قسم لی اور ضروری وصیت اور سب کو اتفاق کی ہدایت کرکے دربار برخاست اور پھر یاد حق میں ایسے مشغول ہوئے کہ عین حالت عبادت میں ۲۹ ذی الحجہ ۸۳۹ھ کو بوقت شب واصل بحق ہوئے۔ سلطان کا گنبد بیدر سے ایک کوس کے فاصلے پر موضع اشٹور کے میدان میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

محمد ظہیر الدین

# پُرانا پُل

(حیدرآباد)

لرزتی نگاہوں کا فرمان ہے تو
دھڑکتے ہوئے دل کا احساں ہے تو
ثباتِ تمنا کی پہچان ہے تو
رُکا جس سے طوفاں وہ طوفان ہے تُو

(۲)

گلستانِ چچلم کی رنگیں کہانی
قطب شاہ کے دل کی کافر جوانی
غرورِ محبت کی زندہ نشانی
ضیائے چراغ شبستان ہے تُو

(۳)

پڑی "بھاگ نگری" کی بنیاد تجھ سے
ہوا دشتِ ویران آباد تجھ سے
بنا تجھ سے، ہاں حیدرآباد تجھ سے
مری داستانوں کا عنوان ہے تُو

(۴)

وہ دن جا چکے، وہ زمانہ نہیں ہے
وہ زلفیں نہیں ہیں وہ شانہ نہیں ہے
مگر یہ حقیقت، فسانہ نہیں ہے
کہ سچی محبت کا پیمان ہے تُو

میکش

# بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت

سلطنت بہمنیہ کے زوال کے بعد دکن میں جو پانچ اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں ان میں دو بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومتیں سیاسی، اور تمدنی حیثیت سے نہ صرف دوسری ریاستوں سے بہت زیادہ ممتاز تھیں، نہ صرف حدود ارضی کی وسعت بلکہ فوجی قوت میں یہ دوسری دکنی ریاستوں سے بڑھی ہوی تھیں بلکہ ہندوستان کی دوسری متعدد حکومتوں سے زیادہ پائدار اور برتر تھیں۔ ان کی عالیشان عمارتیں اور تہذیب وتمدن کے دوسرے آثار آج بھی ان کی عظمت اور اہمیت کو یاد دلاتے ہیں۔ بیجاپور کا بول گنبد، ابراہیم روضہ اور سیکڑوں خوش نما مسجدیں، گولکنڈے کا عظیم الشان قلعہ، بادشاہوں کے گنبد، حیدرآباد کا چار مینار اور مکہ مسجد ان دونوں خاندان کی وہ زبردست یادگاریں ہیں جو آج بھی سیاحوں کو اپنی طرف کشاں کشاں لے آتے ہیں۔ اگرچہ آخری دور میں ان ریاستوں میں بہت سی کمزوریاں پیدا ہوگئی تھیں اور یہ مغلوں کی باج گزار بھی بن گئی تھیں اورنگ زیب عالم گیر نے سلطنت مغلیہ کو کشمیر سے لے کر راس کماری تک وسیع کرنے کے جوش میں ان کا خاتمہ کر کے خود اپنی سلطنت کو ہمیشہ کے لئے کمزور اور زوال پذیر کردیا۔

سب سے پہلے عادل شاہی ریاست ہی اس کی جوع الارض کا شکار بنی اور یوسف عادل شاہ نے ٨٩٥ھ میں جس ایوانِ حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی وہ دو سو سال قائم رہ کر منہدم ہو گیا۔ یوسف اصل میں ترکی شہزادہ اور سلطان مراد کا دوسرا بیٹا تھا شیرخوارگی کے زمانے میں باپ کے انتقال اور بھائی کی تخت نشینی کے بعد اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس لئے ماں نے بڑی دانش مندی اور چالاکی سے اس کو موت کے منہ سے چھڑا کر خواجہ عمادالدین گرجانی نامی تاجر کے ساتھ راتوں رات قسطنطنیہ سے باہر بھیج دیا سوداگر مذکور یوسف کو لے کر ایران پہنچا اور یہاں شہر ساوہ میں سکونت اختیار کی، یوسف کا ابتدائی زمانہ ایران میں ہی گزرا اور یہیں تعلیم وتربیت پائی۔ جب جوان ہوا تو خواجہ عماد کے ساتھ بطریق تجارت وسیاحت ٨٦٤ھ میں ہندوستان میں داخل ہوا۔

ان دنوں ہندوستان میں بہمنیہ سلطنت اپنے پورے عروج پر تھی۔ سلطان محمد بہمنی کا دربار خود اس کی اولوالعزمی اور عالی حوصلگی اور اس کے وزیر خواجہ جہاں خواجہ محمود گاواں کے تدبر اور حسن انتظام کی وجہہ سے مرجع خلایق بنا ہوا تھا۔ یوسف بھی ہندوستان آیا تو سیدھے خواجہ محمود گاواں کے ہاں باریاب ہوا، خواجہ جہاں نے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جہاں اس کی قابلیت کے جوہر کی آزمایش کے بعد اس کو شاہی چیلوں یا مقربین خاص کے زمرے میں شریک کرلیا گیا۔ سلطان محمود بہمنی کے دربار میں یوسف نے اپنی علمی اور فوجی قابلیتوں کے متعدد ثبوت دئے اور ہر قسم کے انعامات اور اعزازات سے سرفراز ہوتا گیا۔ یوسف عادل خاں اور ملک الشوق کے خطابات بھی پائے اور کئی سیر حاصل پرگنے بھی جاگیر کے طور پر ملے۔ مختلف موقعوں پر میدان جنگ کی سرکردگی اور فوجوں کی سپہ سالاری کے فرایض انجام دینے کے علاوہ پہلے جنیر کا عامل اور بالآخر سلطنت کے بہت بڑے صوبہ بیجاپور کا طرف دار یعنے گورنر مقرر ہوا۔

سلطان محمود اور اس کے وزیر خواجہ جہاں دونوں کی موت سے سلطنت بہمنیہ روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ بریدی امیر نے بادشاہ کو

اپنے ہاتھ میں کٹھ پتلی بناکر خود حکومت شروع کردی اور سلطنت بہمنیہ تباہی کے قریب ہوگئی تو یوسف نے احمد نظام الملک طرف دار احمدنگر کی تحریک سے دوسرے صوبہ داروں کی طرح اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور ۸۹۵ھ یا ۸۹۶ھ میں عادل خاں کی بجائے عادل شاہ کا لقب اختیار کرکے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کیا۔

## یوسف عادل شاہ

خودمختار ہوتے ہی یوسف عادل شاہ اپنی ریاست کے اندرونی و بیرونی استحکام میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ قاسم برید نے تیم راج مہاراجہ بیجانگر اور بہادر گیلانی کو اس کے خلاف اکسایا۔ اولاً عادل شاہ کے دو تین زرخیز علاقوں پر دشمنوں کا قبضہ ہو گیا لیکن بالآخر اس نے کئی معرکوں میں دشمنوں کا مقابلہ کرکے ان سے نہ صرف اپنے علاقے واپس لے لیے بلکہ ایک مدت کے لئے اُن کو خاموش کردیا۔ بیرونی استحکام سے فراغت پاکر جب وہ اندرونی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا تو اس سلسلے میں بھی بڑی مشکلات کا سامنا ہوا وہ نہ صرف شیعہ عقائد کی طرف مائل ہوگیا تھا بلکہ اپنی ریاست پر شیعیت کو سرکاری مذہب کی طرح رائج کرنے پر مُصر بھی تھا۔ اس کے تمام امرا اور خاص و عام سب سنّی تھے۔ بادشاہ کے اس ارادے اور راج ہٹ نے بڑی زبردست اندرونی فساد اور ایک بیرونی جنگی طوفان کی صورت اختیار کرلی ۹۰۰ھ میں کمزور بہمنی بادشاہ محمود شاہ اس کا متبنیٰ اور نائب السلطنت قاسم برید جو عملاً بیدر کا بادشاہ تھا، احمد نظام شاہ والی احمدنگر اور قلی قطب شاہ فرماں روائے گولکنڈہ چاروں متحدہ طور پر بیجاپور پر حملہ آور ہوئے اور یوسف عادل شاہ کو سوائے وہاں سے بھاگ جانے کے اور کوئی چارہ نہ رہا۔ وہ بھاگ کر خاندیس میں عماد الملک کے پاس پناہ گزیں ہوا۔ یہاں اس نے اپنے خیالات سے دست برداری کی قسم کھائی اور عماد الملک نے بیچ میں پڑکر چاروں حملہ آوروں سے معذرت کی اور اُن کے لشکر واپس کرائے۔ یوسف کی خوش قسمتی تھی کہ ریاست دوبارہ مل گئی اور ایک زبردست فتنہ ختم ہو گیا، اگرچہ یوسف نے شیعہ عقائد کی ترویج نہ کرنے کی قسم کھائی تھی لیکن وہ ارادے سے باز نہ آیا اور جب دوبارہ اپنے تخت پر مستحکم ہو گیا تو اس نے زیادہ اہتمام اور ہوشیاری کے ساتھ بالآخر شیعیت اختیار کی اور بعد کو اس کے خاندان اور ریاست کا سرکاری مذہب اثنا عشری ہی قرار دیا۔

یوسف نے کم و بیش بائیس سال حکومت کی اور (۷۵) سال کی عمر میں ۹۱۶ھ میں وفات پائی اور حسب وصیت اس کی جاگیر جو بہمنی بادشاہ کی عطا کی ہوئی تھی، قصبہ گوگی (نصرت آباد) میں حضرت شاہ چندہ حسینیؒ کے پائین دفن کیا گیا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے بیٹے اسماعیل کو اپنا جانشین کرکے مسند نشینی کے رسوم ادا کردیے تھے۔ اسماعیل کے علاوہ اس کی اولاد میں تین لڑکیاں، مریم سلطان، خدیجہ سلطان اور بی بی ستی تھیں، یہ سب اور اسماعیل اس کی بیوی پونجی خاتون کی اولاد تھیں جو ایک دکنی خاتون تھی۔ مریم سلطان برہان نظام شاہ کو، خدیجہ سلطان علاء الدین عماد الملک اور بی بی ستی احمد شاہ بہمنی سے بیاہی گئیں۔ یوسف ملک گیری اور ملک داری کے علاوہ اعلیٰ علمی لیاقت سے بہرہ ور متصف تھا وہ فارسی کا اچھا شاعر اور خط نستعلیق کا عمدہ خوش نویس تھا۔ فن موسیقی کا بھی شائق اور طنبورا اور عود بجانے میں مہارت رکھتا تھا۔ اس کی علم دوستی کی

وجہ سے بہت سے لایق اور قابل افراد اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔ اس کو تعمیر عمارات کا کوئی زیادہ موقع نہیں ملا۔ بریں ہمہ اس کے عہد کی بعض عمارتیں ہیں مگر بہت شکستہ حالت میں۔ وہ عام طور پر عدل و انصاف میں کافی شہرت رکھتا تھا اور اپنی شجاعت کی طرح سخاوت میں دور دور مشہور تھا۔

## اسماعیل عادل شاہ ۱۵۱۰ء - ۱۵۳۴ء

یوسف عادل شاہ نے اپنی زندگی سے مایوس ہو کر اپنے سامنے ہی اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیل کو مسند نشین کر دیا تھا اور انصرام امور سلطنت کے لئے کمال خاں دکھنی کو وزیر اعظم کے علاوہ کمسن بادشاہ کا متولی (ریجنٹ) بھی قرار دے دیا تھا۔ اس وقت اسماعیل کی عمر بارہ، تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھی، کمال خاں جو داراب جبردی کے نام سے بھی موسوم ہے، پونجی خاتون کے مشورہ و ہدایت سے ریاست کے کاروبار تن دہی اور ہوشیاری سے انجام دینے لگا، ہم سایہ ریاستوں کے ساتھ تعلقات میں جو کشیدگی چلی آرہی تھی اس کو اپنے حسن تدبیر سے بہت جلد دور کر دیا اور گوآ بندرگاہ کے پرتگالیوں سے جن کی سرکوبی یوسف عادل شاہ نے بھی کی تھی مصلحت وقت کے تحت صلح کر لی اور اطمینان کے ساتھ ریاست کی اندرونی اصلاحات کی طرف متوجہ ہوا لیکن چند سال فراغت اور اطمینان سے حکمرانی کرنے کے بعد اکثر متولیاں ریاست کی طرح اس کی نیت بدل گئی اور اس نے بادشاہ کی کمسنی اور خارجی سیاسی حالات کے مدنظر خود بادشاہ بن بیٹھنے کی ٹھان لی۔ اس کی حرکات سے پونجی خاتون اور دیگر شاہ پرست افراد بے خبر نہیں تھے مگر اس کے غیر معمولی اثر و اقتدار اور چالاکیوں کے آگے ان کی ایک نہیں چلتی تھی۔ بادشاہ محل میں قیدی کی طرح تھا اور کمال خاں کے آدمی اس کی ذرا ذرا سی نقل و حرکت پر نظر رکھتے تھے۔

باوجود اس سخت انتظام کے پونجی خاتون نے ایک تدبیر ایسی نکالی کہ اس کا کانٹا ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔ پونجی خاتون نے اسماعیل نامی ایک غلام کے ذریعے بڑی ہوشیاری سے کمال خاں کا کام تمام کر دیا اور پھر اس کے بیٹے صفدر خاں کی لشکرکشی پر بڑی مردانہ ہمت سے اس کا مقابلہ کر کے بالآخر اس کو بھی ختم کیا اور اسماعیل کو خود سر متولی کے پنجے سے ہمیشہ کے لئے رہائی دلائی۔ اسماعیل نے خود مختار ہو کر دکھنیوں اور حبشیوں کو خدمات سے الگ کر کے مغلوں کو ان کی جگہ مامور کیا۔ خسرو آغا لاری کو جو اس کا طرف دار تھا اور کمال خاں کے مقابلے پر بڑی ساتھ داری کی تھی اسد خاں لاری کے خطاب سے سرفراز کر کے کئی علاقے بھی بطور جاگیر عطا کئے اور مہمات سلطنت میں اس کو مشیر اور وزیر بنایا۔

اسماعیل کی زندگی کا بڑا حصہ جنگ میں گزرا۔ اس کے عہد میں متعدد جنگیں ہوئیں۔ سب سے پہلے قاسم برید سے جنگ چھڑی۔ قاسم برید نے برہان نظام شاہ، قلی قطب شاہ اور علاء الدین عماد الملک کی مدد سے بیجاپور پر چڑھائی کر دی، مگر اسماعیل نے ان چاروں سے مقابلہ کیا اور شکست دی۔ سب کی فوجیں تتر بتر ہو گئیں سلطان محمود شاہ بہمنی اور اس کا بیٹا احمد شاہ جو بریدی لشکر کے ہمراہ تھے، اسماعیل کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔ اسماعیل نے ان دونوں کو بہت احترام اور خاطر تواضع سے مہمان رکھا اور پھر اپنی بہن ستی بی بی کی شادی احمد شاہ سے بہت اہتمام کے ساتھ بمقام گلبرگہ انجام دے کر دونوں کو بیدر واپس کیا۔

اسماعیل کے عہد کی دوسری جنگ راجائے بیجانگر سے ہوئی، بیجانگر کے راجہ نے اپنی سرحد کے استحکام کے لئے رائچور اور مدگل کے قلعے اور ان کے آس پاس کے علاقے کو فتح کرنے کے لئے ایک بڑے جرار لشکر سے ۱۵۲۰ء میں بڑی معرکۃ الآرا جنگ کی۔ اسماعیل اور اس کے سپہ سالاروں نے بڑی مردانگی سے مقابلہ کیا مگر بدقسمتی سے شکست اٹھائی۔ اس جنگ میں ناکامی سے اسماعیل کی طاقت اور شہرت کو بہت دھکا لگا اور وہ

عرصہ دراز تک بیجانگر والوں سے جنگ آزمانہ ہوا بہت دنوں کے بعد رائچور کو دوبارہ فتح کیا اس زمانے میں اس نے اپنی طاقت بڑھانے کے لئے دوسرے ہمسایہ بادشاہوں سے تعلقات مضبوط کرنے کی کوشش شروع کی۔ ۱۹۳۰ء میں اسد خاں کی توجہ سے برہان نظام شاہ اور مریم سلطان ہمشیرہ اسماعیل کی شادی ہوگئی مگر یہ شادی بجائے تعلقات کو بہتر بنانے کے دشمنی و عداوت میں اضافے کا موجب بنی۔ شادی کے وقت طے ہوا تھا کہ قلعہ شولاپور جہیز میں دیا جائے گا مگر بعد کو اسماعیل نے انکار کیا۔ نظام شاہ نے بہ زور شمشیر فتح کرنے کی ٹھان لی اور تین مرتبہ زبردست معرکہ آرائی ہوی مگر ہر وقت نظام شاہ کو شکست ہوی۔ آخر تک یہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن بنے رہے۔

اسد خاں نے اتحاد بڑھانے کے سلسلہ میں اسماعیل کی دوسری بہن خدیجہ سلطان کی شادی علاء الدین عماد الملک بادشاہ برار سے طے کرادی اس کے کچھ دن بعد ہی قاسم برید نے جو اس عرصے میں کسی قدر طاقتور ہو گیا، اسماعیل سے جنگ کی طرح ڈالی اس کو قلی قطب شاہ اور والی بیجانگر کی تائید بھی حاصل تھی، اسماعیل اس کی دراز دستیوں سے تنگ آ کر دس ہزار سپاہ کا لشکر لئے ہوے اس پر حملہ آور ہوا اور بری طرح اس کو شکست دے کر قلعہ بیدر پر قابض ہو گیا۔ قاسم برید قید ہوا اور بہت دنوں کے بعد اسماعیل کی مہربانی سے پھر اپنے علاقے پر حکمران بنا مگر باوجود اس حسن سلوک کے اسماعیل کے ساتھ اس نے دوستی اور وفاداری نہیں کی۔

اسماعیل نے ان جنگوں سے فراغت پا کر کچھ دن اصلاح ملک میں صرف کئے تھے کہ موت کا پیغام آ پہنچا اور ۱۵۳۴ء (۹۴۱ھ) میں حوالی سگر میں اس کا انتقال ہو گیا اور اپنے باپ کے پہلو میں دفن کیا گیا، اسماعیل نے کل (۲۴) سال حکومت کی وہ بڑا بہادر اور فیاض واقع ہوا تھا، اس نے محض اپنی فیاضی سے قاسم برید کو پھر بیدر جیسا زرخیز علاقہ دوبارہ بخش دیا، بدقسمتی سے اس کا تمام تر زمانہ جنگوں میں گزرا ملک کی اندرونی اصلاح کی طرف کبھی خاطر خواہ توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا، اس کی اولاد میں چار لڑکے ملو خاں، علو خاں، ابراہیم خاں اور عبداللہ خاں باقی تھے، عقیدتاً وہ شیعہ تھا اور اس کے عہد میں کمال خاں کے زوال کے بعد سے مغلوں اور ایرانیوں کا عروج رہا۔ اس کو شاعری اور موسیقی سے بھی بہت دلچسپی تھی اور تاریخوں میں اس کے اشعار جستہ جستہ منقول ہیں۔

## ابراہیم عادل شاہ اول ۱۵۳۴ء--۱۵۵۷ء

اسماعیل کی وفات پر اس کے حسب وصیت اسد خاں غازی نے اس کے بڑے بیٹے ملو خاں کو تخت نشین کیا اور اس کی فطری بد اطواری کے مدنظر خود کنارہ کش ہو کر اپنی جاگیر بلگام چلا گیا، چھ مہینے کے اندر ملو خاں نے اپنی نالائقی سے ساری رعایا برایا کو اپنے سے متنفر کر دیا۔ آخر کار اس کی دادی پونجی خاتون کے ایما سے وہ تخت سے الگ کیا گیا اور ابراہیم خاں "ابراہیم عادل شاہ" کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

ابراہیم کی تخت نشینی کے ساتھ ہی اسد خاں کو پونجی خاتون کے حکم سے پھر کاروبار سیاست میں حصہ لینا پڑا۔ ابراہیم خود بھی بہت بہادر اور تیز فہم نوجوان تھا۔ وہ اسد خاں کے مشورے سے کاربار کرنے لگا، ابھی ایک سال نہیں گزرا تھا کہ والی بیجانگر سے لڑائی ہوئی، مقابلہ بہت سخت تھا مگر اسد خاں کی تجربہ کاری کام کر گئی، اس نے ادھونی کے مقام پر بیجانگر کے لشکر کو شکست فاش دے کر ابراہیم کا سکہ بٹھا دیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اسد خاں کے مراتب میں اور بھی اضافہ کیا مگر کچھ دنوں کے بعد سازشیوں نے بادشاہ کو اس سے بدظن کر دیا اور وہ کنارہ کش ہو کر پھر بلگام چلا گیا۔

بادشاہ اور سپہ سالار کی اس ناچاقی سے فائدہ اٹھا کر برہان نظام شاہ حملہ آور ہوا اور قلعہ شولاپور جس کے لئے وہ اسماعیل کے زمانہ میں

تین مرتبہ ناکام کوشش کرچکا تھا فتح کرلیا اور بیجاپور کی طرف پیش قدمی کرنے لگا اسد خاں کی وفاداری اس کو کسی طرح روا نہیں رکھ سکتی تھی وہ پھر ابراہیم سے آملا اور عماد الملک والی برار کی امداد سے نہ صرف قلعہ شولاپور واپس لے لیا بلکہ برہان نظام شاہ کو بیڑ تک مار بھگایا۔

نوجوان ابراہیم سے شکست کھا کر برہان نے پہلے سے زیادہ تیاریاں کیں اور رام راج والی بیجانگر، جمشید قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ اور علی برید تینوں کو اپنے ساتھ ملا کر ۱۵۴۶ء میں چڑھائی کی۔ اس موقع پر اسد خاں کی حسن تدبیر سے رام راج ان سے الگ کردیا گیا اور شولاپور کا قلعہ جو اصل میں سارے جھگڑے کا باعث تھا، بغیر لڑائی کے نظام شاہ کے حوالے کردیا گیا اور اسد خاں نے ان دونوں کا تصفیہ کرنے کے بعد جمشید قلی قطب شاہ کا مقابلہ کیا اور اس کو بے طرح شکست دی۔ باوجود اس حکمت عملی اور حسن تدبیر کے لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ برہان نظام شاہ اور والی بیجانگر اور برہان کے جانشین حسین نظام شاہ نے ابراہیم سے کئی مرتبہ لڑائیاں کیں اور بہت کچھ خوں ریزی ہوئی مگر آخرکار ابراہیم ہی کامیاب رہا۔ ان لڑائیوں کے دوران میں اسد خاں سے وقتاً فوقتاً ابراہیم کو بڑی مدد ملتی رہی مگر اس کے مخالف ہمیشہ بادشاہ کو اس کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے بالآخر کچھ تو پیری کی وجہ سے اور کچھ بادشاہ کی ناراضی دیکھ کر اسد خاں بلگام میں گوشہ نشین ہوگیا۔ اسد خاں کے بعد احمد نگر کا سپہ سالار جو عین الملک کے خطاب سے ممتاز ہوکر ابراہیم کا ملازم ہوگیا تھا، اس کے لشکر کی سپہ سالاری کرتا رہا مگر وہ بہت جلد باغی ہوگیا۔

ابراہیم اگرچہ بڑا بہادر سپاہی اور اہل سیف کا بہت قدردان تھا مگر اس کی سختی کی وجہ سے بہت سے لوگ ہمیشہ اس سے ڈرتے رہتے تھے اسی خوف نے دشمنی کی شکل اختیار کی اور سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ اس کو معزول کرنے اور اس کے بھائی عبداللہ کو بادشاہ بنانے کی سازش ہونے لگی سازش کا راز فاش ہوتے ہی عبداللہ بھاگ کر گوا میں پرتگالیوں کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔ اور چند روز کے لئے ان کی حمایت سے اپنی بادشاہی کا اعلان بھی کرایا مگر ابراہیم کی زبردست فوجی قوت اور اس کے لشکریوں کی وفاداری سے عبداللہ کو کبھی اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی، پرتگالی بھی اس قضیے میں پھنس کر نفع کی بجائے ہمیشہ فوجی نقصان برداشت کرتے رہے۔

ابراہیم اپنے باپ کی طرح علم دوست بھی تھا اور میدان جنگ میں اس کی شجاعت و بہادری ہمیشہ لائق ستائش رہی مگر تند خو اور سخت گیر بھی بہت زیادہ تھا۔ اپنی علالت کے زمانے میں جس کا سلسلہ تقریباً دو سال رہا۔ جلد صحت یاب نہ ہونے پر بگڑ کر کئی طبیبوں کو قتل کر ڈالا اور بعض کو ملک بدر کردیا۔ وہ اپنی اولاد کے ساتھ بھی سختی کرنے سے باز نہیں رہتا تھا۔ اس کا دوسرا فرزند علی بڑے بھائی کے مقابلے میں جو ولی عہد تھا بہت تیز تھا اس نے کمسن شہزادے کو اپنے ولی عہد کے حق میں مضر سمجھ کر نہایت بے دردی سے کم عمری میں ہی قلعہ مرچ میں قید کردیا تھا۔

ابراہیم نے کم و بیش (۲۴) سال خدمت کرکے ۱۵۵۶ء (۹۶۵ھ) میں وفات پائی اور اپنے باپ دادا کے پہلو میں بمقام نصرت آباد اگوگی دفن کیا گیا اس کے کل چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ بڑا اسماعیل ولی عہد مگر بہت غبی اور کودن تھا۔ منجھلا علی بہت زیرک تھا اور وہی باپ کے بعد اس کا جانشین ہوا۔ دوسرے دو لڑکوں کے نام طہماسپ اور احمد تھے۔ لڑکیوں میں ایک تاج بی بی علی برید سے بیاہی گئی تھی اور دوسری جس کا نام ہدیہ سلطان بتایا جاتا ہے مرتضیٰ نظام شاہ بحری سے منسوب تھی۔

اگرچہ ابراہیم کا زمانہ زیادہ تر لڑائیوں میں گزرا لیکن اس نے اس پر بھی بہت سے کام اصلاح و ترقی ملک کے لئے ۹۳۳ھ میں ابراہیم پور کے نام ایک شہر آباد کیا اور وہاں ایک عالی شان مسجد بنائی۔ ۹۳۵ھ میں سولہ کھمبی محل تعمیر کرایا۔ نیز غالباً یہ مسجد جس میں صرف روشنی کے لئے ۳۰۳ طاقچے تھے اور جامع مسجد جو درگاہ حضرت جعفر سقاف سے متصل ہے اسی کی بنائی ہوئی ہیں ان کے علاوہ اس کے عہد میں بیجاپور اور رائچور کے قلعوں کی فصیلوں کی درستی اور استحکام کا کام بھی انجام پایا۔

# سلاطین بیجا پور



سلطان ابراهیم عادل شاہ اول
سنہ ۹۴۱ ھ تا سنہ ۹۶۵ ھ



سلطان علی عادل شاہ اول
(شوہر چاند سلطانہ)
سنہ ۹۶۵ ھ تا سنہ ۹۱۱ ھ

## علی عادل شاہ اوّل ۱۵۵۷ء - ۱۵۸۰ء

شہزادہ علی کو قلعہ مرج میں قید کردیا گیا تھا مگر قید میں بھی اس کی تعلیم و تربیت بہت ہی اعلیٰ درجے کی ہوئی تھی اور وہ اپنے سب بھائیوں سے زیادہ لایق تھا۔ باپ کے عقائد کے خلاف وہ شیعہ عقائد کی طرف مائل تھا اور اس کے اتالیق، رفیق اور نگران بھی بہت ہوشیار اور ابراہیم کی موت کے منتظر تھے انھوں نے ابراہیم کے مرنے سے پہلے ہی اس کی بادشاہت کے منصوبے پورے کرلیے۔ ادھر ابراہیم فوت ہوا اور ادھر علی کی بادشاہی کا اعلان دیں قلعہ مرج سے کردیا گیا۔ چندہی روز میں بیجاپور علی نے اپنے دوسرے بھائیوں کو جو باپ کے مرتے ہی قید ہوگئے تھے اندھا اور ناکارہ کردیا اور بے کھٹکے بادشاہت کرنے لگا۔ اس کو چونکہ شیعہ عقائد میں سخت تر غلو تھا اس لئے اس نے اہل ایران کو کثرت سے بیجاپور میں جمع کیا اور شیعہ عقاید کی ترویج میں بہت شدت دکھائی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی فیاضی اور داد و دہش اس قدر زیادہ تھی کہ مذہب کے معاملے میں اس کی سختی پر غالب آگئی۔ اگرچہ سنی مسلمان اس کی حرکات اور خصوصاً تبرّا پسندی سے سخت ناراض تھے لیکن اس کے احسان عام نے "مذہبی جنگ" کو روک دیا اس کی تخت نشینی پر والی بیجانگر نے مبارک باد دی اور دوستی کی طرح ڈالی مگر اس کے برخلاف حسین نظام شاہ والی احمد نگر نے بہت کج خلقی دکھائی اسی لئے بیجاپور اور بیجانگر کے تعلقات بہت بڑھ گئے۔ دونوں ملکوں کے فرماں رواں کر حسین نظام شاہ سے ۹۷۶ھ میں متصادم ہوئے اور اس کو بہت نقصان پہنچایا۔ پھر اگلے سال دونوں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ اس دفعہ حسین نظام شاہ نے ابراہیم قطب شاہ کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا مگر علی عادل شاہ نے ابراہیم کو اس سے الگ کردیا۔ اس دفعہ احمد نگر کی ریاست بری طرح تباہ ہوگئی اور تینوں نے مل کر حسین نظام شاہ کو بہت تنگ کیا ان دونوں جنگوں میں والی بیجانگر اور اس کے لشکر نے بیجاپوریوں کی احسان مندی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عام طور پر ایسی حرکات کیں کہ جس سے مسلمانوں کی سخت دل آزاری ہوئی ان کی مسجدیں توڑ ہی نہیں ڈالیں بلکہ بت خانوں سے بدل دیں نیز بیجاپور اور گولکنڈے کے بہت سے علاقے دستی کے پردے میں چھین لئے، دولت اور مال غنیمت کی کثرت نے والی بیجانگر کو بے حد خود سر بنا دیا تھا جس کی وجہ سے علی عادل شاہ اور دوسرے فرماں رواؤں کو سخت خطرہ لاحق ہوگیا۔ اس اتفاقی موقع سے فائدہ اٹھا کر بیجانگر نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ایک ایک کرکے ان اسلامی ریاستوں کو ختم کرنے کی تدبیریں ہونے لگیں۔ اور ہر موقع کی نزاکت کو محسوس کرکے بیجاپور احمد نگر اور گولکنڈے کے بادشاہ بھی اپنی پچھلی عداوتیں بھلا کر متحد ہوگئے اور ۹۷۲ھ میں سب نے مل کر تالی کوٹ کے میدان میں بیجانگر والوں سے فیصلہ کن مقابلہ کیا، میدان اتحادیوں کے ہاتھ رہا، بیجانگر کا شہر تاراج ہوگیا اور اس کی سلطنت کو بھی ایسا دھکا پہنچا کہ وہ پھر پنپ نہ سکی۔

اگرچہ بیجانگر سے جنگ کرنے کیلئے اتحاد بڑے زور شور سے عمل میں آیا تھا اور حسین نظام شاہ کی بیٹی چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے اور علی عادل شاہ کی بہن کی شادی حسین نظام شاہ کے بیٹے مرتضیٰ نظام شاہ سے ہوگئی تھی لیکن باوجود ان سب باتوں کے ان ریاستوں میں پھر لڑائی جھگڑے شروع ہوے اور علی عادل شاہ برابر آخر تک جنگوں میں گھرا رہا۔

علی عادل شاہ لاولد تھا اس لیے اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بھتیجے ابراہیم ابن طہماسپ کو ۹۸۷ھ میں اپنا ولی عہد قرار دے دیا تھا ابھی اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اگلے ہی سال یعنے ۹۸۸ھ م ۱۵۸۰ء میں علی عادل شاہ ایک خاین غلام کے ہاتھ قتل ہوگیا۔ اس کی مدت حکومت (۲۳) سال اور عمر (۴۷) سال تھی۔ اس کی وفات سے ریاست بیجاپور کو بہت نقصان پہنچا کیونکہ گو اس کا جانشین ابراہیم بعد کو بہت بڑا بادشاہ ثابت ہوا لیکن اس کی کمسنی کے زمانے میں متولیوں نے ریاست کو بہت کم زور کردیا۔

علی عادل شاہ کو تعمیر عمارت کا بہت شوق تھا۔ اس کے عہد میں جو عمارتیں بنیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے خاص طور پر مشہور یہ ہیں۔ قلعہ شاہ درگ (نلدرگ) فصیل قصبہ شاہ پور، نہر کشور خانی، پریا محل، آنند محل، گگن محل، باغ دوازدہ امام، باغ فدک، مسجد جامع چاند باؤلی، قلعہ دھارور، قلعہ بنکا پور وغیرہ۔

## ابراہیم عادل شاہ ثانی ۔ ۱۵۸۰ ۔ ۱۶۲۷ء

جب علی عادل شاہ کے حسب وصیت ابراہیم ابن طہماسپ تخت نشین ہوا تو اس کی عمر صرف نو سال تھی۔ اس کی چچی چاند بی بی کے زیر ہدایت کامل خاں متولی اور مختار ریاست کی حیثیت سے کام کرنے لگا مگر بہت جلد وہ خود سر ہو گیا۔ اس کی جگہ چاند بی بی کے اشارے سے کشور خاں متولی بنا گروہ بھی چند ہی دنوں میں حد درجے خود سر اور دشمن ملک و مالک ثابت ہوا۔ اس نے تو خود چاند بی بی کو بے حرمتی سے محل سے نکال کر قید کر دیا۔ اس کے مارے جانے پر اخلاص خاں نے متولی کا عہدہ پایا۔ پھر دلاور خاں مختار کل بنا اور اسی کے زمانۂ مختاری میں ابراہیم قطب شاہ کی بیٹی اور محمد قلی قطب شاہ کی بہن ملکہ جہاں سے جس کا عرف چاند سلطانہ ہو، ابراہیم عادل شاہ کی شادی ہوئی۔

ان متولیوں کے زمانۂ اقتدار میں آس پاس کے اکثر بادشاہوں نے بیجا پور پر متعدد حملے کئے اور اس کو نقصان پہنچایا اس کے علاوہ متعدد مرتبہ کئی خانہ جنگی، امرا اور متولیان ریاست کے جھگڑوں سے بیجا پور کو باوجود خوش حالی کے بہت نقصان پہنچا۔ دلاور خاں کے زمانہ مختاری میں اسماعیل نے جو ابراہیم کا چھوٹا بھائی تھا ایک بڑی بغاوت کی اور سارے ملک میں ہل چل مچ گئی۔ دلاور خاں کی در پردہ شرارتوں کے باوجود ابراہیم کے اقبال سے اسماعیل کا قلع قمع ہو گیا مگر دلاور خاں بادشاہ کی نظروں میں بے طرح کھٹک گیا۔ اب بادشاہ نے جو سن بلوغ کو پہنچ چکا تھا اور ہر طرح کاروبار ریاست سنبھال سکتا تھا، دلاور خاں کو معزول کر کے ۱۰۰۰ھ عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور بہت کرو فر کے ساتھ بیجا پور میں داخل ہوا۔ اس نے چند بیرونی جھگڑوں سے الگ رہ کر اندرون ملک کی اصلاح و تعمیر شروع کی ۱۰۰۸ھ میں ایک نئے شہر نورس پور کو آباد کیا اور رفتہ رفتہ دیگر بہت سی عمارتیں بنائیں۔ شعرا و علما سے اپنے دربار کو آراستہ کیا، فن موسیقی کے بڑے بڑے ماہرین کو جمع کیا کیونکہ اس کو اس فن سے طبعی لگاؤ اور اس میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس کی کتاب نورس آج تک مشہور ہے۔

اس کے خود مختار ہونے سے کچھ دنوں قبل ہی چاند بی بی اپنے میکے چلی گئی اپنی آبائی ریاست احمد نگر کو جو ابراہیم نظام شاہ کی جوان مرگی کی وجہ سے بے طرح خود غرض امرا کی تباہ کاریوں کا شکار بنی ہوئی تھی، سنبھالنے کی کوشش کی۔ مغلوں نے اس پر پے در پے حملے کر کے اس کے اکثر حصوں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ شہنشاہ اکبر کی فتوحات کا سلسلہ اور آگے بڑھا۔ اس نے ابراہیم عادل شاہ سے بھی خراج طلب کیا اور ابراہیم نے اس کے مقابلے میں اپنے کو کمزور پا کر خراج منظور کر لیا۔ اس کے بعد مغلوں کا زور اور بھی بڑھ گیا۔ ابراہیم نے اکبر کے پیغام بھیجنے پر اپنی لڑکی سلطان بیگم کی شادی شہزادہ دانیال سے کر دی۔ اکبر کے بعد جہانگیر اور اس کے بیٹے شہزادہ خرم نے دکن کے کئی علاقوں پر جو عادل شاہی نظام شاہی اور قطب شاہی ریاستوں کی ملک تھے اپنا قبضہ جمایا۔ ابراہیم نے بیدر پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا۔ ادھر ملک عنبر نے بیجا پور پر حملہ کیا اور ابراہیم کے آباد کئے ہوئے نورس پور کو ہمیشہ کے لئے تباہ و تاراج کر دیا اور خود بھی چند ہی روز میں فوت ہو گیا۔ ابراہیم کو اس کا بڑا رنج ہوا مگر ملک عنبر کے مر جانے کی وجہ سے وہ اس سے بدلہ نہ لے سکا۔

ابراہیم نے پورے (۴۷) سال حکومت کی اور ۱۶۲۷ء (۱۰۳۶ھ) میں انتقال کیا۔ اس نے متولیوں کا دور زوال ختم ہونے کے بعد



سلطان ابراهیم عادل شاه ثانی
( نورس )
۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ



سلطان محمد عادل شاه
۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۷ھ

تیس سال سے زاید مدت تک جو خود مختارانہ حکومت کی وہ زمانہ زیادہ تر پُرامن رہا اور اس عرصے میں اس نے ریاست کی اندرونی اصلاح کے بہت سے کام کئے۔ اس کو تعمیر عمارات کا بہت شوق تھا، اس کے عہد میں کثرت سے عمارتیں بنی ہیں مثلاً آثار محل، آنند محل، مسجد ملکۂ جہاں، نورس محل یا سنگت محل، نورس پور کی عمارات وغیرہ ابراہیم روضہ اس کے عہد میں بہت سی اور بھی تمدنی ترقیاں ہوئیں اور کئی رسوم و تقاریب کا اضافہ ہوا جیسے عید نورس وغیرہ، اس کا مقبرہ جو ابراہیم روضہ کے نام سے مشہور تعمیری نقطۂ نظر سے ایک بہترین یادگار رہے اور اپنی گل کاریوں اور نقش و نگار کے اعتبار سے دکن کا تاج محل سمجھا جاتا ہے۔

اس کے کل چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں جو مختلف محلات کے بطن سے تھے۔ بڑا بیٹا درویش پادشاہ محمد قلی قطب شاہ کی بہن ملکۂ جہاں کے بطن سے تھا مگر ابراہیم اس کی ماں سے ناراض تھا علاوہ ازیں چھوٹا سلطان محمد اس کے مقابلے میں باپ کا منظور اور زیادہ لایق تھا اس لئے اس کو اپنا جانشین کیا۔

## محمد عادل شاہ ۱۶۲۷ء - ۱۶۵۶ء

جس وقت سلطان محمد اپنے مرحوم باپ کے حسب وصیت تخت نشین ہوا اس کی عمر پندرہ سال کی تھی، مرزا محمد امین لاری، دولت خاں آقا رضا اور دیانت الملک امرا مختلف عہدوں پر مامور کئے گئے اور یہی نوجوان بادشاہ کے مشیر اور مددگار تھے اگرچہ بادشاہ کم عمر تھا لیکن اپنی فراست طبعی سے فوراً فوج کی اصلاح میں مصروف ہوگیا۔ چند ہی دن کے بعد نظام شاہی خاندان کے فرماں روا نے چڑھائی کی ابھی زیادہ معرکہ آرائی نہیں ہوئی تھی کہ صلح ہوگئی مگر یہہ دیرپا ثابت نہیں ہوی۔ دوبارہ نظام شاہی فوج حملہ آور ہوی اور بری طرح شکست کھائی۔ اس واقعہ کے بعد نظام شاہی ریاست روز بہ روز کمزور ہونے لگی امرا اور صوبہ دار جو پہلے سے خودسر بن بیٹھے تھے بہت کچھ خود مختار ہوگئے رہی سہی طاقت مغلوں کے پے در پے حملوں نے توڑ دی۔ بہت سے علاقے محمد عادل شاہ کے قبضے میں آگئے۔

شاہ جہاں نے جب یہہ دیکھا کہ محمد عادل شاہ قوی سے قوی تر ہوتا جارہا ہے تو اس نے نظام شاہی ریاست کے مفتوحہ علاقوں کی واپسی کی پہلے سے چھیڑ چھاڑ شروع کی اور نہایت تکلیف دہ مراسلے لکھے، محمد عادل شاہ نے ان کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ بعض نمک حرام امرائے عادل شاہی کی ریشہ دوانیوں سے شاہ جہاں کو پیش قدمی کے اچھے موقعے مل گئے۔ وہ جلد اجلدی دولت آباد تک آپہنچا۔ محمد عادل شاہ نے بیجاپور میں قلعہ بند ہوکر شہر کے اطراف میلوں تک وسیع میدانوں کو بے آب و گیاہ بنادیا تاکہ مغل فوج محاصرہ نہ کرسکے، چنانچہ اس کی یہہ تدبیر کامیاب رہی۔ مغلوں نے بیجاپور کا محاصرہ تو کیا مگر اس کو فتح نہ کرسکے اور مجبوراً صلح پر آمادہ ہوگئے۔ عادل شاہ نے بھی اس شرط پر صلح کرلی کہ رود کرشنا کے اس طرف کا تمام علاقہ شاہ جہاں کے قبضے میں دے دیا جائے اور اس طرف کا سارا علاقہ بدستور بیجاپور کی ریاست میں شامل رہے نیز تاوان جنگ کے طور پر بیس لاکھ روپے شاہ جہاں کو ادا کئے جائیں۔

مغلوں سے پیچھا چھوٹا کہ محمد عادل شاہ نے کرناٹک کے سرکش حاکموں سے کئی لڑائیاں کیں اور بہت سے علاقے فتح کرکے اپنی ریاست کو وسیع اور مالا مال کیا اور اپنی ساری توجہ رعایا کی فلاح اور ملک کی اصلاح و ترقی کے کاموں میں صرف کی۔ اس دوران میں برابر شاہ جہاں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی مگر بہ مقتضائے وقت اس نے جنگ نہیں کیا بلکہ ممکنہ حد تک مغل بادشاہ کے حسب مرضی کام کرتا رہا۔ باوجود اس کے محمد عادل شاہ کے زمانے میں بیجاپور کی ریاست کو کافی وسعت ہوی اور رعایا کی خوش حالی تو ایسی تھی کہ اگلے کسی بادشاہ کے

دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے ۔

محمد عادل شاہ نے فصیلوں اور برجوں کی مرمت کے علاوہ ،آدمحل، بیگم تالاب وغیرہ کئی عمارات اور متعدد مسجدیں بنائیں جن میں سب سے زیادہ مشہور خود اس کا گنبد ہے محمد عادل شاہ نے ۱۶۵۶ء میں (۳۰) سال سے زیادہ عرصے تک حکومت کرکے وفات پائی اور اپنے گنبد میں جو گول گنبد یا بول گنبد کے نام سے مشہور ہے، دفن ہوا' یہ گنبد اس قدر بڑا ہے کہ ہندوستان بھر میں کوئی اور گنبد اس کے برابر نہیں ۔ اس کی یہ خصوصیت مسلمہ اور مشہور ہے کہ ایک سرے پر کھڑے ہوکر خفیف سی خفیف آواز پیدا کی جائے تو دوسرے سرے پر برابر سنائی دیتی ہے اسی وجہ سے اس کو بول گنبد کہتے ہیں۔ سیکڑوں سیاح اس گنبد کو دیکھنے کے لئے بیجاپور آتے ہیں ۔ اس کے عہد میں علوم و فنون کی بہت ترقی ہوئی اور کئی بڑے بڑے شعرا اور علما اس کے دربار میں ملازم تھے ۔

## علی عادل شاہ ثانی ۱۶۵۶ء ۔ ۱۶۷۲ء

علی عادل شاہ ثانی اپنے نامور باپ کا اکلوتا بیٹا تھا ۔ خوش قسمتی سے محمد عادل شاہ کی حرم خاص حاجی بڑی صاحبہ نے جو محمد قطب شاہ کی بیٹی تھی، خاص اہتمام سے اس کی پرورش اور تربیت کی اور علوم متداولہ اور فنون متعارفہ میں ہر طرح ماہر بنایا ۔ وہ (۱۹) سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور اپنی والدہ کی ہدایت اور خان محمد خاں وزیر ملک اور دیگر معتبر ارکان ریاست کے مشورے سے کاروبار ریاست انجام دینے لگا ۔

شاہ جہاں نے جو اپنی سلطنت کے حدود وسیع سے وسیع تر کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا اس بہانے کہ ریاست بیجاپور سلطنت تیموریہ کی باج گزار ہے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کی اور یہ اعتراض اٹھایا کہ ہماری منظوری کے بغیر علی عادل شاہ کس طرح تخت نشین ہوسکتا ہے ۔ اس نے یہاں تک لکھ دیا کہ علی عادل شاہ صلبی فرزند نہیں متبنیٰ ہے اور اس لئے وارث تخت و تاج نہیں کر علی عادل شاہ ثانی نے ان اعتراضات کے ترکی بہ ترکی جواب دئے ۔ جب مراسلت کا کوئی اثر نہیں ہوا تو اسی سال اورنگ زیب نے ایک بڑی فوج لے کر حملہ کیا اور بیدر اور کلیانی کے قلعے فتح کرکے اس کے بعد بیجاپور کا بھی محاصرہ کرلیا ۔ ابھی علی عادل شاہ ثانی کو تخت نشین ہوکر ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اس طرح زبردست دشمن سے مقابلہ آن پڑا ۔ بیجاپور کے امرا آپس کی ناراضیوں کی وجہہ سے خاطر خواہ متحد اور وفادار نہیں تھے ۔ محاصرہ روز بہ روز شدید ہو رہا تھا کہ شاہ جہاں کی علالت کی خبر پاکر خود اورنگ زیب محاصرہ اٹھاکر دہلی کو روانہ ہوا ۔ جس وقت مغلوں کا لشکر محاصرہ کررہا تھا خان محمد وزیر مملکت سے جو سرحد پر مقابلے کے لئے متعین تھا' ملاقی ہوا' خان محمد نے اورنگ زیب کی عاجزانہ التجا اور اس چالبازانہ وعدے کی بنا پر کہ جب تک وہ وزیر مملکت ہے' بیجاپور کی طرف مغل کبھی پیش قدمی نہیں کریں گے' اورنگ زیب سے مزاحمت نہیں کی خان محمد کی یہ حرکت جس کی قباحت کا خود اس کو یقین تھا ' اس کی موت کا باعث ہوی ۔ اس کے قتل کے بعد ابراہیم خاں وزیر مملکت بنایا گیا ۔ اور سپہ سالاری کی خدمت افضل خاں کے سپرد ہوئی ۔

ابھی اس طرف سے سکون نہیں ہوا تھا کہ سیواجی نے جو محمد عادل شاہ کی علالت کے زمانے میں قلعہ جنیر پر قبضہ کرلیا تھا' مزید پیش قدمی کی اور کوکن اور اس کے پاس کے علاقوں میں لوٹ مار مچادی اور کئی قلعوں پر قبضہ کرلیا اس کی سرکوبی کے لئے افضل خاں کی سرکردگی میں ۱۶۴۶ء میں فوج روانہ کرنی پڑی مگر سیواجی نے افضل خاں کو دھوکا دے کر تنہائی میں قتل کرڈالا اور پھر اس کی فوج کو پیچھے سے حملہ کرکے اچانک



سلطان سکندر عادل شاہ
۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۷



سلطان علی عادل شاہ ثانی
(شاہی)
۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ

زبردست شکست دی۔ افضل خاں کے بعد سدّی جوہر کو جو اپنی باغیانہ سرکشی سے توبہ کر کے حلقۂ خدمت ہو گیا تھا، صلابت خاں کا خطاب دے ایک بڑے لشکر کے ساتھ روانہ کیا گیا مگر یہ سیواجی کی باتوں میں آ گیا اور اس کے ساتھ سازش کر کے قلعہ پنالہ پر جو ایک نہایت مستحکم اور اہم قلعہ تھا قبضہ کر لیا اور علانیہ بغاوت شروع کر دی۔ اب تو بادشاہ خود لشکر لے کر مقابلے کے لئے نکلا اور ایک معرکے میں پنالہ فتح کر لیا۔ سیواجی اور سدی جوہر دونوں فرار ہو گئے۔ چلتے ہوئے بادشاہ نے قلعہ منتو میں پھر جوہر کا مقابلہ کیا اور اس دفعہ بھی شکست دی۔ جوہر زخمی ہوا مگر وہاں سے کسی طرح بچ بچا کر قلعہ رائچور میں پناہ گزیں ہوا۔ بادشاہ نے اس قلعہ کو بھی فتح کر لیا۔ سدی جوہر بھاگتے اور شکست کھاتے ہوئے آخر کار سخت بیمار ہو کر مر گیا۔ بادشاہ تلنگانے کے سرکش زمینداروں کو جو خراج ادا نہیں کر رہے تھے گوشمالی کر کے مظفر و منصور بیجاپور واپس ہوا اور سیواجی سے مصلحت وقت دیکھ کر اس شرط پر ۱۶۶۲ء میں صلح کر لی کہ کوکن اور اس کے قریب کا علاقہ سیواجی کے قبضے میں رہے اور وہ اس سے آگے نہ بڑھے مگر موقع پا کر سیواجی نے پھر لوٹ مار شروع کر دی اور شائستہ خاں مغل سردار سے مقابلہ کر کے اس کو قید کر لیا۔

اورنگ زیب نے یہ خبر سن کر علی عادل شاہ ثانی سے اس کی سرکوبی میں مدد مانگی۔ اور بیجاپور سے خواصی خاں کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا گیا جس نے سیواجی کو سخت شکست دی مگر عین وقت پر سیواجی نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اورنگ زیب کے سپہ سالار جے سنگھ کو اپنا دوست بنا لیا اور یہ وعدہ کر کے اپنے قبضے کے اکثر قلعوں کی کنجیاں جے سنگھ کو دے دیں کہ میں آپ کی مدد کر کے عادل شاہی ریاست کا خاتمہ کر ڈالتا ہوں اور اس طرح یہ سارا ملک اورنگ زیب کی حکومت میں آ جائے گا۔ علی عادل شاہ ثانی کو اس کی اطلاع ملنے پر مجبوراً جے سنگھ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دونوں میں مقابلے ہوئے اور ہر دفعہ جے سنگھ نے شکست کھائی آخر کار ۱۶۶۶ء میں دہلی کو واپس بھاگا۔ سیواجی بھی اورنگ زیب کے دربار میں پہنچا اور چندے وہاں رہ کر پھر دکن آیا اور وہی لوٹ مار شروع کر دی۔ کئی قلعے جو مغلوں کے قبضے میں آ گئے تھے سیواجی نے چھین لیے اور اپنی جگہ مستحکم ہو کر علی عادل شاہ ثانی کو ستانا شروع کیا۔ ادھر جے سنگھ وغیرہ کے ساتھ مسلسل جنگوں کی وجہ سے خزانہ خالی ہو گیا تھا اور سلطنت مغلیہ کا خراج ادا نہ ہونے سے مغلیہ لشکر بار بار چڑھائی کر بیٹھتا تھا اس لئے علی عادل شاہ ثانی نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ اورنگ زیب اور سیواجی دونوں سے مصالحت کر لی جائے۔

یہ صلح محض عارضی تھی اورنگ زیب اور سیواجی دونوں ریاست بیجاپور کو اپنے قبضہ و تصرف میں لانے کی آرزو دل میں لئے ہوئے تھے۔ ابھی اس صلح کو کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ یکایک علی عادل شاہ ثانی بدقسمتی سے فالج میں مبتلا ہو کر معذور و مجبور ہو گیا۔ حالات بگڑ رہے تھے، امرا کے آپس میں عداوت پھیلی ہوئی تھی۔ مصلحت وقت کے تحت اپنے کم سن بیٹے سکندر عادل شاہ کو تخت نشین کر کے دارالسلطنت کے کام خواصی خاں کے سپرد کئے اور خود پلنگ پر لیٹے لیٹے صلاح و مشورہ دینا مناسب سمجھا مغلوں کی روک تھام کے لئے عبدالمحمد کو شاہ درگ (نل درگ) گلبرگہ اور ساگر کے علاقے کا صوبہ دار بنایا اور عبدالکریم اور بہلول خاں کو مرج اور پنالہ کے قلعوں پر متعین کر کے سیواجی کی دراز دستیوں کا بندوبست کیا۔ اسی حالت میں وہ ۱۰۸۳ھ (م ۱۶۷۲ء) میں (۳۵) برس کی جوانی میں سولہ سال حکومت کر کے راہی ملک عدم ہوا۔ اس نے بیجاپور میں اپنی زندگی میں ہی اپنے لئے ایک بہت ہی عالی شان مقبرے کی تعمیر شروع کی تھی۔ ابھی اس کی تعمیر مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اسی میں اس کو دفن کیا گیا۔ یہیں اس کی بیوی اور کئی عزیز اور بھی دفن ہیں اور آج بھی یہ ناتمام مقبرہ اس کے عالی شان تعمیری حوصلوں کی ایک عبرت ناک تصویر پیش کر رہا ہے۔

علی عادل شاہ ثانی بڑا بہادر اور شجیع تھا ۔ اس نے کئی بڑے بڑے معرکے خود فتح کئے ۔ اس کو شعر و شاعری سے خاص لگاؤ تھا ۔ خود بھی شاعر تھا اس کے عہد میں اُردو زبان کو بہت ترقی ہوئی ۔ وہ اردو شاعروں کا بڑا سرپرست تھا ، ملا نصرتی جو علی نامہ اور دیگر مثنویوں کا مصنف ہے اسی کے دربار کا متوسل تھا اس کے عہد کی عمارات میں علاوہ ناتمام مقبرے کے حسینی محل اور کئی مسجدیں تعمیر ہوئیں ۔ اس نے دو عظیم الشان محلات ، علی محل اور عرش محل کے نام سے بنانے شروع کئے تھے مگر یہ ناتمام رہ گئے یہ عادل شاہی خاندان کا آخری با اقتدار بادشاہ تھا اس کے بعد اس کے کمسن بیٹے سکندر کو اورنگ زیب نے قید کرلیا اور بیجا پور کی ریاست کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا ۔

## سکندر عادل شاہ ۔ ۱۶۷۲ء ۔ ۱۶۸۶ء

علی عادل شاہ ثانی کے انتقال پر خواص خاں نے باضابطہ طور پر پانچ سال کے کمسن شہزادے کو سکندر عادل شاہ کے نام سے تخت پر بٹھایا اور خود بطور متولی کے کاروبار ریاست انجام دینے لگا ۔ بادشاہ کی کمسنی امرا کی نااتفاقی اور غداری سے فائدہ اٹھا کر ریاست کے دوا ں دشمن مغل اور مرہٹے من مانے لوٹ مار اور جنگ و جدل کرنے لگے ۔ سیواجی نے غیر معمولی طاقت حاصل کرلی پنالہ فتح کرلیا ، مغلوں کا لشکر بھی حملہ آور ہوا ۔ خواص خاں نے مغلوں سے سازش کرلی اور سکندر کی بہن شہربانو بیگم کی شادی شہزادہ محمد اعظم سے قرار دے کر ایک بڑے پیشکش کے ساتھ اورنگ زیب سے صلح کرلی مگر یہ صلح کبھی پائدار ثابت نہ ہوئی ۔

خواص خاں ، سدی مسعود خاں ، بہلول خاں ، سید مخدوم ، شرزہ خاں اپنی ناعاقبت اندیشی اور نمک حرامی سے کبھی اورنگ زیب سے مل جاتے اور کبھی مرہٹوں سے ۔ اسی طرح صلح و جنگ میں اپنی قوتیں صرف کرتے رہے ۔ اسی عرصے میں سیواجی فوت ہوگیا مگر اس کے بیٹے سنبھاجی اور دوسرے مرہٹہ سرداروں نے اپنی وہی روش جاری رکھی ، وہ ادھر عادل شاہیوں کو تنگ کرتے اور ادھر مغلوں کو الگ دق کرتے ۔ بالآخر اورنگ زیب نے بیجاپور کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا تہیہ کرکے اولاً ایک فرمان بھیجا جس میں متعدد سخت شرائط درج تھیں ۔ سکندر عادل شاہ کے مشیروں نے اس کا جواب اس طرح مرتب کیا جس سے اورنگ زیب کی شرائط کی تکمیل نہیں ہوتی تھی ۔ اورنگ زیب نے ایک بڑی فوج کے ساتھ ۱۰۹۷ھ (۱۶۸۶ء) میں بیجاپور پر چڑھائی کی اور شہر فتح کرکے سکندر کو قید کرلیا اور بیجاپور کی اینٹ سے اینٹ بجادی ۔ بدقسمت سکندر پانچ سال کی عمر میں بادشاہ ہوا ، چودہ سال حکومت کی اور چودہ سال اورنگ زیب کی قید میں رہ کر بالآخر ۱۱۱۱ھ میں وفات پائی ۔

**سید محمد**

بیجاپور کے سپہ سالار



افضل خاں



شرزہ خاں

# عادل شاہی امراء

## افضل خاں

افضل خاں بیجاپور کے مشہور سپہ سالاروں میں تھا۔ اس کا نام عبداللہ خاں تھا۔ سلطان محمد عادل شاہ کے زمانے میں اس نے متعدد معرکوں میں حصہ لیا اور ملک کی بڑی شائستہ خدمات انجام دیں جس پر اس کو افضل خاں کا خطاب عطا کیا گیا۔ سلطان محمد عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا نوجوان فرزند علی عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا تو اس کے مراتب و اعزاز میں اور اضافہ کیا گیا اور یہ خان محمد خاں کے ساتھ ایک بڑے لشکر کا سپہ سالار بنا کر اورنگ زیب کے مقابلے کے لئے بھیجا گیا اورنگ زیب اس عرصے میں بیدر اور کلیانی کے قلعے فتح کر چکا تھا اور بیجاپور کا محاصرہ کر لیا مگر شاہ جہاں کی علالت کی خبر پاکر محاصرہ برخاست کر کے دہلی کا رخ کیا۔ جب وہ سرحد سے گزر رہا تھا تو خان محمد نے بطور خود اس کے لشکر کو چلے جانے کا موقع دیا اور اس طرح ایک بے نظیر موقع چھوڑ دیا۔ افضل خاں اس پر بہت ناراض ہوا۔ جب بادشاہ کو اس کی رپورٹ ملی تو خان محمد کو واپس طلب کیا مگر وہ راستے ہی میں اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔

خان محمد کے بعد افضل خاں ہی سب سے بڑا سپہ سالار تھا۔ بادشاہ نے اس کو سیواجی کے مقابلے میں روانہ کیا جس نے کوکن کے علاقے میں سخت طوفان مچا رکھا تھا۔ تجاپور اور پھنڈارپور سے گزر کر افضل خاں پرتاب گڑھ پہنچا۔ سیواجی نے اس کی آمد کی خبر سن کر اپنی فطری چالاکی سے بجائے مقابلے کے صلح و اطاعت کیشی کی چال چلی۔ افضل خاں کے سفیر کرشناجی کے ساتھ اپنے سفیر گوپی ناتھ کو بھیج کر کے قول و قرار کیا کہ افضل خاں سے تنہائی میں مل کر معذرت کرنا اور سر اطاعت خم کرنا چاہتا ہے۔ افضل خاں اس کے دھوکے میں آگیا اور جب تنہائی میں یہ دونوں ملے تو سیواجی نے آستین میں چھپے ہوئے ہتیار سے فوراً اس کا کام تمام کر دیا۔ افضل خاں کے قتل ہوتے ہی سیواجی کی فوج کے حوصلے بڑھ گئے اور عادل شاہی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ سیواجی نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ افضل جوش شجاعت میں اس کی چال کو نہ سمجھا اور اپنی جان گنوائی۔ سیواجی کے ایک ساتھی نے اس کا سر کاٹ لیا اور سیواجی کے پاس لے جا کر انعام پایا۔ علی عادل شاہ ثانی کو افضل خاں کی موت سے بڑا نقصان پہنچا اور مرہٹوں کی طاقت ہمیشہ کے لئے بڑھ گئی کیونکہ اس کے بعد علی عادل شاہ ثانی نے جن لوگوں کو سیواجی کے مقابلے کے لئے بھیجا وہ یا تو نمک حرام نکلے یا سیواجی نے ان کو اپنے مکر و فریب سے ناکام کر دیا۔ بالآخر خود بادشاہ کو اس سے مقابلہ کر کے شکست دینی پڑی مگر یہ شکست بھی سیواجی کو ختم نہ کر سکی۔

## شرزہ خاں

شرزہ خاں علی عادل شاہ ثانی کے ان نامور سپہ سالاروں میں تھا جنھوں نے اورنگ زیب اعظم کے جرار لشکروں جے سنگھ اور دیگر سرداران مغلیہ سے بڑے معرکۃ الآرا مقابلے کئے اور ہمیشہ مظفر و منصور رہا۔ اس کا نام سید الیاس تھا اس نے شگل بیڑھ اور بیجاپور کے قریب جے سنگھ اور اس کے مددگار سردار سرفراز خاں اور صلابت خاں کو بڑی بڑی شکستیں دیں اور آخر کار مغلوں کو پیچھے ہٹنے اور میدان جنگ چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی موت عجیب و غریب طریقے پر واقع ہوی۔ مغلوں کو شکست دے کر ابھی یہ واپس نہیں ہوا تھا۔ راستے ہی میں تھا اور مغلوں کے اکے دکے حملے ہو رہے تھے۔ اتفاقاً ایک دن ایک چھوٹی سی ٹکڑی نے اس کے کم سن لڑکے کو گھیر لیا۔ بیٹے کے پکارنے پر شرزہ خاں اکیلا لپکا اور آناً فاناً دشمن کو مار بھگایا۔ باپ بیٹے واپس ہو رہے تھے کہ یکایک گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ شرزہ خاں زمین پر آرہا اور گرتے ہی فوت ہو گیا۔ جب لشکر میں اس کی مرگ مفاجات کی خبر پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا۔ بادشاہ کو ناقابل بیان رنج ہوا۔ اس کے دونوں بیٹوں

سید مخدوم و سید حبیب کو ان کے باپ کی شائستہ خدمات کے صلے میں منزہ خاں خطابوں سے سرفراز کیا اور ملازم رکھ لیا۔

سید محمد

## ہاشمی بیجاپوری

ہاشمی، علی عادل شاہ ثانی اور نصرتی کا ہم عصر تھا۔ شاہ ہاشم بیجاپوری کا مرید خاص تھا اسی مناسبت سے ہاشمی تخلص رکھا۔ شاہ ہاشم اور ملا ہاشمی دونوں کی تصویریں اس مضمون کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں۔ وہ مادرزاد اندھا تھا لیکن شاعری سے فطری لگاؤ رکھتا تھا۔ دکن میں ریختی زبان کی ایجاد کا سہرا ہاشمی کے سر ہے ایک دیوان ریختی کی غزلیات کا مرتب کیا اور ایک مثنوی یوسف زلیخا "احسن القصص" کے نام سے سنہ ۱۰۹۹ھ میں لکھی۔ ہاشمی کی زندگی کے حالات کسی تذکرے میں نہیں ملتے البتہ اس کے کلام سے اندرونی شہادتیں کچھ ملتی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ برہان پور کا باشندہ تھا بیجاپور کے ایک رئیس ذوالفقار خاں کی شہرت سن کر وہاں آیا اور اپنے ممدوح سے قصائد کے بدلے بیش گراں بہا انعام حاصل کئے۔ دو تین قصیدے ذوالفقار خاں کی مدح میں ہاشمی نے لکھے ہیں۔ ابھی ہاشمی کے متعلق کافی معلومات فراہم نہ ہو سکے۔ اس کا دیوان ریختی اور مثنوی یوسف زلیخا جو زیر طبع ہیں ان کے مقدمہ کی تکمیل اب ہماری کوشش ہے کہ جس قدر ممکن ہو سکے اس کی زندگی کے متعلق معلومات فراہم کریں۔ علاوہ دیوان اور مثنوی کے ہاشمی بیجاپور کا اعلیٰ پایہ مرثیہ نگار ہے اس کے کئی مرثیے دستیاب ہوئے ہیں جن سے اس کی قادر الکلامی اور وسیع النظری کا ثبوت ملتا ہے۔ یہاں ہم دیوان اور مثنوی سے چند شعر نقل کرتے ہیں:-

### غزل ریختی

جھانکو نکو سو لچھن تج دل چھوڑ تو نے گا — تجھ خیل میں تمنا چپ سب جگ میں شور ہوئے گا
تجھ گن بھری سندر کی عالم میں ہانک ہوی ہے — جھانکیگی تس اوپر تو شہرت بھی زور ہوئے گا
انکھیں تو ہور دستیاں دل میں تو بھید کچھ ہے — باتاں جی ہور کچھ ہیں مقصد بھی ہور ہوئے گا
ہے حسن دہن تمہارا رکھنا جتن تمہیں دہن — نیں تو یو دہن چیرانے کوئی سا ہو چور ہوئے گا (دیوان ریختی)

### عشق

اگر عشق نیں ہے تو چندر کوں نور — تو کیا واسطے نت یو تپتا ہے سور
اگر عشق نیں ہے تو دریا دین آب — پلاتا ہے بادل کوں کیا بے حساب
اگر عشق نیں ہو تو کی دہر تری — نوی رت میں کرتی ہے کہوت پری
اگر عشق نیں ہے تو کی یو بھنور — پھرے باس لینا ہر اک گل اوپر
اگر عشق نیں ہے تو کی یو فقیر — فقیر ہو کے غربت لئے اپے سیر

مجازی عشق راستہ ہر ٹھور ہے
حقیقی و لے عشق کچھ ہور ہے (یوسف زلیخا)

میر سعادت علی رضوی



ملا هاشمی بیجاپوری



شاه هاشم علوی بیجاپوری

# نظام شاہی خاندان

## احمد نظام الملک ۸۹۵ھ تا ۹۱۴ھ

بہمنی سلطنت کا جب شیرازہ بکھر گیا تو سب سے پہلے احمد نظام الملک نے بغاوت کی۔ احمد نظام الملک دکن کے برہمن نژاد امیر حسن بحری کا لڑکا کہلاتا ہے جس کو بعد کے مورخ ایک عجیب و غریب حکایت کے ذریعہ محمد شاہ بہمنی کا لڑکا تسلیم کرانے کی کوشش کرتے ہیں یہ بہمنی سلطنت کے شمال مغربی حصہ کا مالک بنا اور اپنا صدر مقام جنیر قرار دیا لیکن بعد میں ایک شہر آباد کر کے احمد نگر اس کا نام رکھا۔ اور اسی نام سے اس کی سلطنت موسوم ہوئی۔ احمد نظام الملک نے ۸۹۵ھ میں اپنی آزاد اور خود مختار حکومت کا اعلان کیا اور ۲۲ سال پر شوکت حکومت کرنے کے بعد ۹۱۴ھ میں انتقال کیا۔

## برہان نظام شاہ ۹۱۴ھ تا ۹۶۱ھ

باپ کے بعد تخت نشین ہوا۔ اور اپنی سلطنت کی تمدنی ترقی کا باعث بنا اس دور میں نظام شاہی حکومت کی وسعت اور تنظیم کا کام ہوا اور اسی بادشاہ کی وجہ سے بہادر شاہ والی گجرات کا دیا ہوا لقب نظام شاہی اس خانوادہ کا لقب ہو گیا۔

## سلطان حسین نظام شاہ اول ۹۶۱ھ تا ۹۷۲ھ

باپ کے مرنے کے بعد سریر آرائے حکومت ہوا۔ یہ بہت بڑا سپاہی اور مدبر تھا۔ اس کے زمانے میں سلاطین دکن میں اتحاد ہوا اور اسی کی سرکردگی اور کوشش سے تالی کوٹ میں رام راج کو شکست ہوئی اور نہایت شان اور جبروت کی حکومت کے بعد ۹۷۲ھ میں انتقال کیا۔

## مرتضیٰ نظام شاہ۔ ۹۷۲ھ تا ۹۹۶ھ

یہ صغیر سنی میں بادشاہ ہوا۔ اور اپنی مدبر ماں خونزہ ہمایوں کے تحت حکومت کرتا رہا اور ۹۷۷ھ میں ماں کو قید کر کے برسر اقتدار آیا۔ یہ بادشاہ چاند بی بی کا بھائی تھا اس کے دور میں سلطنت کے ابتدائی آثار تنزل شروع ہو گئے تھے ۹۹۶ھ میں کثرت عیاشی کی وجہ سے دیوانہ ہو گیا اور اس کے بیٹے میراں حسین نے اس کو حمام میں بند کر دیا۔

## میراں حسین نظام شاہ۔ ۹۹۷ھ

باپ کو قید کر کے تخت پر بیٹھا اور وزیر مرزا خاں کے ہاتھ مارا گیا۔ اس نے صرف نو مہینے حکومت کی۔

## اسماعیل نظام شاہ۔ ۹۹۷ھ تا ۹۹۹ھ

یہ امرائے گردلی کے ذریعے تخت پر آیا۔ اور اپنے باپ برہان نظام شاہ کے ہاتھوں تخت سے اتار دیا گیا۔

## برہان نظام شاہ ثانی۔ ۹۹۹ھ تا ۱۰۰۳ھ

مغلوں کی طاقت کے ذریعے بیٹے کو معزول کر کے تخت حاصل کیا۔ اور ۱۰۰۳ھ میں عادل شاہیوں سے شکست کھا کر اسی صدمہ میں انتقال کیا۔ اور اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین بڑے بیٹے اسمٰعیل کے بجائے جو مہدوی تھا اپنے چھوٹے بیٹے کو جو اسماعیلیہ مذہب کا پیرو تھا مقرر کیا۔

## ابراہیم نظام شاہ ۔ ۱۰۰۳ھ

باپ کے بعد بر سر حکومت آیا اور ایک ہی سال میں عادل شاہیوں سے لڑتا ہوا ایک سپاہی کے ہاتھ مارا گیا ۔

## احمد نظام شاہ

یہہ شخص ایک دعویدار سلطنت تھا اور بعض امراء کی کوشش سے تخت نشین ہوا لیکن بعد میں چاند بی بی کے تدبر سے اس کو تخت سے ہٹایا گیا اور بہادر نظام شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا ۔

## بہادر نظام شاہ ۱۰۰۴ھ تا ۱۰۰۹ھ

یہہ طوائف الملوکی کا دور تھا ۔ وزیر اعظم اخلاص خاں حبشی اور چاند بی بی کے ذریعہ برسر اقتدار آیا یہہ وہ دور تھا جس میں چاند بی بی نے مغلوں سے غیر معمولی معرکے کئے ۔

## مرتضی نظام شاہ دوم ۱۰۰۹ھ تا ۱۰۳۵ھ

بہادر نظام شاہ کے بعد طوائف الملوکی پٹ گئی اور امراء نے مرتضی نظام شاہ کو تخت پر بٹھایا اِس دور کو ملک عنبر کا دور کہا جا سکتا ہے مغلوں کی بڑھتی ہوی قوت ملک عنبر کی زندگی تک نظام شاہی سلطنت پر چھا نہ سکی ۔ ملک عنبر کے بعد کوئی نظام شاہی حکومت کو بچانے والا نہ تھا

## برہان نظام شاہ سوم ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۴۰ھ

برہان نظام شاہ نے باپ کے بعد سلطنت حاصل کی اور ۱۰۴۰ھ میں انتقال کیا یہہ دور تنزل تھا ۔

## حسین نظام شاہ سوم

یہہ احمد نگر کا آخری تاجدار ہے ۔ اس کے زمانے میں مغلوں نے احمد نگر پر قبضہ کیا اور شاہ جہاں نے اس کو گوالیار میں قید کر دیا

## مرتضی نظام شاہ سوم ۱۰۴۲ھ تا ۱۰۴۵ھ

یہہ بادشاہ نظام شاہی سلطنت کے بعد شاہ جی مرہٹے کے ذریعے تین سال تک شاہ گڑھ پر حکومت کرتا رہا اور تین سال کے بعد اپنے خاندان کا خاتم بنا ۔

# چاند بی بی

دکن کی نامور سلطانہ چاند بی بی حسین نظام شاہ اور خونزہ ہمایوں بیگم کی بیٹی تھی اور اس طرح باپ کی طرف سے نظام شاہی تدبر اور ماں کی طرف سے ترکی تہور اور بے جگری ورثے میں پائی تھی ۔ یہہ ملکہ ۹۵۵ھ میں احمد نگر میں پیدا ہوی آنکھ کھولتے ہی اس نے تلوار کی جھنکار سنی بہمنی سلطنت کے مختلف شہ پارے آپس میں دست و گریباں تھے اور اس نفاق سے فائدہ اٹھا کر رام راج کے تخت وجیانگر کی شہنشاہیت مسلم راج اور مسلم سلطنتوں پر چھائی جا رہی تھی چودہ برس کی عمر میں چاند سلطانہ اس شطرنج کا مہرہ بنی اور علی عادل شاہ والی بیجاپور کے نکاح میں آکر دکنی مسلم اتحاد کا باعث بنی کوئی تعجب نہیں کہ تالی کوٹ کی لڑائی میں یہہ شاہی دلہن میدان کارزار میں ہو اور مسلمانوں کے ناموس کا مرکز بنی رہی ہو ۔ یہہ چاند سلطانہ کا پہلا دور ہے ۔

چاند سلطانہ کی زندگی کا دوسرا دور ۹۷۰ھ سے شروع ہوتا ہے ۔ جب کہ وہ دلہن بن کر بیجاپور کے بادشاہ کے دل میں حکمران تھی



حسن نظام الملک بحری
بانی سلطنت نظام شاہیہ



چاند سلطانہ
(ملکۂ علی عادل شاہ اول)

علی عادل شاہ خود بڑا بادشاہ تھا اس کی زندگی تک چاند بی بی کو صرف نظری تجربہ سیاست کا اور سلطنت کا حاصل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ۹۸۸ھ میں چاند سلطانہ کا شوہر علی عادل شاہ بیجاپور کا پانچواں زبردست فرماں روا بریدی غلام کے ہاتھوں شہید ہوا اب چاند سلطانہ بیجاپور میں وہی تدبر اور تنظیمی قوت کا اظہار کرنے لگی جو تاریخ انگلستان میں صرف ملکہ ایلزبتھ کو حاصل تھا، نیا بادشاہ ابراہیم عادل شاہ نو برس کا تھا اور سلطنت چو طرف سے اندرونی سازش اور بیرونی غنیموں سے گھری ہوئی تھی امرائے سلطنت کی باہمی رقابت اور حکمت کے ذریعے اس مدبر خاتون نے ابراہیم عادل شاہ کو نہ صرف بچایا بلکہ اس کو تربیت کے ذریعے بیجاپور کا سب سے بڑا فرماں روا بننے کے قابل رکھا۔ اس طرح ۹۷۱ھ سے ۹۹۲ھ تک چاند بی بی بیجاپور کے لئے فرشتۂ رحمت رہی کوئی مورخ جو چاند بی بی کی حقیقی سوانح عمری لکھنے بیٹھے اس دور کو اس کا دور تدبر قرار دے گا۔

جس طرح چاند بی بی بیجاپور خود کی شادی کی وجہہ سے آئی تھی اسی طرح ابراہیم عادل شاہ کی بہن خدیجہ سلطانہ کے ساتھ چاند بی بی کے بھتیجے میراں حسین کو بیاہی گئی تھی پھر احمد نگر واپس ہوئی۔ اس کو پہلے سے بھی زیادہ زبردست سیاسی خدمات انجام دینے پڑے احمد نگر مسلم اقتدار دکن کا سب سے اہم مرکز تھا۔ مغل اس کو کسی نہ کسی طرح اپنے علاقے میں شامل کرنے کی تاک میں لگے ہوئے تھے۔ اور یہ شخص جانتا تھا کہ احمد نگر کی تسخیر شاہان دکن کی تسخیر ہے۔ مرتضیٰ نظام شاہ کے انتقال کے بعد پھر طوائف الملوکی مچی میراں حسین کے بعد اسمٰعیل تخت پر بیٹھا جس کو اس کے باپ برہان نظام شاہ دوم نے مغلوں کے اثر سے بے دخل کر دیا۔ اور اس کے چند سال بعد ابراہیم نظام شاہ اور پھر بہادر نظام شاہ یکے بعد دیگرے آئے۔ یہ دور احمد نگر کے لئے زیست اور موت کا دور تھا اور چاند بی بی کی زندگی کا حقیقی کارنامہ اسی دور سے متعلق ہے جو کام بیجاپور میں اپنے شوہر اور اس کی اولاد کے لئے اس نے کیا وہی کام اپنے خاندان کے لئے اسے کرنا تھا لیکن یہاں پر اس کے لئے اندرونی فتنے زیادہ تھے۔ اور مغلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے سابقہ تھا۔ اس دور میں چاند بی بی نے بادشاہ گری کی، بہادر نظام شاہ کے لئے وہ سب کچھ کیا جو بڑے سے بڑا مدبر اور سپہ سالار کر سکتا تھا۔ اندرونی فتنہ کو رفع کیا اور مغلوں کو تادم زیست اپنے آبا و اجداد کی سلطنت سے دور رکھا۔ اکبری لشکر نے مراد کی سرکردگی میں ۱۰۰۳ھ میں احمد نگر پر یلغار کی چاند بی بی نے اتنی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا کہ مغلوں کو مجبوراً صلح کر لینی پڑی۔ یہی وہ معرکہ تھا جس میں سرنگ کے ذریعے پچاس گز قلعہ کی دیوار اڑا دی گئی تھی۔ اور چاند بی بی نے مغلیہ دل بادل کو تلوار کی نوک سے اس وقت تک روک رکھا تھا جب تک دیوار از سر نو تیار نہ ہوگئی تاریخ حرب میں یہ کارنامہ ہمیشہ صفحۂ اول میں رہے گا۔ اس کے بعد مغلوں نے دوسرا حملہ شہزادہ دانیال کی سرکردگی میں کیا۔ اور چار مہینے کے محاصرہ کے بعد چاند بی بی کی مردہ لاش اور دکن کا ایک ویران شہر اس کے ہاتھ آیا ۱۰۰۹ھ میں یہ بہادر سلطانہ ناموس کی حفاظت کے لئے تیزاب کے کنوئیں میں مستور ہوگئی۔

# ملک عنبر

ملک عنبر دکن کا مشہور سپہ سالار، مدبر اور بادشاہ گر حبشی ۹۵۵ھ میں پیدا ہوا مکہ میں ابتدائی تربیت پائی اور دکن کے بازار میں آکر فروخت ہو گیا احمد نگر میں چنگیز خاں کے غلام کی حیثیت سے تربیت حاصل کی اور آقا نے غلام کو اولاد کی طرح پالا آقا کی وفات کے بعد ۹۸۲ھ میں ملک عنبر گولکنڈہ میں لشکر شاہی کا ملازم ہوا پھر بیجاپور جا کر ابراہیم عادل شاہ کے ملازمان میں شریک ہو کر ایک ممتاز عہدہ پر فائز اور ملک عنبر کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ اس نے عرب نوایتوں اور حبشیوں کی فوج جمع کرنا شروع کیا اور اس کی شرفا نوازی اور بہادر پروری کی دھوم مچ گئی لیکن بیجاپور کے امراء کے حسد اور حوصلہ شکن فضا سے بیزار ہو کر بیجاپور بھی ۱۰۰۰ھ میں چھوڑنا پڑا۔ کچھ مدت ملک عنبر کی عسرت و تنگدستی میں گزری لیکن اس حالت میں بھی فوج فراہم کرتا رہا اور احمد نگر میں ملازمت اختیار کر لی حسین نظام شاہ کی فوج میں اک جماعت حبشی کے افسانہ نے مغلوں کے مقابلے میں ایک قوت پیدا کر دی تھی۔

ملک عنبر ایک ایسے دور میں سیف و دماغ کے جوہر دکھانے کے لئے دنیا میں آیا جب کہ دکن تباہ ہو رہا تھا بہمنی شہنشاہیت کے شیرازے آپس میں دست و گریباں تھے اور مغلوں کا بڑھتا ہوا اقبال ان پر عقاب کی طرح چھا رہا تھا احمد نگر فتح دکن کی کنجی تھا جس پر مغلوں کی آنکھ لگی ہوئی تھی۔ ملک عنبر کی جوانی بیجاپور و گولکنڈہ اور احمد نگر کے عروج میں شروع ہوئی اور دکن کی سلطنتوں کے زوال کے ساتھ ساتھ ملک عنبر کی حوصلہ مندیوں نے عروج حاصل کیا اور کم از کم اپنی دانشمندی کی وجہ سے تیس سال تک دکن کو اغیار کی غداری سے بچائے رکھا اس طرح تمام عمر ایک مجاہد کی زندگی بسر کر کے ۱۴ شعبان ۱۰۳۵ھ کو بخار کی وجہ سے اسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔

ملک عنبر میانہ قد حبشی رنگ اور گٹھیلے جسم کا آدمی تھا مغلوں کا لباس اور دکنی دل رکھتا تھا۔ حلیم الطبع، منکسر المزاج وفا شعار ایسا کہ آخری دم تک باوجود بے تاج کا بادشاہ ہونے کے مرتضیٰ نظام شاہ کو بادشاہ مانتا رہا۔ اس کے نام و نوال کی دھوم تھی اس کا دربار علاوہ شعراء کے ادیب، علماء و فضلاء اولیاء اور رشیوں کا مامن تھا۔ میدان جنگ میں شیر ژیاں اور میدان تدبر کا شاطر۔ ایک طرف اہل سیف اور دوسری طرف مصلح، ریفارمر اور تعمیر کار تھا ملک عنبر کے احسانات میں سے سب سے بڑا احسان وہ ہے جو اس نے مرہٹہ قوم پر کیا آج کل کے مرہٹہ مورخ تعصب کی وجہ سے اس کو تسلیم نہ کریں لیکن خاص عربی طرز جنگ اسی کے دم سے ایک طرز نو بن گئی مرہٹوں کو بحیثیت قوم سپاہی بنانے کا کام ملک عنبر نے انجام دیا۔ اسی نے صدیوں کے غلام اور بے بس کسانوں کو نہ صرف مرد میدان بنایا بلکہ صاحب تاج اور سلطنت کر دکھایا۔ یہ جب تک ملک عنبر کی بتائی ہوئی راہ پر گامزن تھے اقبال ان کے ساتھ تھا جس روز انھوں نے برگیگیری چھوڑ کر میدان سنبھالا تو ان کو پانی پت کی تیسری جنگ کا روز بد دیکھنا پڑا۔

ملک عنبر کا دوسرا کارنامہ مالی انتظام تھا اس مدبر سپاہی نے باوجود تمام عمر میدان جنگ میں بسر کرنے کے اپنی رعایا کی خوشحالی کے لئے بہترین مالی انتظام کیا مالگزاری کی تنظیم زمینات کا بند و بست اور محاصل کے خوش ستانی نے رعایا کو مطمئن اور فارغ البال کر دیا تھا اس نے انتظام سلطنت کے لئے ملکی زبان کو دفاتر کے لئے رائج کیا

بحیثیت تعمیر کار اس کی ہستی لافانی ہے۔ کھڑکی ایک غیر آباد اور پہاڑی قریہ کو اس نے بارونق اور متمدن شہر بنا دیا گو اس شہر کو ایک مرتبہ جہانگیر کی فوجوں نے زمین کے برابر بنا دیا تھا تاہم ملک عنبر نے چند دنوں میں اس ویرانہ کو گلزار میں تبدیل کر دیا

سید محمد اکبر وفاقانی

ک عنبر—سپہ سالار احمدنگر

ملک عنبر کا مقبرہ

# گولکنڈے کا نیا قلعہ

(قلعہ گولکنڈہ کے پہلو میں سلطان عبداللہ قطب شاہ
نے جو نیا قلعہ بنایا تھا اس کی ایک جھلک)

اب بھی رونق پا رہا ہوں تیرے ویرانہ میں میں — سن رہا ہوں کچھ سکوتِ شب کے افسانہ میں میں
موجزن ہے تشنگی [illegible] میں پانی کیلئے — [illegible] چھپا رہا ہے، درفشاں کیلئے
ہیں نقوشِ جستجو تیرے شکستہ بام و در — [illegible] کھو جاتی ہے دل کی دھڑکنیں لے کر نظر
تیرے سائے میں ہے اب تک بھی جھلک تلوار کی — تیرے خود رو دشت میں فرحت سی ہے گلزار کی
تیرا ہر پربت ہے اپنی عظمتوں کا راز داں — تیری خاموشی کے دامن پر ہیں نغموں کے نشاں
نوحہ خواں ہے پرسکوں تالاب کی سرسبز دوب — شام کو جس کے کنارے مہر ہوتا ہے غروب
تو خموشی میں ہے کیفیت کہاں فریاد میں؟ — [illegible] مسجد وہ ہے خدا کا گھر خدا کی یاد میں
عکس ماضی دیکھتا ہوں میں تری تصویر میں — حسن کاری کا تخیل ہے تری تعمیر میں
پیکرِ مردہ میں تیرے زندگی کی آن ہے — اب بھی محلوں کے کھنڈر کی جاودانی شان ہے

تھی تری بیداری تقدیر سونے کیلئے
تو یوں ہی چھوڑا گیا برباد ہونے کیلئے

آج کر دوں گا نمایاں بے حسی کے داغ کو — اپنے دل کے خون سے سینچوں گا تیرے باغ کو
آج میں تعبیر مانگوں گا فسونِ خواب سے — تیرے حوضوں کو بھروں گا آنسوؤں کی آب سے
ڈوب جائیگی اثر میں آج آہِ آتشیں — ثبت کر دوں گا تری مسجد میں میں نقشِ جبیں

تیرے کھنڈروں میں سکونِ زندگانی پاؤں گا
تیری خاموشی میں ماضی کے ترانے گاؤں گا

میکش

# گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت

قطب شاہی خاندان کی حکومت سرزمین حیدر آباد پر تقریباً دو سو سال یعنی ۹۱۸ھ سے ۱۰۹۸ھ تک رہی اور اس عرصہ میں ان حکمرانوں نے یہاں تہذیب و تمدن، تمول و ثروت، علم و فضل، اور شعر و سخن کی ایک ایسی فضا پیدا کردی جس پر دکن کی تاریخ بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔ ان بادشاہوں نے شیعہ و سنی اور مسلمان و ہندو غرض ہر مذہب و ملت کے باشندوں میں ایک مشترک کلچر کے پیدا کرنے میں یہاں تک کامیابی حاصل کی تھی کہ دوسروں کے لئے اس ملک کے رہنے والوں کا باہمی اتحاد اور یگانگت باعثِ رشک تھی۔ اسی موانست و مفاہمت کی خاطر انھوں نے اردو کی سرپرستی کی اور اس زبان میں ایسی ایسی بلند پایہ کتابیں لکھیں اور لکھوائیں جن پر اردو ہمیشہ نازاں رہے گی۔

یوں تو قطب شاہی سلطنت کے بانی سلطان قلی کا تعلق اس سرزمین سے ۸۹۹ھ میں پیدا ہوچکا تھا جب وہ تلنگانہ کا صوبہ دار بنایا گیا تھا لیکن جب سنہ ۹۱۸ھ میں گولکنڈہ اور اس کے اطراف و اکناف کا علاقہ اس کو بطور جاگیر کے دیا گیا تو اس نے اس کا نام محمد نگر رکھا اور قدیم قلعہ کو مستحکم کرکے اس میں متعدد محلات تعمیر کئے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اپنے علاقہ کو وسیع کرنا شروع کیا۔ چنانچہ بیس بائیس سال کے عرصہ میں پانگل، ککمن پوڑ، کوئیل کنڈہ، اور ملگندل وغیرہ اس کے قبضہ میں آگئے۔ سنہ ۹۲۴ھ میں اس نے قلعہ میں بالا حصار کے دامن میں مشہور مسجد صفا بنائی جس میں آخر کار ۹۵۰ھ میں اس کے فرزند یار قلی جمشید کے اشارے سے سلطان قلی قطب شاہ کو ننانوے سال کی عمر میں عصر کی نماز پڑھتے وقت شہید کیا گیا۔ اس نے دوسرے صوبہ داروں کی طرح بہمنی بادشاہ کے خلاف علم بغاوت نہیں بلند کیا بلکہ آخر تک ان کی مدد کرتا رہا اور جب بریدیوں نے بہمنیوں پر پوری طرح قبضہ کرلیا تو مجبوراً سلطان قلی کو بھی اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا پڑا۔

سلطان قلی کو فنِ تعمیر کا خاص ذوق تھا۔ اس نے قدیم قلعہ (موجودہ بالا حصار) کے اطراف ایک عالیشان شہر بنایا۔ اور در اصل وہی اس طرز تعمیر کا بھی بانی ہے جو قطب شاہی کہلاتا ہے اور ایرانی، ہندو، اور پٹھان طرز ہائے تعمیر کے امتزاج سے بنا ہے اس کی وفات کے وقت اس کی سلطنت شمال میں دریائے گوداوری، مشرق میں اڑیسہ اور ساحلِ سمندر اور جنوب میں دریائے کرشنا تک پھیل چکی تھی۔

۲ جمشید قلی قطب شاہ تخت نشین ہوتے ہی اپنی سلطنت کے استحکام و وسعت میں مصروف ہوگیا۔ اگرچہ اس کا سات سال کا مختصر سا عہد حکومت زیادہ تر جنگ و جدل سخت گیریوں اور پریشانیوں میں گذر گیا۔ لیکن اس نے "ارن کمیڑ" احسن آباد اور میدک پر قبضہ کرکے قطب شاہی سلطنت میں اضافہ کیا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ لیکن اس کے عہد میں گولکنڈہ اردو شعر و سخن کا مرکز نہ بن سکا۔ اس کی وفات ۹۵۷ھ پر اس کے کمسن لڑکے سبحان قلی کو تخت نشین کیا گیا لیکن چند ماہ بعد ہی اس کا دوسرا بھائی ابراہیم قلی کوبل کنڈہ کے نایک واڑیوں کی مدد سے قلعہ گولکنڈہ میں داخل ہوا۔ اور اپنے بھائی کے مظالم کی تلافی کرنے میں مصروف ہوگیا۔

۳ سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ کی شخصیت کو دکن کی سیاست میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اسی کے زمانہ میں ۹۷۲ھ میں تالی کوٹہ کی مشہور لڑائی ہوئی جس میں وجیانگر کی عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ اور اس کے ساتھ ہی گولکنڈہ کو مال و دولت اور سیاسی حیثیت سے کافی اہمیت حاصل ہوگئی۔ بعد میں ابراہیم قطب شاہ نے راجمندری، قائم کوڑ اور کھم میٹھ وغیرہ کے علاقے بھی فتح کر لئے۔ اس نے ۹۸۸ھ میں انتقال کیا۔ اس کو بھی اپنے باپ کی طرح تعمیر کا شوق تھا۔ چنانچہ بالا حصار کی سیڑھیوں کی مسجد، موسیٰ ندی کا پہلا پل، حسین ساگر، بدویل کا تالاب، ابراہیم باغ، باغ گلشن، اور قصبہ ابراہیم پٹن اس کی تعمیری یادگاریں ہیں۔ اس کے عہد میں گولکنڈہ اردو زبان کا مرکز بن گیا۔ اور فیروز، محمود، احمد اور وجہی جیسے بلند پایہ شعراء

اسی کی قدردانی اردو کی وجہ سے متعدد بیش بہا کتابیں اس زبان میں تصنیف کر سکے۔

۴ ابراہیم کے بعد اس کا تیسرا لڑکا سلطان محمد قلی تخت نشین ہوا جس نے سنہ ۹۹۹ھ میں اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر بھاگ نگر کی بنا ڈالی۔ اور عالیشان محلات، حمام، مساجد، مدارس اور بازار وغیرہ تعمیر کئے۔ بھاگ نگر کے اطراف و اکناف بیس میل تک باغات بنائے گئے۔ نرکھوڑہ، ابراہیم پٹن، بھونگیر، اور پٹن چیرو اس شہر کے حدود پر واقع تھے۔ سترہ برس کے بعد غالباً اپنی اکلوتی لڑکی شہزادی حیات بخشی بیگم کی شادی کے موقعہ پر بادشاہ نے اس پر فضا بستی بھاگ نگر کا نام حیدر آباد قرار دیا۔

محمد قلی قطب شاہ نے سنہ [illegible]ھ میں سنگر اور ندیال وغیرہ فتح کیا۔ اس کے زمانہ میں گولکنڈہ ہر لحاظ سے معراج کمال کو پہنچ گیا۔ شاہ عباس صفوی کا سفیر اغز لو سلطان اسی عہد میں گولکنڈہ آیا تھا۔ علم و فضل اور شعر و سخن کے لحاظ سے بھی یہ دور دکن کا عہد زرین سمجھا جاتا ہے۔ اسی دور میں اردو نے قطب شاہی سلطنت اور خاص کر گولکنڈہ اور حیدر آباد میں معراج کمال حاصل کیا اور اس سرزمین نے تمدن و معاشرت کے وہ تمام منازل طے کرلئے جو کسی ملک کو متمدن اور شائستہ ثابت کرتے ہیں۔ اسی زمانہ میں گولکنڈہ مختلف اقطاع عالم کے سیاحوں اور علما و فضلا کا مرجع و مامن بھی بن گیا تھا۔

سلطان محمد قلی نے جنگ و جدل سے زیادہ امن و امان، اور ملک کی وسعت سے زیادہ اہل ملک کی خوش حالی اور رعایا کی تعلیمی ترقی پر زور دیا۔ وہ خود بہت بڑا شاعر اور قدردان سخن تھا۔ اس نے تین زبانوں فارسی، اردو اور تلنگی میں اپنے دیوان مرتب کئے تھے۔ اس کا اردو کلام نہایت اعلیٰ پایہ ہے۔ اس کا دربار شاعروں سے معمور تھا۔

حیدر آباد کی اکثر عمارتیں اسی صاحب ذوق بادشاہ کی یادگار ہیں۔ ان میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں:-

چار مینار، چار کمان، چار سو کا حوض، دار الشفا، جامع مسجد، دا د محل، ندی محل، نبات گھاٹ، باغ دلکشا، خداداد محل (جو ہفت منزلہ تھا اور ہر منزل کا نام جدا تھا مثلاً الٰہی محل، محمدی محل، حیدری محل، حسینی محل، حسنی محل، جعفری محل، اور موسوی محل) باغ محمد شاہی، کوہ طور، جنان منزل اور بادشاہی عاشور خانہ وغیرہ۔

۵ محمد قلی قطب شاہ کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان مرزا سلطان محمد قطب شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس کی شادی حیات بخشی بیگم بنت سلطان محمد قلی کے ساتھ سنہ [illegible]ھ میں نہایت تزک و احتشام سے ہوئی تھی۔ اس کا عہد حکومت بھی امن و امان اور خوش حالی میں گذرا۔ اس کے دور میں شہزادہ خرم نے جو بعد میں شاہجہاں کے لقب سے جہانگیر کا جانشین ہوا باپ سے بغاوت کرکے اور اس کی فوجوں سے ہزیمت پاکر قطب شاہی سلطنت میں پناہ لی تھی۔ سلطان محمد نے اس کے ساتھ ہمدردی کی اور ایسے وقت میں اس کی رقمی امداد کی جب کہ وہ بالکل محتاج تھا اور اکثر رفیقوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے چچا کی قدردانی شعر و سخن کو جاری رکھا۔ لیکن وہ شاعر ہونے کے علاوہ عالم و فاضل بھی تھا۔ اس نے شعر و سخن اور علم و فضل کے ساتھ زہد و تقویٰ اور اخلاق و آداب کا بھی خاص خیال رکھا۔ اسی کے عہد میں اس خاندان کی مشہور تاریخ سلطان محمد قطب شاہی لکھی گئی۔ اس کے دور میں بھی دکن کے حکمرانوں کے علاوہ جہانگیر اور شاہ عباس صفوی کے سفرا گولکنڈہ آئے تھے۔ اس کے عہد کے اردو شاعروں میں وجہی کے علاوہ غواصی اور ابن نشاطی کے نام خاص کر قابل ذکر ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ سلطان محمد کو بھی اپنے اجداد کی طرح فن تعمیر سے خاص شغف تھا۔ اس نے قلعہ محمد نگر گولکنڈہ کے مقابل میں حیدرآباد کے مشرقی جانب چھ میل کے فاصلہ پر ایک قلعہ سلطان نگر کی سنہ ۱۰۳۳ھ میں بناڈالی لیکن اس کا بہت جلد انتقال ہو گیا اور وہ قلعہ ناتمام رہا۔ اس کے علاوہ اسی سلطان نے مکہ مسجد، محلہ سلطان شاہی، اور گوشہ محل کی بھی بناڈالی تھی مگر اس کا کوئی کام اس کی زندگی میں تکمیل نہ پا سکا۔ اس کی جوانمرگی نے اس کو ہر طرح حرماں نصیب رکھا۔ اگر وہ چند اور سال زندہ رہ جاتا تو گولکنڈہ کی سلطنت اس قدر جلد زوال پذیر نہ ہونے پاتی۔

۶ سلطان محمد کے بعد اس کا اکلوتا لڑکا عبداللہ مرزا سنہ ۱۰۳۵ھ میں بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور بادشاہ کی یہ کم عمری اور ناتجربہ کاری قطب شاہی سلطنت کی کمزوری کا باعث ہوئی۔ سلطان عبداللہ کی کمزوریوں سے سب سے زیادہ محمد سعید میر جملہ نے فائدہ اٹھایا۔ آخر کار جب بادشاہ نے اس سرکش کا استیصال کرنا چاہا تو اس نے شہزادہ اورنگ زیب کے یہاں پناہ لی اور قطب شاہی سلطنت اور اس کے حکمران کی کمزوریوں سے غنیم کو واقف کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولکنڈہ کی آزادی قائم نہ رہ سکی۔ اور اس کی عظمت و شوکت کا آفتاب غروب ہونے لگا۔

ان سیاسی پریشانیوں کے علاوہ سلطان عبداللہ کے عہد میں حیدرآباد کو ایک تباہ کن قحط اور پھر ایک زبردست طغیانی رود موسیٰ کی وجہ سے بھی سخت صدمے اٹھانے پڑے۔ لیکن ان سب صدموں سے بڑھکر اہل حیدرآباد اس پریشانی اور ذلت سے متاثر ہوئے جو سنہ ۱۰۶۶ھ میں میر جملہ کی وجہ سے اورنگ زیب کے تعرض کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اس وقت مغلوں نے لوٹ مار کے سلسلہ میں حیدرآباد کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور تمام شہر کو تباہ کر کے چھوڑا۔

غرض عبداللہ قطب شاہ کی زندگی پریشانیوں اور کشمکشوں میں گذر گئی۔ وہ آخر دم تک اولاد نرینہ کا متمنی رہا۔ اور اسی یاس و امید میں ایک پوری نصف صدی گذار دی۔ پچاس سال کی طویل حکومت کے بعد سلطان عبداللہ نے سنہ ۱۰۸۳ھ میں انتقال کیا اور دراصل اس کے ساتھ ہی قطب شاہی حکمرانوں کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ وہ بھی اردو زبان کا ایک اچھا شاعر تھا۔ اس کے عہد میں بھی علم و فضل اور شعراء و شاعری کی قدر دانی جاری رہی۔ فارسی کی مشہور فرہنگ برہان قاطع اور اردو کی مشہور کتابیں سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ، پھول بن، اور ماہ پیکر وغیرہ۔ اسی دور کی یادگار ہیں۔

۷ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے بعد اس کا چھوٹا داماد ابوالحسن تاناشاہ تخت نشین ہوا وہ چودہ برس تک قطب شاہوں کی اس امانت یعنی سلطنت گولکنڈہ کو دشمنوں سے بچاتا رہا وہ نہایت دور اندیش اور قابل و مدبر حکمران تھا۔ اس نے قلیل عرصہ میں قطب شاہی سلطنت کے ان تمام کل پرزوں کو درست کر لیا جو سلطان عبداللہ کے پچاس سال کے طویل عہد حکومت میں بالکل کمزور اور منتشر ہو گئے تھے۔ اگر شہنشاہ اورنگ زیب جیسے طاقتور دشمن سے مقابلہ نہ ہوتا اور تمام ہندوستان کی فوجیں اس کے مقابلہ پر نہ ہوتیں۔ یہ سچ ہے کہ اگر یہ نہ ہو جاتیں تو وہ قطب شاہوں کی اس امانت کو اپنی اولاد تک نہایت مستحکم اور طاقتور حالت میں منتقل کر سکتا۔ اس کے عہد میں بھی حیدرآباد اردو شاعروں اور انشاپردازوں کا مرکز بنا رہا۔ طبعی اور غلام علی جیسے بلند مرتبہ شاعر اس وقت بھی موجود تھے۔ جنھوں نے دنیائے ادب کی خدمات شعر و سخن کو بوجہ احسن جاری رکھا۔

سلطان ابوالحسن قطب شاہ نے جس خوبی اور مردانگی سے مغلوں کا مقابلہ کیا اور اثنائے جنگ میں اس کا برتاؤ جیسا شریفانہ اور بہادرانہ رہا اس کے تذکرے خاص و عام کی زبان پر اب تک جاری ہیں اس نے قطب شاہی افواج کی اخلاقی حالت اس قدر درست کر دی تھی کہ دشمن بھی اعتراف کرتے تھے۔ اگر اورنگ زیب کا تدبر اور میر جملہ کے جانشین غدار قطب شاہی امراء کا مکر و فریب کارگر نہ ہوتا تو شاید ہی گولکنڈہ فتح ہو سکتا۔

(ماخوذ از سیر گولکنڈہ)

سید محی الدین قادری زور



سلطان قلی قطب شاہ
(بانی گولکنڈہ)
۹۱۶ھ تا ۹۵۰ھ



جمشید قلی قطب شاہ
۹۵۰ھ تا ۹۵۷ھ

# سلطان قلی قطب شاہ

(سنہ ۹۲۴ھ تا ۹۵۰ھ)

سلطان قلی قطب شاہ سلطنت گولکنڈہ کا بانی ہے۔ وہ ترکستان کے ایک بہت بڑے اور مشہور حکمران قبیلے قراقونیلو کا رکن تھا۔ وہ دو مرتبہ دکن آیا تھا۔ اس کے دکن آنے کا سبب خاندان شاہیہ کی تباہی اور قبیلۂ آق قونیلو کا ترکستان پر تسلط ہے۔ وہ اپنے چچا اللہ قلی کے ساتھ قیمتی تحفے وغیرہ لے کر ہندوستان آیا تھا۔
سلطان قلی ترکستان سے سیدھا دکن آیا۔ یہ محمود شاہ بہمنی کا عہد حکومت تھا جبکہ بیدر تمام ممالک عجم کا مرجع بن گیا تھا۔ ان کی خاندانی حالت اور وجاہت کو دیکھ کر بہمنی دربار نے ان کی بہت آؤ بھگت کی۔ سلطان قلی اپنے چچا کے ساتھ جب پہلی مرتبہ دکن آیا تو دونوں کے لئے تا قیام وظیفہ قائم رکھا گیا تھا۔ دوسری مرتبہ آیا تو بہت سی عنایتیں ہوئیں اور ان کو ٹھہر جانے کے لئے مجبور کیا گیا۔ یہی اسباب تھے جن کی وجہ سے سلطان قلی دربار دکن سے بہت متاثر ہوا تھا۔
چند دنوں کے بعد ترکستان کے حاکم امیر یعقوب کے مرنے کی خبر آئی اور یہ ہمدان کے شاہی خاندان کے لئے بڑا موقع تھا۔ اللہ قلی بیگ نے بادشاہ سے مراجعت کی اجازت چاہی۔ اللہ قلی کے اصرار پر اس کو تو اجازت مل گئی لیکن بادشاہ نے کہا کہ "اللہ قلی بیگ اگر تو می رود مختاری، مگر سلطان قلی بیگ را بہ ہیچ وجہ رخصت انصراف نمی دہیم"۔ اس کے علاوہ خود سلطان قلی بھی واپس نہیں جانا چاہتا تھا اس لئے اللہ قلی کو مجبوراً تنہا لوٹنا پڑا۔ اور سلطان قلی دکن میں رہ گیا۔

سلطان قلی کی استقامت سے محمود شاہ بہت خوش تھا۔ اس کو اپنے مقرب درباریوں میں شریک کر لیا۔ اس کی ترقی کا بڑا سبب اس کی ذاتی قابلیت تھی۔ شکار کے مشہور واقعہ کے بعد اس کو ایک سو پچاس عربی و ترکی گھوڑے مع ساز و سامان عطا ہوئے اور خلعت عنایت کی گئی اور اس کے اخراجات کے لئے کوڑا نگل اور اس کے مضافات دئے گئے اور خواص خان خطاب سے سرفراز ہوا۔ سلطان قلی علم حساب اچھا جانتا تھا اور خوش خط بھی تھا اسی لئے بادشاہ نے اس کو شاہی محلات کا محاسب بنایا۔ اس کی بڑی قابلیت کا اظہار تلنگانہ کے پرگنوں میں ہوا جہاں وہ خود اپنی خواہش سے ڈاکوؤں کی سرکوبی اور ادائی مالگزاری کے لئے رعایا کو پابند کرنے گیا تھا۔ چونکہ اس میں علمی اور فوجی دونوں قابلیتیں تھیں اس کو خواص میں صاحب السیف والقلم کہا جاتا تھا۔

اس کے بعد سلطان قلی کی قابلیت اس وقت ظاہر ہوئی جبکہ ۸۹۶ھ میں اہل بیدر نے باہر والوں سے انتقام لینے کے لئے قلعہ پر حملہ کر دیا تھا۔ خود بادشاہ کی جان سخت خطرے میں تھی قلعہ دار حسن علی سبزواری اور سید میرزائی مشہدی کے ساتھ سلطان قلی بھی مع دس ہزار مغل جوانوں کے موجود تھا۔ یہاں سلطان قلی کی سچی جاں نثاری اس کی غیر معمولی ترقی کا باعث ہوئی چنانچہ بادشاہ نے خوش ہو کر اس کو قطب الملک کا خطاب دیا تھا۔
اس کے تین سال بعد ۸۹۹ھ میں مغربی ساحل کی بغاوت سلطان قلی کے لئے مزید ترقی کا باعث ہوئی۔ یعنی وہ تمام ممالک تلنگانہ کا صوبہ دار بن گیا۔ بہمنی امیر بہادر گیلانی کی سرکوبی میں اس نے بڑا حصہ لیا۔ جب بادشاہ مغربی ساحل کی مہم سے فارغ ہو کر بیدر آیا تو قطب الملک سلطان قلی کو تلنگانہ کا صوبہ دار بنا دیا۔ اور اس کی قدیم جاگیر میں گولکنڈہ اور ورنگل کا اضافہ کیا
دکن کے سیاسی انتشار نے بھی سلطان قلی کی مدد کی۔ اسی انتشار میں وہ ترقی کر کے گولکنڈہ کی خود مختار سلطنت قائم کر سکا۔ دکن میں ملکی اور غیر ملکی عناصر کی کشمکش اور حکومت کی کمزوریوں سے جب بہمنی سلطنت کا دسویں صدی ہجری کے اوائل میں خاتمہ ہوا اور اس کے حصے بخرے ہونے لگے تو بیجاپور، احمد نگر،

اور برار کے ساتھ گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت بھی قائم ہو گئی۔

سنہ ۹۲۴ھ میں سلطان محمود کے انتقال کے بعد وہ خودمختار ہوا اور اس کے بعد اس نے گولکنڈہ کو پائے تخت بنایا قلعہ اور شہر کی تعمیر کی۔ فوجی نقطۂ نظر سے گولکنڈہ نہایت موزوں سمجھا گیا۔ اپنے مرکز کے استحکام کے بعد اس نے مشرقی تلنگانہ کے مختلف صوبوں پر وار کرنے شروع کئے۔ تقریباً ۲۰ سال کے دوران میں ساٹھ ستر قلعے اور حصار فتح کئے۔ اور سلطنت کو بنگال کی سرحد سے بندرگاہ مچھلی پٹم تک پہنچا دیا۔

سنہ ۹۵۰ھ اواخر جمادی الاول میں اس کے بیٹے جمشید نے تخت سلطنت کی ہوس میں اسے قتل کروایا۔ اس نے تقریباً پچاس سال دکن میں حکومت کی۔ اگر اس کا ابتدائی زمانہ بھی شامل کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے تقریباً ساٹھ سال سیاست دکن کی رہنمائی کی۔ اسی مدت میں اس نے جنوبی ہند کے تمدن و سیاست میں ایک بڑا تغیر پیدا کیا تھا۔ یہاں کی منتشر اکائیوں کو ایک رشتہ میں منسلک کر کے اس ملک کی خاطر خواہ شیرازہ بندی کر دی تھی اور باضابطہ نظم و نسق سے یہاں امن و امان قائم کر دیا تھا۔

## جمشید قطب شاہ

(سنہ ۹۵۰ھ تا سنہ ۹۵۷ھ)

سلطان قلی قطب شاہ نے ۹۰ سالہ عہد حکومت کے بعد ۹۹ سال کی عمر میں انتقال کیا تھا۔ وہ گولکنڈہ کی نوخیز سلطنت کو مستحکم حالت میں چھوڑ گیا تھا۔ اس کے ۶ بیٹے تھے۔ فرزند اکبر حیدر قلی جو جانشینی کے لئے نامزد ہو چکا تھا باپ کی زندگی میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد سلطان قلی قطب شاہ نے اپنے دوسرے بیٹے قطب الدین کو ولیعہد بنایا لیکن اس کے مقابلہ میں اس کے دوسرے بھائی جمشید قلی، عبدالکریم اور دولت قلی بہت تیز طبیعت اور حوصلہ مند تھے۔ چھوٹا بیٹا ابراہیم قطب دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ لائق تھا۔ عبدالکریم باپ کی زندگی ہی میں بغاوت کی پاداش میں مارا گیا۔ اور جمشید اور دولت بھی نظر احتیاطاً قید رکھے گئے تھے، لیکن جمشید قلی جو گولکنڈہ ہی میں مقید تھا، اپنے لئے قید میں سے راستہ صاف کرنے لگا اور سازش کی اور ایک شخص میر محمود ہمدانی کے ذریعہ اپنے باپ کو قتل کروایا۔ باپ کے مرنے کے بعد جمشید قید سے باہر نکلا اور اپنے ہمدردوں کے زور سے سلطنت کے سیاہ و سفید اپنے ہاتھ کر لیے۔ قطب الدین ولیعہد سلطنت اندھا کر دیا گیا۔

سنہ ۹۵۰ھ میں جمشید قطب شاہ کی تخت نشینی عمل میں آئی اور سنہ ۹۵۷ھ تک سات سال اس نے حکومت کی۔ اگرچہ تخت نشینی کے بعد جمشید نے رعایا کو خوش کرنے کی کوشش کی اور انہیں مختلف انعامات سے سرفراز کیا لیکن راعی و رعایا میں کچھ خوشگوار تعلقات نہ پیدا ہو سکے۔ پہلے تو اس کے کرتوت ہی اس کی بدنامی کے لئے کافی تھے پھر تخت نشینی کے بعد جبکہ اس کی عمر ۳۰ سال کی تھی، طبیعت کی تند تیزی اور تند مزاجی نے اس کے بہت سے مخالف پیدا کر دئے۔ جمشید کا چھوٹا بھائی ابراہیم جو دیورکنڈہ سے بھاگ کر ملک برید کے پاس بیدر پہنچ گیا تھا برید کی امداد کے ساتھ گولکنڈہ کی دیواروں تک پہنچ گیا۔ اگرچہ یہ حملہ برہان نظام شاہ والی احمدنگر کی تائید سے رفع ہو گیا تھا لیکن ملک برید اس حملہ کے بعد سے گولکنڈہ کی اندرونی سیاسی فضا اور جمشید کی کمزوریوں سے واقف ہو گیا۔ بیدر کی بریدشاہی سلطنت بہت مختصر تھی لیکن اس زمانہ میں برید دکن کی لومڑی کہلاتے تھے۔ وہ آپس کے جوڑ توڑ میں بہت مشاق تھے کبھی بیجاپور کا ساتھ دیا تو کبھی احمدنگر کا۔ ہر حیلہ و بہانہ سے ان سلطنتوں کو لڑوایا کرتے تھے تاکہ اس طرح سے ان کا فائدہ ہو جائے۔ چنانچہ جمشید کے زمانے میں بھی لڑائیاں بہت کم ہوئی ہیں۔

برہان نظام شاہ نے جمشید قلی قطب شاہ سے زیادہ دوستی بڑھائی شولاپور پر احمد نگر نے حملہ کیا تو عماد الملک اور جمشید دونوں احمد نگر کے ساتھ شریک تھے۔ لیکن ابراہیم عادل شاہ کی تائید پر برید کی فوجیں تھیں کہتے ہیں کہ اس موقع پر جمشید ہی نے بڑا کام کیا۔ اس کے آگے بڑھنے سے ابراہیم اور برید میدان چھوڑ کر بھاگے اور جمشید نے برید کا بیدر کی دیواروں تک تعاقب کیا۔

اس شکست کے بعد برید خاموش کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ انتقام لینے کے لئے برید نے غالباً ٩٥٢ھ میں گولکنڈہ پر حملہ کر دیا۔ لیکن جمشید نے بڑی ہوشیاری کی۔ تھوڑی سی فوج یہاں چھوڑ کر چپکے سے بیدر پر حملہ کر بیٹھا۔ برید کی فوجیں لوٹیں اور دونوں کا مقابلہ ہوا۔ یہاں بھی گولکنڈہ کی فتح ہوئی۔

برید کا جذبہ انتقام اس کی شکستوں سے اور بڑھ رہا تھا۔ اب اس نے چوتھی مرتبہ ابراہیم عادل شاہ بیجاپور کے اتحاد سے جمشید پر حملہ کیا۔ کئی دن لڑائی ہوئی مگر اس میں بھی جمشید ہی کے سر فتح کا سہرا رہا۔

اس کے بعد جمشید نے ہمیشہ کے لئے برید کا خاتمہ چاہا۔ اس نے دکن کی تمام دوسری ریاستوں کو ہموار کر کے برید پر متفقہ حملہ کیا۔ بیجاپور بھی جو اب تک برید کا دوست تھا، اس اتحاد میں شریک ہو گیا۔ چنانچہ جب برید ہار مان کر بیجاپور بھاگا تو بجائے امن دینے کے ابراہیم نے اسے گرفتار کر لیا۔ لیکن دکن کی سلطنتوں میں کچھ ایسی رقابت تھی کہ بعد کو خود جمشید نے برید کو چھڑا لیا اور بیدر لیجا کر صحیح سلامت چھوڑ دیا۔

بیدر سے واپسی کے بعد جمشید کے دو تین سال آرام میں گزرے۔ لیکن یہ کچھ زیادہ دن تک آرام نہ لے سکا۔ وہ بڑے سخت مرض میں مبتلا ہو گیا۔ فرشتہ اسے دق بتاتا ہے لیکن تاریخ قطب شاہی کے الفاظ میں یہ مرض سرطان تھا جس کے صدمہ سے بالآخر ٩٥٧ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے صرف سات سال حکومت کی۔ اس کو سلطان قلی قطب شاہ کے قریب دفن کیا گیا۔

انتہائی برائیوں کے گھٹاٹوپ میں جو جمشید سے سرزد ہوئی تھیں اس کے کوئی اوصاف روشنی میں نہ آ سکے۔ لیکن اس کی برائیوں کو قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اس میں بہت سے اوصاف ایسے بھی ملتے ہیں جو سراہنے کے قابل ہیں۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے جمشید قطب شاہ ہندوستان کے اچھے حکمرانوں میں سے تھا۔ دکن کی سیاست پر اس کی وسیع نظر تھی۔ سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے وہ ہمیشہ کامیاب ہتھکنڈے اختیار کرتا تھا۔ چنانچہ برید کے شر و فساد سے دامن چھڑانے کے لئے احمد نگر اور بیجاپور سے اتحاد کیا تھا۔ اس کی فوجی تنظیم نہایت اچھی تھی۔ وہ خود جری سپاہی تھا اور فوج میں بذاتہ خود حصہ لیتا تھا۔ اس کی دلیری اور جراءت کا یہی نتیجہ تھا کہ سوائے جنگ نارائن کھیڑ کے جہاں عین الملک کے بیٹے کی غفلت سے کام خراب ہوا تھا، گولکنڈہ کی فوجوں کو کبھی شکست نہیں ہوئی۔ اور سلاطین دکن ہمیشہ اس کی امداد کے طالب ہوتے تھے۔ وہ شجاعت کے ساتھ خودداری کا جوہر بھی اپنے اندر رکھتا تھا۔ ان اوصاف کے ساتھ جمشید میں علمی قابلیت بھی تھی۔ وہ اچھا شاعر تھا بعض دفعہ اس نے فی البدیہہ اشعار کہے تھے۔ اس نے فرصت کے موقعوں میں بہت سے قصیدے اور غزلیں بھی لکھی تھیں۔

عبدالحفیظ صدیقی

---

## جدید اُردو شاعری

مولوی عبدالقادر صاحب سروری ام۔اے۔ال ال بی کی معرکتہ الآرا تصنیف ہے جو عہد حاضر کی اردو شاعری پر ایک مستند اور اپنی آپ نظیر کتاب ہے اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی کتاب اردو میں موجود نہیں ہے اکثر شعرائے اردو کی تصاویر بھی ہیں۔ صفحات [illegible] قیمت [illegible]

سب رس کتاب گھر سے طلب کیجئے

# ابراہیم قلی قطب شاہ (۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ)

جمشید قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد تخت گولکنڈہ کے کئی دعویدار کھڑے ہوگئے۔ جمشید کا صغیر سن بیٹا سبحان قلی تخت پر بٹھا تو دیا گیا لیکن دو زبردست حریف اٹھ کھڑے ہوئے۔ دولت قلی جو کہ ... میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اور ابراہیم قلی بیجانگر سے حصول تخت کے لئے روانہ ہوا۔ دولت قلی کو کسی نہ کسی طرح مقید کر لیا گیا پر ابراہیم قلی کے سامنے کسی کی کچھ پیش نہ گئی اور ۹۵۷ھ میں تخت گولکنڈہ ابراہیم قلی قطب شاہ سے زینت پایا۔ ابراہیم قلی قطب شاہ بڑا مدبر اور دوربین بادشاہ تھا۔ اس نے مصطفےٰ خان کو اپنا وزیر مقرر کیا اور اپنی بہن اس سے منسوب کر دی۔

۹۶۴ھ میں حسین نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ کے متحدہ لشکر نے گلبرگہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن رام راج والیٔ بیجانگر کی گفت و شنید نے محاصرہ اٹھانے پر مجبور کیا۔

۹۶۶ھ میں علی عادل، رام راج اور ابراہیم قطب شاہ تینوں نے احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ قریب تھا کہ احمد نگر فتح ہو جائے لیکن چونکہ اس فتح سے علی عادل کی قوت بہت بڑھ جاتی تھی اور سلطنت گولکنڈہ کو اس سے خدشہ تھا۔ ابراہیم راتوں رات اپنا لشکر لے کر چلا آیا۔ حسین نظام شاہ نے اپنی بیٹی ابراہیم کے عقد میں دی۔ اور اپنے کھوئے ہوئے قلعے واپس لینے کے لئے ابراہیم کی مدد چاہی۔ ابراہیم نے اپنی فوج بھیج دی۔ لیکن یہ مہم مستقل طور پر نہیں لڑی گئی۔ کچھ دن بعد فوج بغیر کسی نتیجہ کے واپس لوٹی۔ اس وقت گولکنڈہ بیرونی حملہ آوروں کی زد میں تھا۔ رام راج کی فوج اندر تک گھس آئی تھی اور بادشاہ کو کوولکنڈہ، گھن پورہ، اور پانگل کے قلعے دے کر صلح کر لینا پڑا۔ بیرونی دشمن دفع ہو چکا تو اندرونی دشمنوں نے سر اٹھایا۔ ابراہیم قلی نے گولکنڈہ کے حصار کی مرمت کروائی اور شہر کو ہر طرح محفوظ کر لیا۔ اسی اثنا میں نائب وزیروں کا فساد ہوا لیکن بہت جلد فرو کر دیا گیا۔

رام راج کی قوت بہت بڑھ چکی تھی۔ اور وہ اسی زعم میں اپنی ہمسایہ سلطنتوں کو چھیڑ چھیڑ کر اپنی طاقت جتلا رہا تھا۔ مسلمان تو ویسے ایک دوسرے کی دشمن سبھی لیکن وقت پر متحد ہو جاتی تھیں۔ ابراہیم قلی قطب شاہ، حسین نظام شاہ، علی عادل، اور علی برید نے رام راج پر حملہ کر دیا۔ اور مشہور فیصلہ کن جنگ تالی کوٹ ہوئی۔ راجہ کو شکست فاش ہوئی۔ اور ابراہیم کے کھوئے ہوئے قلعے پھر سے واپس مل گئے۔

۹۷۴ھ میں ابراہیم نے رفعت خاں لاری کو راجمندری کی فتح کے لئے بھیجا۔ دو زبردست معرکوں کے بعد راجمندری پر قطب شاہی افواج قابض ہو گئیں۔

ابراہیم کا دور حکومت نہایت پر آشوب اور معرکہ آرائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایک فتنہ کا سر دبایا گیا تو دوسرا اٹھا۔ بادشاہ کا لشکر کبھی اتحادیوں کو ان کی بدعہدی کی سزا دینے میں مصروف ہوتا تو کبھی چھوٹے موٹے راجاؤں کو ان کی سرکشی کی۔ شاہی اقبال ہمیشہ یاوری کرتا اور ہر جگہ بادشاہ کو فتح ہوتی۔ ابراہیم قلی قطب شاہ کا انتقال ۹۸۸ھ میں ہوا۔ کل تیس سال نو مہینے اس کی حکومت کا زمانہ ہے۔ اس کے زمانے میں گولکنڈہ میں کئی عمارتیں بنیں۔ لنگر، دروازہ امام، ریاض محل، باغ ابراہیم شاہی، حوض حسین ساگر، گنگورہ، بدویل، کے علاوہ مساجد، مدارس بھی تعمیر پائے۔

رشید قریشی



ابراهیم قلی قطب شاہ
۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ



محمد قلی قطب شاہ
(بانی حیدرآباد)
۹۸۹ھ تا ۱۰۲۰ھ

# محمد قلی قطب شاہ

(سنہ ۹۸۸ھ تا سنہ ۱۰۲۰ھ)

محمد قلی قطب شاہ کا عہد حکومت سنہ ۹۸۸ھ سے شروع ہوتا ہے۔ اسی عہد میں قطب شاہوں کا تمدن پیدا ہوا۔ یہ اپنے کارناموں کے لحاظ سے ایک زرین دور ہے۔ محمد قلی قطب شاہ سے پہلے کے دور میں صرف گولکنڈہ کی تاسیس ہوئی تھی اور اس کے ضروری لوازم جمع کئے گئے تھے۔ اس دور کے کارفرما سلطان قلی قطب شاہ اور اس کا بیٹا جمشید قطب شاہ تھے۔ دوسرے دور میں جبکہ ابراہیم قطب شاہ تخت نشین ہوا تھا اس سلطنت کا استحکام عمل میں آیا۔ اس کا عہد حکومت میں جو تقریباً ۳۰ سال پر حاوی ہے اس سلطنت کو ہر طرح سے مستحکم کیا گیا۔ اندرونی انتظام ٹھیک کیا گیا۔ نظم و نسق کے کل پرزے منضبط کر دئے گئے۔ اس کے بعد محمد قلی قطب شاہ کو جو کام ملا وہ اس سلطنت کو تمدن کے نقش و نگار سے آراستہ کرنا تھا۔ یہ گولکنڈہ کا تیسرا دور ہے۔

محمد قلی قطب شاہ ابراہیم قطب شاہ کا تیسرا بیٹا تھا چونکہ اس کے بڑے بھائی مر چکے تھے، باپ کے انتقال کے بعد ہی تخت کا وارث ہوا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر صرف ۱۵ سال کی تھی۔ دسویں صدی ہجری یا سولھویں صدی عیسوی کا آخری زمانہ جبکہ محمد قلی قطب شاہ کو عنان حکومت ملی تھی تمام دکن کے لئے سیاسی حیثیت سے بہت پیچیدہ ہو رہا تھا۔ شمال سے مغلوں کے سیلاب آنے لگے تھے اور دکن کی آزادی خطرہ میں تھی۔ سنہ ۹۷۲ھ میں دکن کی اسلامی حکومتوں نے وجیانگر کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا تو اب جنوب سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ محمد قلی قطب شاہ نے پرانے رئیسوں اور جاگیرداروں کی سرکوبی کر دی تھی جو کبھی کبھی سر اٹھا لیتے تھے۔ اس کی سلطنت نے تو اپنی فوج کشیوں سے کرناٹک کا تمام مشرقی علاقہ فتح کر لیا تھا اور عبداللہ قطب کے عہد میں قطب شاہی سلطنت کرناٹک کے ایک بڑے حصے پر جس میں مدراس بھی شامل تھا چھا گئی تھی۔

لیکن اب دکن کو شمال کا مقابلہ کرنا تھا۔ یہ مغلوں کی بڑی طاقت سے ٹکر تھی۔ سنہ ۹۹۰ھ میں اکبر شمالی ہند سے مطمئن ہوا تو وہ دکن کی طرف متوجہ ہوا۔ گولکنڈہ کو احمد نگر کے جنوب میں ہونے کی وجہ زیادہ خطرہ نہ تھا لیکن مغلوں کے سیلاب سے بچنے کے لئے حفاظت ضروری تھی۔ جب برہان کی بہن چاند بی بی جو بیجاپور میں تھی احمد نگر کی مدد کو دوڑی آئی اور شہزادہ مراد کے مقابلہ میں نظام شاہی فوجوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لی تو ابراہیم عادل شاہ ثانی اور محمد قلی قطب شاہ نے بھی اس کی مدد کی۔ شاید اسی امداد نے احمد نگر کے بچانے میں بڑا کام کیا تھا۔ اس کے بعد سنہ ۱۰۰۶ھ میں مغلوں کا احمد نگر پر دوبارہ دھاوا ہوا۔ اور اس موقع پر بھی گولکنڈہ اور بیجاپور نے احمد نگر کی مدد کی۔ مغلوں کو اس حملہ میں بڑی دقت سے فتح ہوئی لیکن ان کو کافی نقصان بھی ہوا۔ چاند بی بی کے مرنے کے بعد ملک عنبر احمد نگر کی گرتی ہوئی سلطنت کو بچانے کے لئے کھڑا ہوا تو اس کی بھی خاطر خواہ مدد کی گئی۔ اس سے گولکنڈہ کی بیدار مغزی اور احساس ذمہ داری ثابت ہوتی ہے۔

مغل سیلاب کی روک تھام اور دکن کی آزادی کی حفاظت گولکنڈہ کا ہمیشہ مطمح نظر رہا ہے۔ لیکن محمد قلی قطب شاہ کی وسیع نظر سلطنت کے بیرونی حدود پر بھی پڑتی تھی۔ شمال مشرق میں فوجیں متعین تھیں۔ راجمندری ایک بڑا فوجی مستقر تھا اور اس کے بعد مرتضیٰ نگر گنٹور۔ مغربی حصہ زد میں تھی تو محمد قلی قطب شاہ نے بیجاپور پر کئی حملے کئے۔

لیکن کسی قوم و مملکت کا تمام سرمایہ جنگ و جدل ہی نہیں بلکہ قومی تعمیر اور تمدن کی آبیاری ہے۔ قطب شاہوں کو یہ امتیاز ہے کہ انہوں نے باوجود ایرانی نژاد ہونے کے تلنگانہ کو اپنا گھر بنا لیا تھا اور تلنگی رعایا کو اپنی رعایا سمجھا۔ نہ صرف اس ملک کی زبان اور روایات کو ترقی دی بلکہ تمدنی خدمات کے ذریعہ سے اس ملک کی اس قدر سرپرستی کی کہ تاریخ اس کو نہیں بھول سکتی۔ محمد قلی نے تو آندھرا دیش کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ ایک طرف اس نے گولکنڈہ میں

قومی تعمیر کی بنیاد رکھی اور اس کو آگے بڑھانے کی پوری کوشش کی، دوسری طرف تمدنی عمارات کے ذریعہ تلنگانہ کا تمدنی پایہ بلند کیا۔ اس کے زمانہ کے عظیم الشان تعمیری آثار اس حقیقت کی پوری نشان دہی کرتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ تلنگی زبان کا بڑا عالم تھا، اور روایت ہے کہ اس نے تلنگی میں ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ وہ پہلا آدمی ہے جس نے حیدرآباد میں اردو میں شاعری کی۔ اس کی نظمیں اور غزلیں اس کے ادبی ذوق اور ارتقائے اردو کے بہترین مظہر ہیں۔ ان نظموں سے معلوم ہوتا ہے اس کو مقامی معاشرت اور روایات سے بھی گہری دلچسپی تھی۔

محمد قلی قطب شاہ کے تمدنی کارناموں کی ایک بڑی فہرست ہے۔ صرف شہر حیدرآباد اور اس کی تعمیر اس بادشاہ کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے حیدرآباد کی تعمیر کی صحیح تاریخ مشتبہ ہے۔ شہر کے بیچ میں ایک سڈول عمارت چار مینار کی تاسیس ۹۹۹ھ میں ہوئی تھی غالباً یہ ڈیڑھ دو سال میں تیار ہوئی اور "یا حافظ" سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔ شہر کی تعمیر کا بڑا مقصد ملک میں ایک اجتماعی زندگی پیدا کرنا تھا۔ بادشاہ نے شہر کی تعمیر کے ساتھ اس بات کا پورا لحاظ رکھا تھا کہ اس میں ایک متمدن زندگی کی تمام ضرورتیں مہیا ہوں۔ شہر و عمارت کی خوش اسلوبی اور عظمت کی وجہ سے گولکنڈہ کے مورخ کا یہ کہنا کہ "در تمامی ہندوستان عدیلے ندارد" بڑی حقیقت پر مبنی ہے۔

عبدالحفیظ صدیقی

# سلطان محمد قطب شاہ

## (۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ)

سلطان محمد قلی وصیت کر گیا تھا کہ اس کے بھتیجے سلطان محمد کو تخت پر بٹھایا جائے اس لئے سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۹ سال تھی۔ سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ راجہ وستہ کی مہم کا تصفیہ کرنا تھا۔ راجہ وستہ نے اطاعت قبول کر لی تو شاہی فوجیں پایۂ تخت لوٹ آئیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مغلوں کا تسلط دکن پر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور مصلحت وقت یہی تھی کہ سلطان محمد بھی مغلوں سے صلح کر لیتا۔ جب شاہجہان معتوب شہزادہ کی حیثیت سے دکن میں مارا مارا پھر رہا تھا سلطان محمد نے اس کی بڑی مہمان داری کی۔ سلطان محمد بہت مہمان نواز اور فراخ دل بادشاہ تھا۔ اس کے دربار میں دور دور کے سفیر حاضر رہتے اور بڑی بڑی تنخواہیں پاتے۔

سلطان محمد کا بڑا بیٹا عبداللہ مرزا ۱۰۲۳ھ میں پیدا ہوا۔ بادشاہ نے ۱۲ سال تک اس کی صورت نہ دیکھی۔ کیونکہ یہی منجموں اور رمالوں کی رائے تھی۔ بارہ سال گزرنے کے بعد بادشاہ نے اپنے بیٹے کی صورت دیکھی بھی تو کچھ نہ ہوا۔ دوسرے تیسرے روز سے بادشاہ کو بخار آنا شروع ہوا طبیبوں کے باہمی اختلاف نے مرض کو اور بڑھا دیا۔ اور ۱۰۳۵ھ میں ۳۲ سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا۔ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کی صحیح تاریخ ملنی بہت مشکل ہے۔ روایتوں اور قصہ کہانیوں سے کچھ حال معلوم ہو سکا۔ اس کے جنگی کارنامے بھی معلوم نہ ہو سکے ہاں اتنا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے عادات و اطوار نہایت ستودہ اور زبان زد خاص و عام تھے۔ یہ صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ کہتے ہیں کہ جس وقت بادشاہ کو مسجد کی بنیاد رکھنے ایسے آدمی کی تلاش ہوئی جس کی تہجد تک قضا نہ ہوئی ہو تو خود بادشاہ ہی ایسا شخص تھا۔ شعر کہنے کا بھی شوق تھا اور خوب کہتا تھا۔ حیدرآباد کی جامع مسجد (جو اب مکہ مسجد کہلاتی ہے) اسی کے عہد میں شروع ہوئی لیکن مسجد کے ختم ہونے سے پہلے ہی بادشاہ کا انتقال ہوگیا۔



سلطان محمد قطب شاہ
۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵



سلطان عبداللہ قطب ساہ
۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ

سلطان محمد نے اپنے آخری زمانے میں ایک اور شہر کی بنیاد "سلطان نگر" کے نام سے ڈالی تھی۔ بیرونی حصار اور چند مکانات بھی تیار ہو گئے تھے۔ مگر بادشاہ کے انتقال سے سب کچھ کیا دھرا رہ گیا۔

## سلطان عبداللہ قطب شاہ سنہ ۱۰۳۵ھ تا سنہ ۱۰۸۳ھ

سلطان عبداللہ قطب شاہ تخت نشین ہوا تو تخت کے گرد اگرد حریص امرا کا جمگھٹا تھا۔ بادشاہ کو بڑی مشکل پیش آئی سلطنت جیسے کسی بھنور میں آگئی۔ لیکن رفتہ رفتہ صورت حال سدھرنے لگی۔ اور بادشاہ کو کچھ اطمینان نصیب ہوا۔

شہنشاہ دہلی سے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے اور بادشاہ کی جانب سے پیشکش بھیجا جانے لگا۔ بادشاہ کی نوجوانی نے عیش و نشاط کے سارے دروازے کھول دیے اور گولکنڈہ کے در و دیوار سے عیش کی بو آنے لگی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر امرا نے اپنی قوت بڑھانی شروع کی۔

اسی اثناء میں شاہجہاں کی فوج کشی کی خبر عام ہوئی تو بادشاہ کو نئی فوج کی بھرتی کا خیال ہوا۔ باقر خاں نجم ثانی صوبہ دار اڑیسہ کو شاہ دہلی کی جانب سے حکم دیا گیا کہ وہ گولکنڈہ پر حملہ کرے باقر خاں اکثر قصبوں اور پرگنوں پر قبضہ کر لیا۔ ساری قطب شاہی علمداری میں تہلکہ پڑ گیا۔ ملیاچہ دھری کلنگور نے علانیہ بغاوت کی بادشاہ نے شریف الملک اور یولچی بیگ کو اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا اس جنگ میں ملیا مارا گیا اور بغاوت فرو ہو گئی۔ اس کے بعد بادشاہ نے باقر خاں کے حملے کو روکنے کے لئے خواجہ افضل ترک کو قاسم کوٹہ بھیجا۔ لیکن ایک سفیر شاہجہاں کے پاس بھی روانہ کیا گیا۔ شاہجہاں کو جب عبداللہ قطب شاہ کی پیشکش پہنچی تو اس نے اپنے مفتوحہ علاقے اسے واپس کر دئے سنہ ۱۰۴۵ھ میں شاہجہاں نے عبداللہ قطب شاہ کو پیشکش کی یاد دلائی اور خطبہ اثنا عشری کو موقوف کرنے کی تاکید بھی کی۔ بادشاہ نے خطبہ موقوف کر دیا اور خطبۂ چار یاری پڑھوانے لگا۔ ساتھ ہی اپنی قوت کے بڑھانے کی کوشش کرنے لگا۔ محمد سعید میر جملہ کو ایک زبردست لشکر دے کر اس نے کرناٹک کی طرف روانہ کیا میر جملہ نے بہت سا علاقہ فتح بھی کیا۔ کرناٹک کے بعد میر جملہ کو دریائے گوداوری کے کنارے کا علاقہ فتح کرنے بھیجا۔ میر جملہ ان فتوحات سے مغرور ہو گیا۔ بادشاہ کی ناراضی کا باعث بن گیا۔ اورنگ زیب اس زمانے میں دکن کی فتح کا خیال کر رہا تھا۔ میر جملہ نے اس کا دامن تھاما۔ چنانچہ اسی کی رائے سے اورنگ زیب نے شہزادہ سلطان محمد کی سرکردگی میں ایک فوج گولکنڈہ کی طرف روانہ کی۔ بادشاہ نے اپنے ایک سفیر محمد ناصر کو اس کی خدمت میں جواہرات اور مرصع آلات سے بھرے ہوئے صندوق کے ساتھ بھیجا۔ اتنے میں اورنگ زیب بنفس نفیس آپہنچا۔ اور صلح کے شرائط اسی سے طے ہوئے بڑی بھاری شرطوں کے ساتھ عبداللہ قطب شاہ کو صلح نامہ منظور کرنا پڑا۔ اور تب کہیں جا کر بلا ٹلی۔

عبداللہ قطب شاہ کو اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس لئے اس کے بعد تخت اس کے داماد ابوالحسن قطب شاہ کو ملا۔

## سلطان ابوالحسن قطب شاہ (سنہ ۱۰۸۳ھ تا سنہ ۱۰۹۸ھ)

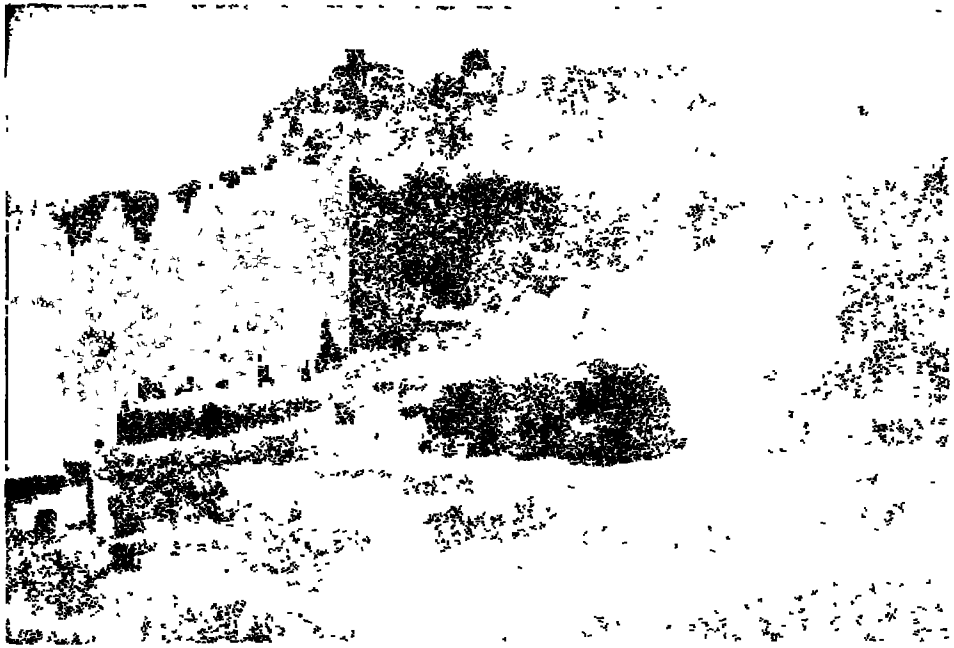
عبداللہ قطب شاہ کے دامادوں میں سلطان ابوالحسن سب سے زیادہ ہر دلعزیز تھا۔ بڑے داماد نے سلطنت پر قبضہ کر لینا چاہا مگر امرا نے ساتھ نہ دیا۔ سلطان ابوالحسن ہی تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ سید مظفر کو وزارت ملی سید مظفر بہت جلد اپنی بادشاہی کے خواب دیکھنے لگا۔ اور تعبیر کے طور پر قید کر لیا گیا۔ سید مظفر کے بعد مادنا وزیر قرار پایا اور اکنا اس کا پیشکار مقرر ہوا جب یہ خبر آئی کہ اورنگ زیب نے بیجاپور پر حملہ کر دیا ہے تو ابوالحسن نے اورنگ زیب کے پاس

اپنا ایلچی روانہ کیا اور نہایت جرأت سے شہنشاہ کو لکھا کہ "ہم آپ سے سرتابی کرتے ہیں۔ سنبھاجی کو بھی پراکساتے ہیں دیکھیں گے آپ کن کن سے مقابلہ کرتے ہیں"۔ اورنگ زیب کی نظر سے یہ تحریر گذری تو بہت غضب ناک ہوا اور شاہزادہ شاہ عالم بہادر شاہ کو فوج کثیر کے ساتھ گولکنڈہ کی طرف روانہ کیا۔ ابوالحسن کی فوج نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن جلد قطب شاہی سپہ سالار مغلوں سے مل گئے اور فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ دوسرے دن پھر لڑائی ہوئی اس اثناء میں بادشاہ اپنے سپہ سالاروں سے اندیشہ مند ہوگیا اور خلیل اللہ خاں جو گولکنڈہ کا نہایت نامی سپہ سالار تھا۔ ان سے ٹوٹ کر مغلوں سے جاملا۔ اب ابوالحسن نے قلعہ گولکنڈہ میں پناہ لی۔ اور مغل سپاہیوں نے حیدرآباد میں وہ قیامت برپا کی کہ قتل نادری اس کے سامنے کچھ نہ تھا ابوالحسن کی درخواست پر جدال و قتال روک دیا گیا اور صلح کے شرائط طے ہونے لگے۔ صلح کی شرط ایک یہ بھی تھی کہ مادنا و اکنا کو قید کرکے بھیج دیا جائے بادشاہ نے منظور نہ کیا۔ بہادر شاہ نے میر ہاشم کو صلح کے لئے بھیجا لیکن گولکنڈے میں یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اصل میں میر ہاشم تانا شاہ کو گرفتار کرنے آرہا ہے چنانچہ عبدالرزاق لاری اور شہزادہ خاں نے میر ہاشم پر حملہ کردیا اور اسے قتل کردیا۔ اورنگ زیب کو شہزادہ کی سستی اور ناتجربہ کاری کی خبر ہوئی تو بہت رنجیدہ ہوا اور دوسری مہموں کو ٹھکانے لگاکر گولکنڈہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ابوالحسن نے صلح کی بہت کچھ کوشش کی لیکن اورنگ زیب نے گولکنڈہ کو محصور کرلیا۔ "تنگ آمد بجنگ آمد"۔ ابوالحسن نے بھی سخت مقابلہ کیا۔ لیکن عبداللہ خاں پنی کی غداری سے اورنگ زیب نے قلعہ فتح کرلیا عبدالرزاق لاری نے اس موقع پر جس شجاعت و نمک حلالی کا ثبوت دیا وہ تاریخ میں یادگار ہے۔

قلعہ میں مغل سردار گھسے تو سارے قلعہ میں ادھم مچ گئی۔ ہر چہارطرف آہ و شیون کی آوازیں تھیں، اس وقت خاصہ تیار تھا۔ سلطان ابوالحسن اپنے لواحقین کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا۔ کھانے سے فارغ ہوکر شہزادہ کے پاس گھوڑے پر سوار ہوکر آیا۔ اپنی موتیوں کی مالا اس کے گلے میں ڈال دی۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ ابوالحسن کی عمر کے ۱۴ سال طفلی میں۔ ۱۴ سال تحصیل علوم میں ۱۴ سال سید راجو حسینی کی خدمت میں، ۱۴ سال حکمرانی میں اور چودہ ۱۴ سال قلعہ دولت آباد میں گزرے۔ ابوالحسن کی تین بیٹیاں تھیں۔ اور ایک لڑکا خدا بندہ جس کو اورنگ زیب نے بندہ سلطان کا خطاب دیا تھا۔ اس بادشاہ کی زندگی نے جس قدر افسانوی حیثیت حاصل کرلی ہے وہ تاریخی مطالعہ سے بے بنیاد ثابت ہوتی ہے۔ بادشاہ کی نزاکت، عیش پرستی، اور سادہ لوحی کے جو قصے بیان کئے جاتے ہیں وہ اس کے تاریخی کیرکٹر کو بگاڑ نہیں سکتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مستقل مزاج، مدبر اور متوکل بادشاہ تھا جس کی پیشانی عین گرفتاری کے وقت بھی شکن آلودہ نہ ہوئی۔

تاناشاہ کو ایک لڑکا اور تین لڑکیاں تھیں، اورنگ زیب نے دوسری لڑکی کی شادی سکندر عادل شاہ سے اور تیسری کی اسدخاں وزیر کے فرزند سے کردی پہلی لڑکی نے یہ کہہ کر شادی سے انکار کردیا کہ وہ اپنے بزرگ باپ کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کردینی چاہتی ہے۔ تاناشاہ کے لڑکے خدا بندہ کو باپ کی وفات کے بعد اپنے دربار میں طلب کیا اور بندۂ سلطان خطاب دیا، لیکن جب یہ شہزادہ دربار میں آتا تو اہل دربار جن میں دکنی امرا بھی تھے اس کی تعظیم کرتے۔ جس کی وجہ سے اورنگ زیب کو شبہ ہوا اور پھر یہ لڑکا کبھی نظر نہ آیا۔

رشید قریشی





سلطان ابوالحسن قطب شاہ
(تاناشاہ)
۱۰۶۳ھ تا ۱۰۵۸ھ

# وداعِ شاہ

تاناشاہ کی روانگی کے وقت اہلِ گولکنڈہ کی زبان سے

باحال تباہ جا رہا ہے ۔ کانوں کی بے راہ جا رہا ہے
کس یاس سے آہ جا رہا ہے ۔ اب قلعہ سے شاہ جا رہا ہے
کس طرح غبارِ راہ دیکھیں
ٹوٹے ہوئے دل کی چاہ دیکھیں

مٹ جائیں گے خود ہی اے عدو ہم ۔ آئیں گے نہ تیرے روبرو ہم
کرلیں گے تباہ رنگ و بُو ہم ۔ بیچیں گے نہ اپنی آبرو ہم
کس آس پہ اب رہیں جہاں میں
اُڑتے ہوئے رنگ گلستاں میں

ہم کو تو ملا تھا تاجِ شاہی ۔ کن آنکھوں سے دیکھیں یہ تباہی
آتا ہے ہمیں بھی رقصِ ماہی ۔ پائیں گے سزائے بے گناہی
واللہ، تڑپ کے جان دیں گے
مر کر ہی تجھے مکان دیں گے

پامال ہوں آفتاب ہو کر ۔ گر جائیں شرابِ ناب ہو کر!
چھپ جائیں نظر سے خواب ہو کر! ۔ بے کیف رہیں شباب ہو کر!
جب شاہ نہیں تو ہم رہیں کیوں؟
غیروں سے حدیثِ غم کہیں کیوں؟

---

بے آبروئی سے ڈر رہی ہیں ۔ ٹھکرا کے جہاں کو، مر رہی ہیں
نعشوں سے کنویں کو بھر رہی ہیں ۔ کام آنے کا کام کر رہی ہیں
امواج پہ رقصِ آب و گِل ہے
اس جنس کا دل بھی مردِ دل ہے

میکش

# مشاہیرِ گولکنڈہ

اس نام سے ایک کتاب آج کل زیرِ ترتیب ہے جس میں گولکنڈہ کے جملہ مشہور اصحاب (بادشاہوں سے لے کر غلاموں تک) کے تاریخی حالات نہایت دلچسپ پیرایہ میں قلمبند کئے جا رہے ہیں۔ اسی کتاب سے چند اصحاب کے حالات یہاں درج ہیں۔

## (وزرائے گولکنڈہ) جملۃ الملک مرزا محمد امین

اصفہان کے رہنے والے حیدرآباد آکر دربارِ شاہی کی ملازمت اختیار کی۔ سلطان محمد قلی نے حضرت میر مومن استرآبادی کی سفارش پر ۱۰۱۱ھ میں خدمتِ میر جملگی سپرد کی اور جواہرات کا ایک ایسا مرصع قلمدان و وزارت عنایت کیا جس کی روشنی سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ دو لاکھ ہون سالانہ تنخواہ مقرر کی گئی جو حال کے نو لاکھ روپیوں کے برابر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ قطب شاہی وزیر اعظم کی تنخواہ عہد حاضر کے وزیر اعظم کی تنخواہ سے تقریباً دس گنا زیادہ تھی۔ محمد امین نے میر جملہ ہوتے ہی باغیوں اور سرکشوں کو زیر کیا اور سواری راؤ برہمن کو کاروبارِ سلطنت سے بے اثر کر دیا ۱۰۱۱ھ میں جب آگرہ اور دہلی کے مغل سوداگر حالتِ نشہ میں شاہی محل میں بغیر اجازت کے دیکھنے کے لئے داخل ہوئے اور بادشاہ نے علی آقا کوتوال کو حکم دیا کہ انھیں باہر نکال دیا جائے تو شہر کے اوباشوں کو موقع مل گیا اور انھوں نے ان سوداگروں کے مال و اسباب کو لوٹنا شروع کیا۔ اس ہنگامۂ عظیم کو محمد امین نے بڑی ترکیب سے فرو کیا اس اثناء میں محمد امین کا اثر بہت بڑھ گیا تھا جس کی وجہ سے دکنی امراء نے بادشاہ سے ناخوش ہو کر اس کے بھائی خدا بندہ کو بغاوت کے لئے اکسایا لیکن اس بغاوت میں وہ ناکام ہوئے۔

۱۰۱۹ھ میں محمد امین نے بادشاہ کی ایک شاندار دعوت کی اور اپنے مکان کو رشکِ فردوس بنا کر پا انداز میں زربفت و اطلس اور مخمل و مشجر کے کپڑے بچھا دئے۔ جب بادشاہ تشریف لائے تو شاعروں نے قصیدے سنائے اور مطربوں نے نغمے۔ آخر میں محمد امین نے تیس۳۰ عربی گھوڑے بیس۲۰ ہاتھی اور بلور کا ایک مدور آئینہ جس کے اطراف قسم قسم کے جواہر نصب کئے ہوئے تھے ایک سونے کی زین جس پر جواہر کا کام کیا ہوا تھا، چودہ جلد خوش خط قرآن شریف اور دیگر قیمتی اشیاء بطور نذر پیش کئے اور طعام کے بعد قصہ خوانوں اور ندیموں کو پچاس ہزار ہون انعام میں دے بادشاہ نے چلتے وقت اپنے کندھوں سے زردوزی چادر نکال کر محمد امین کو عنایت کی ۱۰۱۸ھ میں پرتاب راؤ کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے محمد امین کو روانہ کیا گیا مگر وہ ناکام رہے اسی سال محمد قلی نے وفات پائی۔ ان کی وفات سے قبل ہی محمد امین نے شہر سے ملحق ایک عالی شان تالاب بنایا جو تالاب میر جملہ کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ اسی تالاب کے کنارے مشرق رویہ محمد امین کی ڈیوڑھی بھی تھی جو اپنی آرائش اور خوبی تعمیر کی وجہ سے مشہور تھی اور جس میں آخر زمانے تک بڑے بڑے سفراء اور معزز مہمان ٹھیرائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ محمد امین نے موسیٰ ندی کے کنارے ایک امین باغ بھی بنایا تھا جو اس عہد کا ایک نہایت پر فضا مقام تھا اس امین باغ میں آج کل سرکاری زچگی خانہ ہے۔

جب سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا تو مرزا محمد امین نے حج کو جانے کے لئے رخصت حاصل کی اور اپنی پوری دولت کے ساتھ گولکنڈے سے نکل کر بیجاپور کا رخ کیا۔ وہاں ان کی خاطر خواہ آؤ بھگت نہیں ہوئی تو وہ ایران چلے گئے اور گولکنڈہ سے لائے ہوئے ایک لاکھ روپے کے جواہر شاہ عباس کی خدمت میں پیش کئے۔ لیکن شاہ عباس میں بھی انھیں محمد قلی جیسی خوبیاں نظر نہ آئیں تو دوبارہ ہندوستان آکر ۱۰۲۰ھ میں جہانگیر کے دربار میں ملازمت اختیار کی اور پچاس ہزار روپے کے جواہر نذر کئے۔ وہاں بھی انھیں وہ عروج حاصل نہ ہو سکا جو گولکنڈہ میں نصیب ہوا تھا البتہ میر بخشی کے خطاب سے سرفراز ہوئے آخرکار ۱۰۴۶ھ میں شاہجہاں کے عہد میں لقوہ اور فالج سے انتقال کیا۔



غواصی ملک الشعرائے گولکنڈہ



مرزا محمد امین میر جملہ

# جہ افضل ترک

سلطان محمد قطب شاہ نے ۱۰۲۵ھ میں منصب سرخیلی پر سرفراز کیا تھا اور چار لاکھ ہونوں کی مشروط بخدمت جاگیر دی تھی لیکن آخر زمانہ میں ۱۰۳۰ھ میں بادشاہ نے ان کو معزول کرکے مرزا روز بہان کو سرخیل بنایا اور ان کی جاگیر میر محمد تقی طباطبا کو عنایت کردی تھی۔

اس واقعہ کے دو ماہ بعد ہی جب سلطان عبداللہ تخت نشین ہوئے تو منصور خاں میر جملہ نے مرزا روز بہان کو معزول کردیا خواجہ افضل پھر دربار میں جگہ پائے۔ اور بعد کو علامہ ابن خاتون کے ساتھ مل کر اتنا اثر پیدا کیا کہ ۱۰۳۵ھ میں شاہ محمد پیشوا کو معزول کرادیا۔ لیکن علامہ ابن خاتون کی رمضان ۱۰۳۵ھ میں منصب پیشوائی پر سرفرازی کے بعد خواجہ افضل بھی زیادہ دن تک پائے تخت میں نہ رہ سکے۔ چنانچہ مرتضیٰ نگر اور مچھلی پٹن کے عامل میرابوالمعالی دیانت خاں کو جب وہاں کی رعایا نے مار دیا تو بادشاہ نے خواجہ افضل ترک کو وہاں کی حکومت تفویض کرکے اواخر ۱۰۳۵ھ میں دارالسلطنت سے روانہ کیا۔ خواجہ افضل پورے تزک واحتشام اور فوج کے ساتھ مرتضیٰ نگر کی طرف روانہ ہوئے اور راستہ میں جہاں کہیں چوروں اور اوباشوں کا پتہ چلا سب کو نہ تیغ کیا اور اس سمت کے چار سو عیار اور طرار چوروں کو یک وقت گرفتار کرلیا اور راستوں پر جگہ جگہ ان کو سولی پر لٹکا دیا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور سرکشوں کی تنبیہ ہوسکے۔ غرض اس علاقہ کو خس وخاشاک سے پاک کرکے قحط کے زمانہ میں بھی خلائق کی حفاظت اور غلہ رسانی وغیرہ کا بڑا اچھا انتظام لیا۔

ابھی خواجہ افضل مرتضیٰ نگر کے صوبہ دار ہی تھے کہ ۱۰۳۶ھ میں باقر خاں صوبہ دار بنگالہ نے قطب شاہی علاقہ کسیمکوٹ پر حملہ کرکے کچھ حصے اپنے قبضہ میں کرلئے وہاں کے عاملوں اور فوجوں نے بادشاہ سے مدد طلب کی۔ بادشاہ نے خواجہ افضل کے یہاں آدمی دوڑائے اور ان کو بسرعت تمام پایۂ تخت پہنچنے کا حکم دیا۔ چنانچہ خواجہ افضل اسی فرسخ کے فاصلہ کو ایک مادیا گھوڑے پر صرف تین دن میں طے کرکے بارگاہ بادشاہی میں پہنچے۔ بادشاہ بہت خوش ہوئے اور ۔ رجب ۱۰۳۶ھ کو تشریف وخلعت خاص اور گھوڑے اور نقرئی زین ولگام سے سرفراز کیا اور باقر خاں کے مقابلہ پر جانے کا حکم دیا شجاع الملک شیر محمد خاں، ورچند دکنی سرداروں، حوالہ داروں، اور ہزار سواران خاصہ خیل کو ان کے ساتھ کیا۔ اور تمام حکام کسیمکوٹ کو اطلاع کرادی کہ سب خواجہ افضل کی مددگری اور اس کے مطیع ومنقاد رہیں اس کے علاوہ میاں حسینی حوالہ دار دروازہ شیہ علی بادشاہی کو راجمندری روانہ کیا تاکہ خواجہ افضل کے لشکر کے لئے غذا پانی کا پہلے سے انتظام کررکھے، چنانچہ خواجہ افضل ایک زبردست لشکر کے ساتھ کسیمکوٹ کی طرف روانہ ہوئے اور پہلے راجمندری پہونچے راستہ میں ہر جگہ خواجہ کی فوج میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ مرتضیٰ نگر میں خواجہ افضل کا جو لشکر تھا وہ بھی مدد کو آیا اور دریائے کرشنا کو عبور کرکے مصطفیٰ نگر کے پاس خواجہ کے شاہی لشکر سے مل گیا۔ اس عظیم الشان لشکر کے ساتھ خواجہ افضل کسیمکوٹ پہنچے تو معلوم ہوا کہ باقر خاں کو شاہجہاں نے واپسی کا حکم دیا ہے اور جتنے علاقوں پر قبضہ کرلیا گیا تھا ان کو چھوڑ کر باقر خاں کی فوجیں واپس ہورہی ہیں اس طرح لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اور خواجہ افضل کو چندروز راجمندری میں قیام کرنے کا حکم دیا گیا۔

خواجہ افضل ابھی راجمندری میں تھے کہ مرہری پنڈت سپہ سالار عادل شاہی نے ۱۰۴۱ھ میں قطب شاہی علاقہ پر حملہ کیا اور قلعہ کولاس کا محاصرہ کرلیا۔ اس وقت اگرچہ بادشاہ نے دوسرے امرا کو مقابلے کے لئے روانہ کردیا تھا تاہم اعظم الامرا خواجہ افضل کو پورے لشکر اور انتظام کے ساتھ راجمندری سے گولکنڈہ آنے کا حکم دیا۔

خواجہ افضل اس اثنا میں سخت بیمار ہوگئے تھے اور اسی حالت میں وہ حیدرآباد آئے لیکن جانبر نہ ہوسکے چنانچہ ۱۰ جمادی الاخر ۱۰۴۱ھ کو

حیدرآباد میں وفات پائی۔

خواجہ افضل سلطان محمد کے زمانہ میں نو سال خدمت سرخیلی پر اور سلطان عبداللہ کے زمانہ میں چھ سال سپہ سالاری صوبہ داری اور وزارت کے عہدہ پر مامور رہے اور تجمل و ثروت میں اپنے امثال و اقران میں ممتاز تھے اسی لئے حدیقہ میں ان کو اعظم الامرا لکھا ہے۔ ان کے ملازمین جن میں ایک ہزار ترکی و عرب و عجمی سوار تھے یولچی بیگ کے سپرد کئے گئے۔ اور ان کی جاگیہ مرتضیٰ نگر میر فصیح الدین محمد تفرشی کو سرفراز کی گئی۔

## مرزا روزبہان اصفہانی

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے عمائدین سلطنت سے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی وفات سے ۲ ماہ قبل ربیع الاول ۱۰۳۵ھ میں ان کو خواجہ افضل ترک کی معزولی کے بعد سرخیلی کے منصب ارجمند پر سرفراز کیا تھا لیکن سلطان عبداللہ کی تخت نشینی کے بعد جب خانم آغا اور منصور خاں حبشی کا دربار پر اثر جم گیا تو مرزا روزبہان کو معزول کر کے مجلسیان حضور کے زمرہ میں شریک کر دیا گیا۔ لیکن جب منصور خاں میر جملہ کا انتقال ہو گیا اور علامہ ابن خاتون پیشوائے سلطنت اور مختار دربار ہو گئے تو انھوں نے پھر مرزا روزبہان کے لئے کوشش شروع کی اور بادشاہ کے سامنے ان کی بڑی تعریف کی چنانچہ ۳ ربیع الاول ۱۰۴۱ھ کو مرزا روزبہان دوبارہ منصب سرخیلی پر مامور کئے گئے اور انھوں نے پوری قوت کے ساتھ فوج اور رعایا کے معاملات سرانجام کرنے شروع کئے۔ لیکن بادشاہ کو ان پر اعتبار نہ آیا اور وہ ہمیشہ ان کو شبہ کی نظر سے دیکھتے رہے۔ آخر کار بد دیانتی کے الزام میں منصب سرخیلی سے ۱۸ صفر ۱۰۴۲ھ میں ہٹائے گئے اور میر فصیح الدین محمد کو سرخیل بنایا گیا۔

## عین الملک منصور خاں حبشی

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے اکابر سلطنت سے ہیں، حوالہ داری لشکر رکاب خانہ کے علاوہ وزارت عین الملکی پر مامور تھے۔ اور بادشاہ اور ان کی والدہ کے مزاج میں درخور رحاصل تھا۔ چنانچہ جب بادشاہ مرض موت میں مبتلا ہوئے تو ان کے علاج کے بارے میں اطبائے ہند اور اطبائے عراق کے مابین اختلاف پیدا ہو گیا۔ بادشاہ کی والدہ کا خیال تھا کہ اطبائے ہند علاج کریں کیونکہ جو مزاج ہندوستان کی آب و ہوا میں پرورش پاتے ہیں ان کے لئے مناسب ہے کہ ہندوستانی طبیبوں کا علاج کرایا جائے۔

اگرچہ والدۂ بادشاہ کی اس رائے سے اکثر امرائے دربار کو اختلاف تھا لیکن منصور خاں کی تائید کی وجہ سے ہندوستانی اطبا نے علاج کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت منصور خاں کتنے صاحب اقتدار تھے۔

سلطان محمد کے انتقال کے بعد سلطان عبداللہ کو تخت نشین کرانے میں اور پائے تخت میں انتظام اور امن و امان قائم رکھنے میں منصور خاں نے بڑا حصہ لیا۔ اس وقت بادشاہ کی کم عمری کی وجہ سے سلطان محمد کی والدہ ہی کاروبار سلطنت میں دخیل تھیں اور انھوں نے زور دے کر منصور خاں کو میر جملہ بنایا۔ نظام الدین احمد مولف حدیقۃ السلاطین چونکہ علامہ ابن خاتون کے طرف داروں میں سے تھے اس لئے انھوں نے اپنی تاریخ میں منصور خاں کی خدمات کے اعتراف میں بخل سے کام لیا ہے اور جگہ جگہ ذم کا پہلو نمایاں کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ منصور خاں اور ملک یوسف وغیرہ اس وقت کے اُن ملکی امرا اور جاں نثاران سلطنت سے تھے جن کو علامہ ابن خاتون اور دیگر اجنبی امرا اپنے راستے میں حائل سمجھتے تھے اور چونکہ سلطان عبداللہ کی طبیعت بہت کم نمو واقع ہوئی تھی اس لئے انھوں نے با اقتدار امرائے عراق کے زیر اثر اپنے قدیم امرا اور خدمت گذاروں کو بہت جلد بے اثر کر دیا۔

منصور خاں کی میرجملگی کا پہلا اثر یہ پڑا کہ مرزا روزبہان اصفہانی جن کو صرف دو ماہ قبل سلطان محمد نے خواجہ افضل ترک کو معزول کر کے سرخیل بنایا تھا اپنے عہدے سے معزول ہوگئے۔ منصور خاں نے برہمنوں کو بھی برسرکار کیا کیونکہ نظام الدین احمد مورخ کا بیان ہے کہ خود میرجملہ کو لکھنا نہیں آتا تھا۔ تاہم اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ منصور خاں سپاہیوں پر خوب نظر رکھتے تھے اور انھوں نے اس طبقہ کی حالت کو درست کر دیا۔ اگرچہ غیر ملکیوں کے ساتھ ان کا سلوک اچھا نہ تھا۔

منصور خاں نے وزارت پناہ خواجہ افضل ترک کو پھر سے ایک لاکھ ہون تنخواہ کی جاگیر پر سرفراز کر کے امرائے عظام کے طبقہ میں شامل کر دیا۔ منصور خاں نے اس شان و شوکت سے میرجملگی کی خدمت انجام دی کہ دارالسلطنت میں ان کے غلاموں کا بھی رعب بیٹھا ہوا تھا اور بڑے بڑے عہدہ دار بھی ان سے ڈرتے تھے چنانچہ حدیقہ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ۹ محرم ۱۰۳۰ھ کو دلوان کے ایک حبشی غلام نے میدان دربار میں شب چراغاں کا اہتمام کرتے وقت قاسم بیگ کوتوال کے ساتھ بے ادبی کی لیکن چونکہ میرجملہ کا آدمی تھا قاسم بیگ کچھ نہ کر سکے اور رنجیدہ ہو کر گھر بیٹھ رہے اور منصب کوتوالی سے استعفا دے دیا۔

نظام الدین احمد کا بیان ہے کہ حجابۃ الملک منصور خاں قاسم بیگ کوتوال اور شاہ محمد منشی دونوں کو ہٹا کر ملا محمد تقی کو خدمت کوتوالی اور میر سید شرافی کو پیشوائی دلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اول الذکر کو مچھلی پٹن سے اور موخر الذکر کو دہلی سے بلا بھیجا تھا۔ اور محمد تقی تو حسب الطلب حیدرآباد پہنچ بھی گئے اور منصور خاں نے کئی بار کوشش کی کہ بارگاہ شاہی میں پیش کر کے منصب کوتوالی دلاویں لیکن بادشاہ پر علامہ ابن خاتون کا اثر پڑنا شروع ہو چکا تھا وہ انجان ہونے گئے اور آخر کار قاسم بیگ کی جگہ پر ملا محمد تقی کو معمور کرنے کے بجائے حسن بیگ نائب کوتوال کو خدمت کوتوالی پر ترقی دے دی۔ اب جو محمد تقی کو مایوسی ہوئی تو میرجملہ نے اپنی پیشی میں مقرر کر کے میرجملگی کا کام جو کوتوال کے کام سے ارفع ہے ان کے سپرد کر دیا اس طرح ۱۰۳۱ھ میں جملہ امور دیوانی میں ملا تقی نائب میرجملہ ہو گئے اور ایک سال تک اس خدمت کو انجام دیا۔

آغاز محرم ۱۰۳۲ھ میں منصور خاں نے دو سال سات مہینے اور چند روز میرجملگی کی خدمت انجام دے کر یکایک انتقال کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ منصور خاں کی وفات کے بعد چھ سال دس مہینے تک منصب میرجملگی پر کوئی بھی فائز نہ ہو سکا آخر کار ۹ شوال ۱۰۳۸ھ میں علامہ ابن خاتون نے منصور خاں کی جگہ لی۔ اس اثنا میں منصور خاں کی خدمات کو تین چار امرا میں تقسیم کر دیا گیا تھا یعنے ملا محمد تقی سرخیل، آدم خاں عین الملک اور پسر منصور خاں حوالہ دار فوج رکاب خانہ وغیرہ۔

## شریف الملک ملا محمد تقی

سلطان محمد قطب شاہ کے دور میں بندر مچھلی پٹن کے حوالہ دار تھے۔ سلطان عبداللہ کے دور میں جب منصور خاں حبشی میرجملہ نے اقتدار تمام حاصل کیا تو ان کا خیال تھا کہ قاسم بیگ کوتوال کی جگہ ملا محمد تقی اس خدمت پر سرفراز ہوں چنانچہ ۱۰۳۲ھ میں ملا محمد کو لکھا کہ پایہ تخت چلے آئیں۔ ملا بہت خوش ہوئے اور ایک ہاتھی پانچ ہزار ہون نقد اور دیگر تحف و ہدایا کے ساتھ محرم ۱۰۳۳ھ میں حیدرآباد آئے۔ منصور خاں ان کی آمد سے بہت خوش ہوئے اور چاہتے تھے کہ بادشاہ ان کو منصب کوتوالی پر سرفراز کریں چنانچہ تین مہینوں تک برابر دولت خانۂ عالی میں ساتھ لے جاتے رہے اور ایک دفعہ تو زر نقد ہاتھی اور دیگر تحفے بادشاہ کی خدمت میں پیش بھی کر دئے مگر بادشاہ نے ملا تقی کو باریاب نہ کیا بادشاہ یہ چاہتے تھے کہ ملا تقی بجائے کوتوالی کے منصور خاں کے قائم مقام بن کر منصب سرخیلی انجام دیں اور اسی لئے وہ ٹال رہے تھے تاکہ کوتوالی کا مستقل انتظام ہو لے تو ملا محمد تقی کو

باریاب کرکے سرخیل بنادوں آخرکار ۷ ربیع الاول ۱۰۳۶ھ کو بادشاہ نے حسن بیگ نائب کوتوال کو حیدرآباد کی کوتوالی کل پر سرفراز کردیا۔

اب منصورخاں بڑے پریشان ہوئے لیکن انھوں نے ملا محمد تقی کو اپنے ہی ساتھ رکھ کر میرجملگی کے جملہ مہمات کو ان کے سپرد کردیا اس طرح ملا محمد تقی کوتوالی سے زیادہ اہم اور بڑے عہدہ کا کام انجام دینے لگے۔ انھوں نے ایک سال تک منصورخاں کے نائب کی طرح دیوانی کی خدمات اور میرجملگی کے جملہ امور انجام دئے بادشاہ بھی یہی چاہتے تھے۔

محرم ۱۰۳۸ھ میں منصورخاں نے یکایک انتقال کیا تو ان کی جگہ کے لئے بہت سے امراء نے کوشش کی اور نذرانے پیش کرنے شروع کئے لیکن ملا محمد تقی پہلے ہی سے امور دیوانی انجام دئے رہے تھے، منصورخاں نے بھی کئی بار ان کے کام کی تعریف کی تھی اور بادشاہ پران کی کاردانی کا سکہ بٹھا چکا تھا اس کے علاوہ اس دفعہ ملانے دوسروں کے نذرانوں سے زیادہ پیش کش دیا اس لئے بادشاہ نے انہی کو پسند کیا اور ۲۳ صفر ۱۰۳۸ھ کو منصب جلیل القدر سرخیلی پر سرفراز کیا۔ اس موقع پر دوسرے شاعروں کی طرح ملا نظام الدین احمد مولف حدیقہ نے بھی ایک قطعۂ تاریخ ملا کی خدمت میں پیش کیا تھا جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

| | |
|---|---|
| خسرو یوسف رخ جمشید جاہ | شاہ عبداللہ شاہ کامیاب |
| مولوی را بہر سرخیلی نمود | از میانِ جملہ اعیان انتخاب |
| تربیت بنمود اورا ہمچو مہر | تاکہ شد یاقوت سال باآب وتاب |
| عقل بہر منصبش تاریخ گفت | دائماً سرخیل بادا کامیاب |

سرخیل ہونے کے بعد ملا تقی نے بادشاہ کے مزاج سے کافی واقفیت پیدا کرلی اور جملہ مہمات دیوانی اور کل معاملات سلطانی پر ایسا قبضہ کرلیا کہ دوسروں کو دخل دینے کا موقع نہ دیا، خاص کر برہمنوں کے لئے رعایا پر ظلم وستم کرنے کا موقع نہ رہا۔ اور محاصل کی رقمیں اچھی طرح داخل خزانہ ہونے لگیں۔ چنانچہ صرف نارائن راؤ مجموعہ دار سے ایک سو تیس ہزار ہون وصول کرکے داخل خزانہ کئے گئے اور جو چودہری اور صاحبانِ جائداد منافق مغرور اور ظالم ہوگئے تھے ان کو قتل کرکے ان کی جائداد اور ذخیروں پر شاہی قبضہ کرادیا۔

ان خدمات کے صلہ میں بادشاہ نے ملا کو شریف الملک کا خطاب عطا کیا اور وہ قلمدان مرصع جو مرزا محمد امین میرجملہ کے بعد سے کسی کو مرحمت نہیں کیا گیا تھا ملا شریف الملک کو عنایت کیا گیا۔ اس اثنا میں مغلوں کے حملۂ دکن کی خبریں مشہور ہونے لگی تھیں اس لئے سلطان نے شریف الملک کو پچاس ہزار ہونوں کی جاگیر دی تاکہ ایک لشکر تیار رکھے اور فیل خانۂ خاص سے چند مست ہاتھی بھی عنایت کئے۔ اس طرح سرخیلی اور سرداری ایک ہی جگہ جمع ہوگئی۔ ملانے بہت جلد دکنیوں، عربوں اور پٹھانوں کی ایک فوج تیار کرلی اور میدان دلکشائے دادمحل میں لاکر بادشاہ کو دکھادی۔ بادشاہ بہت خوش ہوئے اور ملا کے مدارج میں اور بھی اضافہ کردیا۔ اس طرح شریف الملک کی عزت و وقعت اور اثر و رسوخ اور بھی بڑھ گیا۔

جب شریف الملک کی ذات میں دو عہدے یعنے سرداری اور سرخیلی جمع ہوگئے تو مہمات دیوانی اور ضبط و ربط امور مملکت کے ساتھ ساتھ شہسواری اور سپہ گری کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی۔ چنانچہ وہ روزانہ شام کا وقت ندی محل کے برابر رودِ موسیٰ کے کنارے وسیع میدان میں کمان داری اور چوگان بازی میں گذارتے تھے۔ ایک وقت گھوڑے پر سے گرے اور چوٹ کھائی لیکن تکلیف میں کچھ کمی ہوئی تھی کہ آخر شعبان ۱۰۴۰ھ میں



ملا نظام الدین احمد
مورخ گولکنڈہ

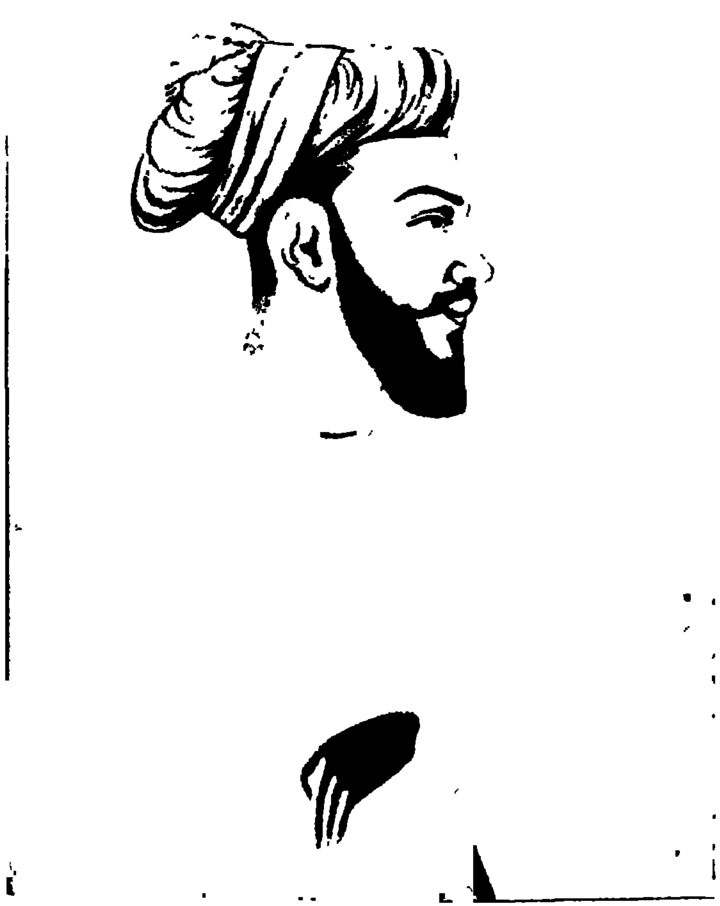


علامہ شیخ محمد ابن خاتون
پیشوائے گولکنڈہ

گولکنڈے کے سپہ سالار



موسی خاں



خیرات خاں

علی باغ میں جشن رمضان میں شرکت کی اور غذا میں بے احتیاطی کی وجہ سے ہیضہ و اسہال کا مرض لاحق ہوگیا اور اس حالت بیماری میں رمضان بھر صبح و شام بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اس حاضری میں اور مسلسل کھڑے رہنے کی وجہ سے طبیعت اور بگڑتی گئی آخرکار رمضان کی عید کے دن جب بادشاہ نے دربار کیا اور ملا شریف الملک عصر تک برابر کھڑے ہو کر لشکر اور رعایا کے معروضے پیش کرتے رہے تو طبیعت بالکل بگڑ گئی اور اس روز کے بعد دربار کو آنا نصیب نہ ہوا، حکیم اسمعیل گیلانی اور دیگر ہندوستانی طبیبوں نے علاج کیا بادشاہ نے اپنے غلام حسن علی خاں کو پرسش احوال کے لئے بھیجا اور آخر میں اپنے خاص طبیبوں کو بھی علاج کرنے کے لئے حکم دیا لیکن پیمانہ حیات پُر ہو چکا تھا ملا محمد تقی شریف الملک نے ۱۹ شوال ۱۰۴۰ھ میں انتقال کیا

انھوں نے دو سال آٹھ ماہ بڑے کر و فر اور اثر و اقتدار کے ساتھ حکومت کی اور بادشاہ کی خیر خواہی اور آداب عبودیت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ان کے انتقال کا بادشاہ کو بھی صدمہ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ملا شریف الملک کو اولاد نہ تھی۔ کیونکہ بادشاہ نے ان کی بیوہ اقربا اور ہمشیریوں کے حال پر خاص نوازشیں کیں اور ان کو پورے سامان کے ساتھ عراق جانے کی اجازت دی

# ابن خاتون

شیخ محمد نام ابن خاتون طوسی عاملی کے بیٹے اور شیخ بہائی کے بھانجے تھے سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے علماء میں سے ہیں ان کے علم و فضل کی وجہ سے بادشاہ نے ان کو منشی الملک اور دبیر سلطنت بناکر بارگاہ سلطانی کے مقربان خاص میں شامل کرلیا تھا جب سلطان محمد قلی کی وفات کے بعد شاہ عباس صفوی کا سفیر حسین بیگ قبچاچی حیدرآباد آیا تو اس کی واپسی کے وقت بادشاہ نے ۱۰۲۴ھ میں علامہ شیخ محمد ابن خاتون کو بیش قیمت تحفے دے کر اس کے ساتھ ایران کو روانہ کیا جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور وہ تقریباً دس سال مقیم رہے اور پھر جب واپس آنے لگے تو شاہ ایران نے ان کے ساتھ قاسم بیگ سپہ سالار مازندران کو روانہ کیا اور ۱۰۳۵ھ میں اس وقت حیدرآباد واپس ہوئے جب کہ سلطان محمد قطب شاہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ سلطان عبداللہ نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور اپنے پھوپا شاہ محمد ولد شاہ علی عرب شاہ پیرزادہ پیشوائے سلطنت کا نائب مقرر کیا۔ اور پیشوا کی طرح ان کو بھی اپنی مجلس میں بیٹھنے کی اجازت دی چونکہ یہ خدمت مشترک تھی اس لئے بادشاہ نے محمد رضا استرآبادی سے منصب دبیری لے کر دوبارہ ابن خاتون کو دبیر سلطنت بھی بنا دیا۔

ان دو خدمات جلیلہ کی وجہ سے ابن خاتون کی عزت و احترام میں بہت اضافہ ہوگیا اور انھوں نے دربار کے جملہ امور میں دخل پاکر اپنے توسط سے بہت سے لوگوں کو نوجوان بادشاہ کے مراحم خسروانہ سے فائدہ پہونچایا اس بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر شاہ محمد پیشوا ان سے کھٹکنے لگے اور دربار میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں ہونی شروع ہوئیں آخرکار رجب ۱۰۴۳ھ میں شاہ جہاں کا ایلچی شیخ محی الدین حیدرآباد آیا تو بعض باتیں ایسی ہوئیں کہ بادشاہ شاہ محمد پیشوا سے بالکل ناراض ہوگئے اور ان کو معزول کرکے ۹ رمضان ۱۰۴۳ھ میں ابن خاتون کو پیشوائی کل سے سرفراز کیا اس خوشی میں ابن خاتون کے طرفدار علماء و فضلا اور شعراء نے مبارکباد کے قصائد اور قطعے لکھے جن میں سے ایک قطعہ حدیقۃ السلاطین کے مصنف نے لکھا تھا جو درج ذیل ہے ؎

شہ یوسف رخ محمد حشمت　　　　کہ حاتم می کند از وے گدائی
ز روئے مرحمت کردہ تکفل　　　　محمد را بصدر پیشوائی
سلامان شہ جہان ملک دولت　　　　کہ بود ابتر ز آفات سمائی
متاع فضل و دانش بود کاسد　　　　کنون بگرفت در عہدش روائی
جہاں معمور گردیدہ بہ انساں　　　　کہ شد محو از خلائق بے نوائی
بالہام آمد این مصراع تاریخ　　　　محمد یافت از حق پیشوائی

پیشوا ہونے کے بعد ہی علامہ ابن خاتون نے شیخ محی الدین ایلچی شاہ جہاں کو واپس کردیا اور کچھ ایسی ترکیب کی کہ وہ شاہ جہاں کے پاس معتوب قرار پایا۔

ابن خاتون اگرچہ بہت صاحب ثروت تھے اور نواب علامہ کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے لیکن ساتھ ہی مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف بھی جاری تھی بے حد علم دوست تھے اور روزانہ ان کے مدرسہ میں بڑے بڑے علماء و فضلا جمع ہوتے اور علوم معقول و منقول پر مباحثے اور مذاکرے کیا کرتے۔ منگل کو جو قطب شاہی سلطنت میں چھٹی کا دن ہوتا ان کے یہاں شعراء جمع ہوا کرتے اور شعرائے متقدمین کے کلام پر مذاکرہ کے علاوہ طرحی غزلوں کا مشاعرہ بھی کرتے تھے۔

ابن خاتون خود بھی بہت بڑے مصنف تھے شرح ارشاد، ترجمہ کتاب الاربعین، حاشیہ جامع عباسی ان کی تصانیف ہیں جامع عباسی کی تکمیل بھی انہی نے کی تھی۔ پیشوائی عہدہ کے لحاظ سے بلکہ مذہبی امور کے بھی ذمہ دار تھے۔ چنانچہ جب ۱۰۴۰ھ میں حیدرآباد میں بڑا زبردست قحط ہوا تو شہر کے تمام علماء و فضلاء و اتقیا سہ روزہ روزہ رکھ جمعہ کی صبح میں پابرہنہ علامہ ابن خاتون کے یہاں پہونچے اور ان کے ساتھ نماز استسقاء کے لئے شہر سے باہر نکل کر موسیٰ ندی کے کنارے جمع ہوئے اور بعد نماز دعا پڑھی۔ آخر میں ابن خاتون نے صدر مجلس میں بیٹھ کر اشرفیوں کی سفید اور لال تھیلیاں بادشاہ کی طرف سے تمام مستحقوں میں تقسیم کیں اور ہاتھیوں اور اونٹوں پر جو شے بادشاہ نے خیرات کے لئے روانہ کئے تھے وہ بھی تقسیم کردیئے بعد میں بادشاہ کی افزونی عمر کی دعا کرکے شہر کو مراجعت کی۔

اس عزت و احترام کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ ابن خاتون کے مخالفین برابر کام کررہے تھے چنانچہ جب بیجاپوری لوگ حیدرآباد آئے تھے تو ابن خاتون کا اثر کم ہوگیا اور ۱۳ جمادی الآخر ۱۰۴۲ھ کو پیشوائی خدمت سے معزول کردئے گئے اور میر محمد رضا استرآبادی پیشوا مقرر ہوئے اس زمانے میں ابن خاتون خانہ نشین ہوگئے لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد جب شہزادی کی پالکی بیجاپور روانہ ہوئی تو عبداللہ قطب شاہ پھر علامہ کی طرف متوجہ ہوئے اور جو کدورت پیدا ہوئی تھی دور ہوگئی چنانچہ اپنے ایک مقرب خاص کو طلائی پاندان دے کر علامہ کے یہاں روانہ کیا اور چند روز کے بعد خود ان کو طلب کرکے نوازش خاص کا اظہار کیا اور صدر الشریعت صدر جہاں کی جگہ ان کے بیٹھنے کے لئے معین کی اور سلطنت کے جملہ امور کے متعلق پہلے سے زیادہ مشورہ لینا شروع کیا۔ آخر کار ابن خاتون کو ۹ شوال ۱۰۴۳ھ کو علامۃ الملکی کا خلعت حاصل ہوا۔

(باقی آئندہ)

سید محی الدین قادری زور



ابن نشاطی — شاعر گولکنڈہ

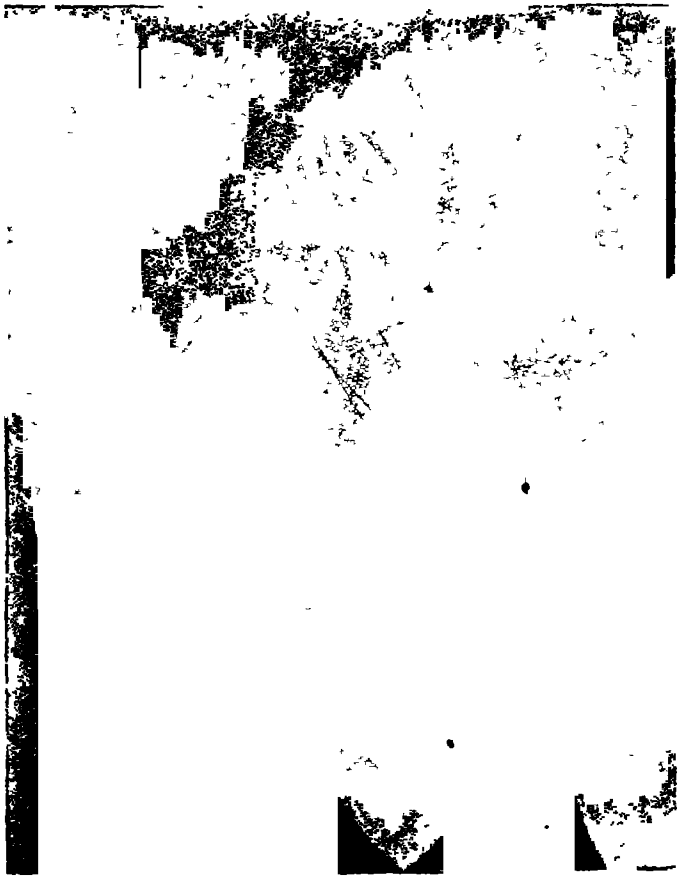


محمد سعید میر جملہ گولکنڈہ

# گولکنڈے کے صوفیائے کرام



سید شاہ راجو



شاہ میر محمود

# ملک الشعراء غواصی

غواصی کی تاریخ ولادت، وفات ابھی تحقیق طلب ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا اور محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں شاعری شروع کی۔ اس کی ابتدائی زندگی غربت میں بسر ہوئی سرکاری ملازمت اس کی گذر اوقات کا ذریعہ تھی عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی سے اس کے دن پھرے۔ شاہی دربار میں رسوخ حاصل ہوا اور رفتہ رفتہ ملک الشعرا کے درجہ تک پہنچا۔ امور سلطنت میں بھی غواصی کو دخل تھا چنانچہ ۱۰۴۵ھ میں شاہی سفیر کی حیثیت سے بیجاپور بھیجا گیا۔ اس کی آخری زندگی پھر ایک مرتبہ تاریکی میں نظر آتی ہے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ سلطان عبداللہ کے زمانے میں اس کا انتقال ہوا۔

غواصی ایک قادر الکلام شاعر تھا اس کی درباری حیثیت نے اس کی شاعری کو شہرت دی۔ یہاں تک کہ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اس عہد کے شعراء میں سے صرف غواصی کا ذکر کیا ہے۔ سلطنت گولکنڈہ کا آخری ملک الشعراء غواصی ہے۔

اس وقت تک علاوہ چیدہ چیدہ غزلوں اور مرثیوں کے غواصی کی صرف دو مستقل تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ مثنوی 'سیف الملوک و بدیع الجمال' اور 'طوطی نامہ'۔ دونوں اتفاق سے فارسی کے ترجمے ہیں۔ غواصی اپنے آپ کو فن شعر میں اس قدر کامل خیال کرتا ہے کہ دوسرے کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس تعلی اور ہمہ دانی کا ثبوت کوئی ایسی پیداوار سے نہیں ملتا۔ البتہ ان ترجموں میں اس نے اپنی پوری قوت صرف کی ہے اور ان کو اپنا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب اترا۔ اس کی پرگوئی کا ثبوت یہ ہے کہ مثنوی سیف الملوک جو دو ہزار سے زاید اشعار کی نظم ہے صرف ایک مہینے کی قلیل مدت میں ختم ہوئی ہے۔ ان مثنویوں کے وہ حصے جو غواصی کی اپنی ... شان لئے ہوئے ہیں جن میں غضب کی روانی پائی جاتی ہے۔

غواصی کی زبان میں ہندی عنصر غالب ہے۔ مبالغہ بہت کم اور کلام سادہ اور تصنع سے پاک ہے۔ اسلوب بہ لحاظ عنوان بدلا جاتا ہے چنانچہ مکالمہ کے مقام پر سادگی اور سلالت اور مدح و منقبت میں بلند خیالی اور شاندار الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔

یہاں مثالاً غواصی کی دونوں مثنویوں سے چیدہ چیدہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

قلم کاف و نوں سے جو نکلیا بہار — سو پہلے بچن کوں کیا آشکار
بچن عرش کرسی پو تے رہائے ہیں — بچن آدمی کے بدل آئے ہیں
بچن تے سوالاں جواباں ہوویں — بچن تے حساباں کتاباں ہوویں
بچن تے ہوی فام نیکی بدی — بچن تے ہوئے منتہی مبتدی
بچن تے چلے دین و دنیا تمام — بچن کے ہیں محتاج سب خاص و عام
بچن غیب کے ہیں عجب جوہراں — بچن کے سو ہیں جوہری شاعراں

---

میر سعادت علی رضوی

# تاناشاہ کے ہندو دیوان

مادنا پنتلو اور اکنا پنتلو کے بارے میں مستند فارسی کتب میں کوئی مواد نہیں البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابوالحسن تاناشاہ کے وزراء تھے۔ کوئی فارسی تاریخ ایسی نہیں ہے جو ان کو بدکردار اور مذہبی ثابت کرتی ہو۔ تعجب کا مقام ہے کہ ان پر کسی کتاب میں بھی ان کی بدکرداری کا کہیں ذکر نہیں جس سے ان مورخوں کی رائے کی تائید ہوسکے۔ یورپی کمپنیوں کے مکاتیب سے ان کی زندگی پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ان کی رائے اس وجہ سے قطعی تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ یہ فریق متعلقہ بھی ہیں اور متعصب بھی۔ مقامی روایات، قصے کہانیاں ہی ہمارے وہ ماخذ ہیں جن سے ہم کچھ مستفید ہوسکتے ہیں۔ ان واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان وزراء کی زندگی کا مختصر تذکرہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے اور حتی المقدور اس امر کی کوشش کی جائے گی کہ ان کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو پیش نہ کیا جائے جو موجودہ مواد کی بنا پر مابہ النزاع بن سکے۔

---

## دیوان مادنا

اکنا، مادنا بھانوجی پنتلو کے فرزندان تھے۔ بھانوجی پنتلو ہنمکنڈہ کا عامل یا عہدہ دار تھا۔ اس نے اپنے چاروں بیٹوں کی عمدہ تعلیم و تربیت کا انتظام کیا تھا۔ اکنا اور مادنا ختم تعلیم کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے درمیانی عہد سلطنت میں حیدرآباد آئے۔ مرزا سید احمد نے ان کو اپنے محکمہ حساب میں ملازم رکھا تھا اور حالات کی ناموافقت کے باوجود وہ اپنی ان تھک محنتوں کی وجہ سے درجہ بدرجہ ترقی کرتے گئے اور ۱۶۶۶ء کے بعد مادنا سید مظفر سپہ سالار عبداللہ قطب شاہ کا پیشکار مقرر ہوا۔ اس طرح جب اس کو قلمدان وزارت سپرد کیا گیا تو یہ اس کے وسیع تجربوں کی بنا پر تھا نہ کہ کسی اور ذریعے سے۔

۱۶۷۲ء کے انقلاب میں مادنا نے سید مظفر سے کسی طرح کم حصہ نہ لیا تھا۔ سید مظفر اور موسیٰ خان علی الترتیب میر جملہ اور سرخیل مقرر ہوئے اور مادنا میر جملہ کا پیشکار مقرر ہوا۔ سید مظفر کی ہوس اقتدار نے اسے ایک ایسی مسلک اختیار کرنے کی ترغیب دی جس کے نتیجے سے بادشاہ حکومت کا برائے نام صدر رہ جاتا ہے۔ سید مظفر اہم معاملات میں بھی بادشاہ کا مشورہ نہیں لیتا تھا۔ اس سے علانیہ عداوت کی بو آتی تھی۔ ابوالحسن جیسے عاقل و مدبر حکمران سے یہ حرکت کب برداشت ہوسکتی تھی لیکن وہ کھلم کھلا اس کو بےدخل کر دینے پر بھی آمادہ نہ تھا اس لیے اس نے اکنا اور مادنا دونوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ان کے ذریعہ سید مظفر کے متعلقین اور فوج کے عہدہ داروں کو ہموار بنا کر ۱۶۷۴ء میں بھرے دربار میں سید مظفر کی نازیبا حرکتوں کا راز فاش کر دیا اور اس سے قلمدان وزارت لے کر مادنا کے سپرد کر دیا۔ اس طرح مادنا اپنی قابلیت، وفاداری اور تجربے کی بنا پر عہدہ وزارت عظمیٰ پر فائز ہوا۔ اور دربار شاہی سے سوریا پرکاس راؤ کا خطاب اور خلعت پایا۔ اکنا اپنے بھائی کا پیشکار بنا۔ اب ہم کو ان کی حکومت کے تین پہلوؤں سے واقف ہونا ہے۔ (۱) اندرونی مصلحت (۲) خارجی حکمت عملی (۳) [illegible]۔

اول الذکر کے بارے میں ان کے اصول حکومت کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات اب تک فراہم نہ ہوسکیں تاہم موجودہ قلیل معلومات کی بدولت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے پیشروؤں کی حکومت بہ لحاظ ان کے طریقہ کار سے ملک میں باضابطگی و امن قائم ہوسکا۔ تجارت و زراعت ان کی توجہ سے زراعت اور تجارت میں بہت ترقی ہوئی البتہ گولکنڈہ کے کرناٹکی مقبوضات میں جو بعد میں حاصل کئے گئے تھے نظم و نسق قائم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ قبل اس کے ہم کوئی قطعی رائے پیش کریں ہمارا اخلاقی فرض یہ ہوگا کہ ہم ملک کے ان حالات پر غور کریں جن کی وجہ سے ملک کو ناگفتہ بہ مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اورنگ زیب کی حکمت عملی کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ گولکنڈہ کو جس قدر



نیک نام خان — وزیر گولکنڈہ



سید مظفر — وزیر گولکنڈہ



مادنا دیوان گولکنده



[illegible]

غریب بنایا جائے کہ حکومت کا انتظام درہم برہم ہو جائے اور فوج منحرف ہو جائے۔ اس غرض سے انھوں نے آئے دن مطالبات میں اضافہ کرنا شروع کیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بادشاہ اپنے خانگی اور حرم کے جواہرات فروخت کر کے مطالبات پورے کرتے تھے۔ ملک و مالک کی محتاجی سے مادنا کی حکومت کے بنیادی اصول کا ایک پہلو مثلاً تخفیف میں ظاہر ہوا تو دوسرا عدیم المثال ضبط و تنظیم میں۔ گولکنڈہ کی تاریخ میں یہ دونوں بہت اہم اور نئی باتیں ہیں۔ تمام امرا اور عہدہ داروں کی تنخواہوں میں تخفیف کی گئی۔ اعلیٰ اور ادنیٰ تمام عہدہ دار اس قانون کی پابندی کرنے پر مجبور کئے گئے۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ تمام لوگ وزیر کے مخالف ہو گئے۔ مادنا کی غیر ہر دلعزیزی کا یہ ایک اہم اور بنیادی سبب ہے۔ اس واقعہ میں مادنا سے زیادہ قدیم امرا قابل الزام ٹھیرتے ہیں جو اپنی تنخواہ کا ایک قلیل حصہ حکومت کو دینے کے لئے تیار نہیں تھے اور ایک واویلا مچا کر حکومت کو کمزور بنا دیا واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مادنا کی عزت عوام میں زیادہ تھی ۱۶۸۶ء تک وزیر اعظم نے تین مرتبہ پورے ملک کا دورہ کیا ہے۔

دوسرا پہلو خارجی مصلحت کا ہے۔ دکنی آزاد سلطنتیں ذاتی تحفظ کیلئے مغلوں کے مقابلہ میں ایک دوسرے کی مدد کرلیتی تھیں چنانچہ عبداللہ قطب شاہ نے مرزا راجہ جے سنگھ کے خلاف علی عادل شاہ ثانی کی مدد کے لئے نیک نام خاں کے تحت بارہ ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادوں کی ایک جرار فوج روانہ کی مادنا اور ابوالحسن نے اس مصلحت کو برقرار رکھا اور مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے لئے ایک قومی محاذ بنا کر لیا یہ اسی کا انتہائی تدبر اور سیاست دانی ہے کہ اس نے سیواجی کے ہاتھوں کو دوستی اور اخوت کے رشتے سے باندھ دیا اور اس طرح سلطنت گولکنڈہ سیواجی کی تاخت و تاراجی سے بچی۔ اس دوراندیشی کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ اس نے قلعہ جات ونگل کنڈ دپٹی ورلنڈہ وغیرہ کو مستحکم بنوا کر ہر ایک کی حفاظت کے لئے بارہ ہزار سپاہیوں کو متعین کر دیا بیجاپور میں اپنے بھائی اکنا کو بحیثیت حاجب اس لئے مقرر کیا تھا کہ وہاں کی خارجی مصلحت کی رہبری کرے۔ مادنا نے ابوالحسن کو مشورہ دیا تھا کہ وہ قلعہ گولکنڈہ میں محصور نہ ہو جائے بلکہ کسی دوسرے کے قلعہ میں جائے اور بصورت ضرورت گولکنڈہ کو فوجی امداد روانہ کرے لیکن چونکہ شیخ منہاج کے مشورے کا زیادہ اثر تھا اس لئے اس مشورہ پر عمل نہیں کیا گیا "مادنا اور اکنا منصب کے لالچ میں ابوالحسن کو اورنگ زیب کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہتے تھے" یہ الزام تاریخ کے کسی طالب علم کے وہم و گمان میں بھی ٹھہر نہیں سکتا۔ یہ دونوں بھائی اورنگ زیب اور ابوالحسن سے بخوبی واقف تھے۔ فوجی تنظیم کے بارے میں بجائے اس کے کہ ہم اپنی رائے کا اظہار کریں مناسب ہوگا کہ واقعات کا اظہار کر دیا جائے جس سے ناظرین کو خود رائے قائم کرنے کا موقع مل سکے ۱۶۵۶ء میں گولکنڈہ کی فوج دکن کے مغل صوبہ دار کے لشکر کا مقابلہ ایک دن بھی نہ کرسکی اور قلعہ گولکنڈہ مغل گولہ باری کی تاب نہ لاسکا۔ لیکن ۱۶۶۰ء اور ۱۶۷۶ء میں شہنشاہیت کی ساری قوت ملکھیڑ کے میدان میں تین مہینے تک روکی گئی اور تمام تاریخیں گولکنڈہ کی فوج کی بہادری کے کارناموں سے بھری پڑی ہیں۔ اگر محمد ابراہیم باغی نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ مغلوں کو ملکھیڑ کے میدان میں ایسی شکست فاش ہوتی کہ مغل پھر ادھر کا رخ نہ کرتے محاصرۂ گولکنڈہ سے ہر شخص واقف ہے ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ناظرین اپنی ذاتی رائے قائم کرسکتے ہیں۔

مادنا پر ظالم اور متعصب ہونے کا جو الزام لگایا گیا ہے وہ شہنشاہی اغراض کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ گولکنڈہ پر حملہ کرنے کا ایک حیلہ ہے۔ "مآثر" پر یہ واقعہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مغل مدبر سے مسعود خاں اور شرزہ خاں کے بارے میں بھی بیجاپور میں یہی مصلحت اختیار کی گئی تھی مختصر یہ کہ ۱۶۸۶ء میں اعیان سلطنت نے سازش کی اور ان کو قتل کرا دیا۔ جمشید نامی ایک غلام نے چند اور دوسرے غلاموں کے ساتھ ان کے سر تن سے جدا کر کے شہزادہ شاہ عالم بہادر کے پاس روانہ کئے حرم سے سروما اور جانی بی بی نے اس سازش میں زیادہ حصہ لیا ہے۔

تنخواہ وغیرہ ان کے ساتھ ان کو بہادر خاں کے ذریعہ قلعہ اورنگ زیب کے پاس روانہ کیا جہاں وہ ہاتھی کے پیروں تلے روندے گئے ۔

---

# اکنا پیشکار

... بڑا بھائی تھا واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص غیر مہذب، متعصب اور منافق تھا ۔ مادنا کے وزیر اعظم بننے کے بعد یہ ان کا پیشکار مقرر ہوا ۔ ابو الحسن قطب شاہ کی ہلاکت کا موجب بھی اسی کے عہد سے سرلشکری پر ترقی پائی ۔ عہد نامہ بیجاپور کے بعد وہاں کا حاجب مقرر ہوا ۱۶۸۶ء میں بیجاپور سے واپس ہوا اور ۱۶۸۶ء میں مادنا کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔

اس نے ... اپنے عہدے کا ... اسلام میں خیانت بے مروتی سے کام لیا اور اس طرح گولکنڈہ کی آمدنی میں اضافہ ... ان کی اس کا مقابلہ کیا ... بھائیوں رستم راؤ اور یوسف لنگانہ نے بادشاہ کی کئی اہم خدمات انجام دیں خافی خاں رستم راؤ ... اسے ... سیف ... صاحب ... اسیف و غیرہ تھے یوسف لنگانہ انگریزوں کو ... ہونے نہ دیا اور بار بار زک دے کر گولکنڈہ میں انھیں ... رہنے ... دونوں ... بوسہ ... لیتے ہے اس کی اس کام میں مدد کرتے تھے ۔ اکنا کے ایک خط میں ... کی گئی کہ وہ یوسف لنگانہ ... اقتدار کو تسلیم کریں ۔ اس کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈہ کی بحری تجارت بھی تھی ۔ اور خود ان ... کے تجارتی جہاز تھے ... نامی ولندیزی رسالے میں ان کو ... شریر النفس بیان کیا گیا مگر اس کی تائید کسی اور تاریخ سے نہیں ہوتی ۔ ... معلومات کی بنا پر ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں روکھا پن زیادہ تھا ۔

... دونوں بھائیوں نے ملک و مالک کی بے لوث خدمت کی ہے لیکن ان کی محنت کا انھیں معاوضہ نہیں ملا ۔ انھیں حکومت کو ایسی ... سے ... کامیابی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ... دو سال تک جس قابلیت سے ان بھائیوں نے ملک کے اس ٹمٹماتے دیے کو گل ہونے ... وہ قابل تحسین ہے بہت ممکن ہے کہ مورخین ان کی حقیقت کے اظہار کی طرف متوجہ ہو کر ان الزامات کو غلط ثابت کر دیں گے ۔ اور زمانہ بتا دے گا کہ ملک و مالک کے بہی خواہ بھی نہ کبھی اپنی حقیقی قدر و منزلت حاصل کر کے رہیں گے ۔

کے، وی بھوپال راؤ

# عبدالرزاق لاری گولکنڈہ کے دروازے پر

اک تیغ زن ہے کہ کھڑا جھوم رہا ہے — زخموں سے لہو گر کے قدم چوم رہا ہے
تلوار بھی اک ہاتھ میں بل کھائی ہوئی ہے — معلوم نہیں کس کی قضا آئی ہوئی ہے
دروازے میں اک جان ہے اور لاشوں کے انبار — اور سامنے مقابل میں ہے تلواروں کی جھنکار
معلوم تھا اس کو کہ کوئی ساتھ نہ دے گا — بیٹا کو اٹھانے میں کوئی ہاتھ نہ دے گا
پھر اک دل لاری ہے کہ جو جان وفا ہے — یہ مطلع انوار وفا کان وفا ہے

اکبر وفاقانی



گولکنڈہ کا آخری سپہ سالار عبدالرزاق لاری زخموں سے بےہوش ہوکر گرنے سے پہلے

# سلطنتِ ابدمدّتِ آصفجاہی

اور

# سلاطینِ آصفی

سلطنتِ آصفیہ کا قیام تاریخِ ہند کا ایک نہایت درخشاں باب ہے۔ اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد کوئی شخصیت نواب نظام الملک سے زیادہ نمایاں نہ تھی جو منتشر قوتوں کو یکجا کر کے مرکزیت پیدا کرنے اور بڑی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ چنانچہ نواب نظام الملک نے اول تو سلطنتِ مغلیہ کی بقا، اس کی اصلاح اور استحکام کے لیے ممکنہ کوشش کی لیکن جب کامیابی کی صورت نظر نہ آئی تو انھوں نے حریفوں کو شکست دے کر سلطنتِ آصفیہ کی بنیاد ڈالی (۱۷۲۴ء)۔ نواب نظام الملک کے بعد جس شخصیت نے سینہ سپر ہو کر مشکلات کا مقابلہ کیا اور سلطنت کے لیے جو خطرات تھے ان کو دور کیا اور سلطنتِ آصفیہ کی صحیح معنوں میں تعمیر کی وہ بانیِ سلطنت کے فرزند آصفجاہِ ثانی نواب میر نظام علی خاں بہادر تھے۔

قیامِ سلطنتِ آصفیہ سے بہت سے فوائد حاصل ہوئے۔ اول تو دکن کی بدنظمی اور بدامنی کا خاتمہ ہو کر امن و امان اور عدل و انصاف کا دور شروع ہوا۔ دوم یہ کہ ملک میں زراعت کی سرسبزی، صنعت و حرفت کی ترقی اور تجارت کی گرم بازاری ہونے لگی۔ بالخصوص شاہانِ آصفیہ کی شہرۂ آفاق رواداری، لاثانی حب الوطنی، اپنی فیاضی اور عدیم المثال رعایا پروری نے ملک کی خوشحالی میں چار چاند لگا دئے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہانِ آصفی کی حکومت اپنی ساری رعایا پر نہ صرف منصفانہ رہی بلکہ ہمیشہ مشفقانہ و پدرانہ رہی ہے۔ انھوں نے قیامِ امن اور عدل و انصاف تک ہی خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ آثارِ قدیمہ کی حفاظت اور علوم و فن کی سرپرستی میں بڑا حصہ لیا۔ اور جدید قوم ساز سررشتوں کو قائم کر کے رعایا کی مادی، اخلاقی اور تعلیمی ترقی میں دن دونی اور رات چوگنی اضافہ کیا۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ وسط انیسویں صدی ہی سے یعنی سالار جنگ اول کی وزارت کے زمانہ سے ترقی اور اصلاح کا دور شروع ہو گیا تھا چنانچہ اس وقت مبارک عہدِ عثمانی میں جس تیز رفتاری کے ساتھ دکن میں ہمہ جہتی ترقی ہو رہی ہے وہ تاریخِ ہند میں عدیم المثال ہے۔ حیدرآباد جدید کی تعمیر کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی کا نام ہمیشہ دنیا تک یادگار رہے گا کہ زراعت، صنعت و حرفت، تجارت، تعلیم، تعمیرات اور حفظانِ صحت غرض ہر شعبۂ زندگی میں غیر معمولی چہل پہل ہے۔ نتیجہ یہ کہ اب دکن صرف مشرقی تمدن اور قدیم معاشرت ہی کا مرکز نہیں رہا ہے بلکہ اپنے عصری ترقیات کے اعتبار سے حیدرآباد مشرقی اور مغربی تہذیب کا گہوارہ اور قدیم و جدید تمدن کا سنگم بن گیا ہے۔ موجودہ ہمہ جہتی ترقی کی رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل نہیں کہ دورِ عثمانی میں حیدرآباد مستقبل اس کے بہمنیہ و قطب شاہیہ ماضی سے کہیں شاندار ہوتا جا رہا ہے۔

# نواب نظام الملک آصفجاہ اوّل بانیٔ سلطنت آصفیہ

## ( سنہ ۱۷۲۴ء تا سنہ ۱۷۴۸ء )

نواب نظام الملک آصفجاہ اول کا خاندانی سلسلہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ تک اور آگے حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ نواب نظام الملک کے دادا عابد خاں عہد شاہ جہاں میں ہندوستان آئے تھے اورنگ زیب کے زمانے میں منصب پنج ہزاری اور صدارت کل کے عہدہ پر فائز تھے گولکنڈہ کے محاصرہ میں گولے کے زخم سے شہید ہوئے۔

ان کے فرزند میر شہاب الدین خاں اورنگ زیب کے مشہور امراء میں سے تھے جن کو منصب ہفت ہزاری اور غازی الدین خاں فیروز جنگ کا خطاب عطا ہوا تھا۔ انھیں کے نامور فرزند نواب نظام الملک آصفجاہ اول تھے۔

ان کا اصلی نام میر قمر الدین تھا اور ولادت سنہ ۱۶۷۱ء میں ہوئی تھی۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں "چین قلیچ خاں" کا خطاب اور منصب پنج ہزاری سے سرفراز ہوئے بعد ازاں بیجاپور کی صوبہ داری پر فائز ہوئے تھے۔ غرض اورنگ زیب کی ان پر خاص عنایت تھی۔ حتیٰ کہ اورنگ زیب نے خاندانی حالات، وجاہت، بہادری، اور تدبر کی بنا پر ان کو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کام بخش کی لڑکی بیاہ دینی چاہی تھی لیکن مصلحت کی بنا پر نظام الملک نے اس کو پسند نہیں کیا۔

فرخ سیر کے زمانہ میں ان کو "نظام الملک بہادر فتح جنگ" کا خطاب ہفت ہزاری منصب اور دکن کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ چنانچہ سنہ ۱۷۱۳ء میں وہ بہ حیثیت صوبہ دار دکن اورنگ آباد آگئے تھے۔ لیکن اورنگ زیب کے نااہل جانشینوں کے زمانہ میں جب ملک کی حالت خراب ہوتی گئی اس وقت نظام الملک کو بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ وہ دکن سے مالوہ کی صوبہ داری پر بھیجے گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سارا ملک بادشاہ گر سیدوں ( سید حسین علی اور سید عبداللہ دونوں بھائیوں ) کے مظالم سے تنگ آگیا تھا۔ اس وقت سب کی نظریں نظام الملک کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس نازک موقع پر نواب نظام الملک نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ مخالفین سے سخت لڑائی ہوئی ( جس میں سید دلاور علی خاں اور سید عالم علی خاں نائب صوبہ دار دکن مارے گئے ) اس طرح نواب نظام الملک نے بزور شمشیر حیدرآباد اور برار وغیرہ کے علاقوں کو فتح کیا۔ غرض سیدوں کا خاتمہ کرکے نہ صرف محمد شاہ کو انھوں نے نجات دلائی بلکہ سارے ملک پر ایک بڑا احسان کیا۔ محمد شاہ نے اس کے صلہ میں آصفجاہ کا خطاب دے کر ان کو سلطنت دہلی کا وزیر مقرر کیا لیکن دربار کی حالت دیکھ کر انھوں نے اپنے بڑے فرزند غازی الدین خاں کو دہلی میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود حیدرآباد تشریف لائے۔

راستہ میں برار کے قریب ان کو مبارز الدین خاں سے لڑنا پڑا جس میں وہ مارا گیا۔ غرض یہ وہ زمانہ ہے کہ ملک میں فتنہ و فساد کا بازار گرم تھا۔ کوئی مرکزی طاقت موجود نہ تھی جو امن و امان قائم کر سکتی ہو۔ اول تو نواب نظام الملک نے سلطنت مغلیہ کو بچانے کی انتہائی کوشش کی لیکن جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو مجبوراً سنہ ۱۷۲۴ء میں سلطنت آصفیہ کی خود مختاری کی بنا رڈالی ( یہی وجہ ہے کہ حسب فرمان خسروی ہر سال ۲۹ رجب کو ابھی خود مختاری سلطنت آصفیہ کی یادگار میں عام تعطیل دی جاتی ہے ) لیکن اس کے باوجود سلطنت دہلی کی خیر خواہی اور وفاداری میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ چنانچہ سنہ ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تو وہ فوراً



نواب میر قمرالدین خاں قلیچ جنگ نظام الملک آصف جاہ اول



نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی

دہلی پہنچ گئے اور وہاں غیر معمولی جرات سے کام لے کر نادر کو لوٹ مار اور قتل عام سے روکا۔

دہلی سے دوبارہ دکن آکر انھوں نے مرہٹوں کا سدباب کیا اور دریائے تاپتی سے لے کر جنوبی ہند اور ارکاٹ تک سارے ممالک محروسہ میں امن و اماں قائم کیا۔ اس سے رعایا کو اطمینان نصیب ہوا۔ اس طرح سلطنت آصفیہ کے قیام سے ملک میں معاشی خوشحالی کا آغاز ہوا۔ نظام الملک بڑے رحمدل اور فیاض بادشاہ تھے۔ ان کو ہمیشہ اپنی رعایا کا بڑا خیال رہتا تھا۔ آخرکار ۱۷۴۸ء میں بمقام برہان پور انتقال کیا۔ چنانچہ دولت آباد میں ان کا مقبرہ موجود ہے۔

مختصر یہ کہ نواب نظام الملک نہ صرف اوائل اٹھارویں صدی کے سب سے بڑے قائد، زبردست سپہ سالار اور بہترین مدبر کی حیثیت سے یاد کئے جائیں گے بلکہ موجودہ سلطنتِ آصفیہ کے بانی ہونے کی وجہ سے تاریخ میں ان کی شخصیت ہمیشہ نمایاں رہے گی۔

# نواب میر نظام علی خاں آصفجاہ ثانی

(۱۷۶۱ء تا ۱۸۰۳ء)

نواب نظام الملک کی وفات پر دکن میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ اسی سلسلہ میں انگریزی اور فرانسیسی کمپنیوں کو ریشہ دوانیوں کا خوب موقع ہاتھ آیا۔ اولاً یہاں پر نظام الملک کے دوسرے فرزند ناصر جنگ نے دو سال تک حکومت کی ان کی شہادت پر نظام الملک کے نواسے مظفر جنگ چند روزہ حکومت کے بعد مارے گئے اس کے بعد امراء نے صلابت جنگ کو تخت نشین کیا جو اور بھائیوں کی بہ نسبت عمر میں بڑے تھے۔ لیکن ان کا زمانہ شروع سے آخر تک ایک کمزور زمانہ تھا۔ جب کہ مرہٹہ اور فرانسیسی دکن پر چھاگئے تھے اور ملک کے انتظامی حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے۔ اس لئے امراء کے مشورہ سے محض ملکی مفاد کے مدنظر صلابت جنگ کی علحدگی عمل میں آئی اور نواب آصفجاہ ثانی تخت نشین ہوئے۔

نواب میر نظام علی خاں بہادر نظام الملک کے چوتھے فرزند تھے اُن کی ولادت ۱۷۳۳ء میں ہوئی تھی بچپن ہی سے وہ بہادر اور فنون سپہ گری سے خوب واقف تھے۔ چونکہ اپنے بھائی صلابت جنگ کے زمانہ میں وہ وزیر رہ چکے تھے اس لئے ان کو سلطنت کے معاملات کا بہت وسیع تجربہ تھا بادشاہ ہوتے ہی انھوں نے کھوئے ہوئے علاقے مرہٹوں سے حاصل کئے اور فرانسیسی اثرات کو دکن سے دور کیا بعد ازاں نہایت دور اندیشی سے کام لے کر انگریزوں سے رابطہ اتحاد قائم کیا۔ اس زمانہ میں ٹیپو سلطان کی قوت بڑھ رہی تھی۔ اس لئے انگریزوں نے آصفجاہ ثانی اور مرہٹوں کو ملاکر "اتحاد ثلاثہ" قائم کیا اور میسور کے خلاف کامیابی حاصل کی اس کے کچھ عرصہ بعد جب مرہٹوں نے چوتھ کے مطالبہ کے سلسلہ میں حیدرآباد پر حملہ کیا تو انگریزی گورنر جنرل سرجان شور نے عدم مداخلت کا بہانہ کرکے مدد دینے سے انکار کردیا جس کی وجہ سے سرکار نظام کو بمقام کھرلا ناکامی ہوئی اور سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

اس پر آصفجاہ ثانی نے انگریزی فوجوں کو برخاست کرکے ان کی جگہ موسیو ریموں کی ماتحتی میں فرانسیسی فوجیں ملازم رکھیں لیکن موسیو ریموں کی موت کے بعد جب انگریزی کمپنی کا مشہور و معروف گورنر جنرل ولزلی ہندوستان آیا تو اس نے نہایت حکمت عملی سے

آصفجاہ ثانی کو پھر اپنی طرف کرکے فرانسیسی فوجوں کو دکن سے برخاست کرا دیا۔

حیدرآباد کے عہد معاونت قبول کرنے کے بعد یہاں سے رقمی اور فوجی امداد حاصل کرکے ولزلی نے میسور کی ریاست پر حملہ کیا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت اور ریاست میسور کے خاتمہ کے بعد کچھ علاقے مثلاً کڑپہ، کرنول اور بلاری وغیرہ حیدرآباد کو برائے نام ملے تھے لیکن فوجی مصارف کے نام سے بہت جلد واپس لے لئے گئے۔

سنہ ۱۸۰۰ء میں آصفجاہ ثانی اور انگریزوں کے درمیان عام اعانت وحفاظت باہم دیگر کا مشہور عہدنامہ ہوا چنانچہ اُس وقت سے آج تک تاج برطانیہ اور ریاست حیدرآباد کے جو خوشگوار تعلقات قائم ہیں وہ اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آصفجاہ ثانی نے انگریزوں سے مستقل تعلقات قائم کرکے سلطنت آصفیہ کے لئے فرانسیسیوں، ٹیپو سلطان اور مرہٹوں کے جو زبردست خطرات تھے ان کو رفع کیا اور اندرون ملک سے فسادات کو دور کیا اور امن قائم کیا۔ اس طرح سنہ ۱۷۶۱ء سے سنہ ۱۸۰۳ء تک نہایت کامیابی کے ساتھ انھوں نے حکومت کی اور اپنی حکمت عملی اور دوراندیشی سے نہ صرف سلطنت کی ڈوبتی ناؤ کو بچالیا بلکہ اپنے عہد حکومت میں ممالک محروسہ کا رقبہ وسیع کرکے سلطنت آصفیہ کا وجود ہمیشہ کے لئے مستقل اور مستحکم کردیا۔ ان وجوہات کی بنا پر اور خصوصاً اٹھارویں صدی کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب کہ ہندوستان میں ہر نقطہ نظر سے ایک عام انحطاط کا دور چلا آرہا تھا۔ ہمیں آصفجاہ ثانی کی شخصیت کیا بلحاظ بہادری اور کیا بلحاظ تدبر اپنے ہم عصروں میں سب سے ممتاز نظر آتی ہے۔ اور وہ بجا طور پر سلطنت آصفیہ کے حقیقی معمار سمجھے جاسکتے ہیں۔

# نواب سکندرجاہ آصفجاہ ثالث

## ( سنہ ۱۸۰۳ء تا سنہ ۱۸۲۹ء )

نواب سکندرجاہ آصفجاہ ثانی کے بڑے بیٹے تھے اور ان کا نام میر اکبر علی خاں تھا۔ ان کے اوائل حکومت کا اہم ترین واقعہ مرہٹوں اور انگریزوں کی جنگ ہے۔ چونکہ نواب سکندرجاہ نے اس لڑائی میں ہر طرح سے انگریزوں کی امداد فرمائی تھی اس لئے کامیابی حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے دولت آباد وغیرہ کے علاقے نواب سکندرجاہ کو واپس کردے۔ لیکن اسی زمانہ سے فوجی اور ملکی معاملات میں انگریزوں نے زیادہ دخل دینا شروع کیا۔ چنانچہ میر عالم کے انتقال پر مدارالمہام کے تقرر کا مسئلہ پیش ہوا تو رزیڈنٹ وقت کیپٹن سڈنہم نے بہت کچھ مداخلت کی لیکن سکندرجاہ نے منیرالملک ہی کو اپنی مرضی سے وزیر منتخب کیا البتہ اتنا ضرور ہوا کہ سارے اختیارات پیشکار مہاراجہ چندولال کے ہاتھ میں آگئے، (جن کی تائید میں رزیڈنٹ تھا) چنانچہ اس کے بعد تقریباً تیس سال تک ریاست میں چندولال ہی کا بڑا عمل دخل رہا۔ ریاست کے انتظامی اور فوجی معاملات میں رزیڈنٹ رسل کی پیش قدمی انگریزوں سے مہاراجہ چندولال کی غیرمعمولی ہمدردی اور پامر کمپنی سے سودی قرضہ کا لین دین یہ وہ چیزیں تھیں جس کی وجہ سے ریاست حیدرآباد کی مالی اور انتظامی حالت بد سے بدتر ہوگئی۔ چنانچہ دوسرے رزیڈنٹ مٹکاف نے جایزہ لیتے، نے صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ نئی اعانتی فوجیں حیدرآباد کے خزانہ پر بہت بار ہیں اور پامر کمپنی کا جال ایک دوسری مصیبت ہے۔ اس لئے اس نے بعض مفید تجاویز پیش کئے۔ چنانچہ گورنر جنرل وقت مارکوئس آف ہیسٹنگز نے پامر کمپنی کا قرضہ تو انگریزی حکومت



نواب میر اکبر علی خاں سکندر جاہ آصف جاہ ثالث



نواب میر فرخندہ علی خاں ناصرالدولہ آصف جاہ رابع

کی طرف سے ادا کر دیا لیکن شمالی سرکاروں کی جو پیشکش آصفجاہ ثانی کے زمانہ سے جاری تھی وہ اس سلسلہ میں ہمیشہ کے لئے بند کر دی۔ اور فوجی بار حسب حال ریاست پر پڑتا رہا۔

مہاراجہ چندو لال کے عمل دخل کو دیکھ کر نواب سکندر جاہ نے خود امور سلطنت میں زیادہ حصہ نہیں لیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کے معاملات میں انگریزوں کی مداخلت روز بروز زیادہ بڑھتی گئی۔

نواب سکندر جاہ ایک خدا ترس رحمدل اور نیک بادشاہ تھے۔ ان کو اپنی رعایا کے آرام و آسایش کا بڑا خیال تھا چنانچہ انھوں نے کئی تالاب سڑکیں وغیرہ تعمیر کرائیں۔ غرض رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دیے۔ انگریزی اعانتی فوج کے لئے سکندرآباد کا شہر انھیں کی یادگار ہے۔

# نواب ناصر الدولہ آصفجاہ رابع

## (۱۸۲۹ء تا ۱۸۵۷ء)

میر فرخندہ علی خاں نواب ناصر الدولہ سکندر جاہ کے صاحبزادے تھے۔ تخت نشین ہوتے ہی انھوں نے ملکی انتظامات کو درست کرنے کی کوشش کی، رزیڈنسی کے اثرات کو کم کیا اس سلسلہ میں مہاراجہ چندو لال کے استعفا دینے کے بعد کچھ عرصہ تک بغیر کسی مدار المہام کے بذات خود وہ حکومت کے کام انجام دیتے رہے۔ اور پھر کئی مدار المہاموں کو خود ہی مقرر کیا اور معطل و علحدہ کر دیا۔ انگریزوں کے قرضہ کی رقم بڑھتی جا رہی تھی چنانچہ جب ڈلہوزی گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آیا تو اس نے سخت تقاضا کیا کہ قرضہ کے معاوضہ اور فوجی اخراجات کے لئے ملک کے بعض اضلاع انگریزوں کے حوالے کئے جائیں۔ اُس زمانہ کا رزیڈنٹ جنرل فریزر نہایت منصف مزاج اور ریاست کا خیر خواہ تھا۔ اس طرح کی ناواجبی مداخلت کو پسند نہ کر کے اس نے خود استعفا دے دیا۔

لیکن ڈلہوزی نے پھر دباؤ ڈالا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد کی اعانتی فوج کے اخراجات اور قرضہ کے سلسلہ میں نواب ناصر الدولہ پر انتہائی دباؤ ڈالا گیا۔ چنانچہ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی رو سے رائچور کا دوآبہ اور برار کا علاقہ عارضی پٹہ پر انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا اس واقعہ کا حیدرآباد کے وزیر سراج الملک پر اتنا اثر ہوا کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ ان کے بھتیجے میر تراب علی خاں سالار جنگ اول مدار المہام مقرر ہوئے جنھوں نے نہ صرف تین بادشاہوں کے زمانہ میں مدار المہامی کی اہم ترین خدمت انجام دی بلکہ جدید حیدرآباد کے بنانے میں شاید سب سے زیادہ حصہ لیا۔

نواب ناصر الدولہ کے زمانہ ہی سے انھوں نے سیاسی اصلاحات اور معاشی و تعلیمی ترقیات کا کام شروع کر دیا تھا جس کو بعد کے دو فرمانرواؤں کے زمانہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ملک کے حصے بخرے ہو کر چھوٹے چھوٹے اراضیات سرمایہ داروں اور عرب جمعداروں کے پاس رہن تھے سالار جنگ نے ان علاقوں کو چھڑوا لیا اور دوسری اصلاحات کے کام میں مصروف تھے کہ ادھر شمالی ہند میں غدر کی آگ پھوٹ پڑی اور ادھر نواب ناصر الدولہ نے رحلت فرمائی۔

# نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس

(۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء)

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی اہمیت غیر معمولی ہے کیوں کہ اُس سال شمالی ہند میں غدر ہونے کی وجہ سے دہلی اور میرٹھ سے لے کر وسطِ ہند تک ہر جگہ ہندوستانی فوج نے سرکشی کی تھی۔ غرض وہ وقت انگریزوں کے لئے نہایت درجہ نازک تھا۔ حیدرآباد کے لئے بھی وہ زمانہ کچھ کم اہمیت کا نہ تھا کیونکہ ناصر الدولہ کے انتقال کے بعد یہاں ان کے بڑے صاحبزادے نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ تخت نشین ہوئے تھے۔ انھوں نے نہ صرف ریاست حیدرآباد اور جنوبی ہند میں غدر کی آگ کو پھیلنے سے روکا بلکہ انگریزوں کی ہر طرح سے مدد فرمائی مختصر یہ کہ نواب افضل الدولہ اور ان کے وزیر سالار جنگ نے انگریزوں کی ڈوبتی ناؤ کو بچا لیا۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمہ کے بعد ہندوستان کی حکومت جب راست شاہانِ انگلستان کے ہاتھ آگئی تو نواب افضل الدولہ کی خدمات کے صلہ میں شوراپور اور رائچور کا دوآبہ حیدرآباد کو واپس مل گیا۔

نواب افضل الدولہ کے زمانے سے حیدرآباد جدید کی ابتدا ہوتی ہے۔ اب بھی ایسے سن رسیدہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے نواب افضل الدولہ بہادر اور ان کے خیر خواہ اور وفادار وزیر سالار جنگ اول کو اصلاح اور ترقی ملک کے کاموں میں ہمہ تن مصروف دیکھا تھا چنانچہ ان کی زبانی اُس زمانے کے حالات سننے سے اس عہد کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

اسی طرح حیدرآباد میں بہت سی نشانیاں اور کئی عمارتیں ایسی موجود ہیں۔ جیسے افضل گنج۔ افضل گنج کا پل، مسجد افضل گنج یا چو محلہ پیالیس وغیرہ جو اسی عہد کی یادگار ہیں۔

نواب افضل الدولہ کا عہدِ حکومت صرف بارہ سال تک رہا لیکن سچ تو یہ ہے کہ حکومت آصفیہ کے موجودہ نظام حکومت اور انتظامات مملکت کی داغ بیل اسی عہد میں ڈالی گئی۔ اول تو سارے ملک کی پیمائش کرا کے مالگزاری مقرر کی گئی دوسرے یہ کہ سارے ملک کو چار صوبوں، سترہ ضلعوں اور بہت سے تعلقوں میں تقسیم کر کے صوبہ دار، تعلقدار اور تحصیلدار مقرر کئے گئے۔ انتظامی اور مالی اصلاحات کے علاوہ سررشتہ عدالت اور پولیس کی تنظیم عمل میں آئی۔ نیا سکہ جاری ہوا۔ اس طرح امن و اماں اور عدل و انصاف کے سررشتوں کی تنظیم کے بعد قوم ساز سررشتوں کے قیام کی طرف توجہ کی گئی اور رعایا کے آرام و آسائش، علمی اور مادی ترقی کی خاطر سررشتہ جات تعلیم، طبابت اور تعمیرات وغیرہ کا قیام عمل میں آیا۔ خاص کر تعلیم کے معاملہ میں دورِ جدید کی تاریخ میں پہلا قدم نواب افضل الدولہ کے عہد میں اٹھایا گیا کہ ایک طرف تو ہر ضلع اور ہر تعلقہ میں مدارس قائم کئے گئے۔ اور دوسری طرف خاص شہر حیدرآباد میں دارالعلوم اور مدرسہ عالیہ کا قیام عمل میں آیا۔ جہاں عام طور پر ذریعہ تعلیم فارسی زبان تھی۔

ذاتی حالات کے اعتبار سے افضل الدولہ بہادر بڑے خدا ترس، بہت نیک ملنسار اور سادہ مزاج بادشاہ تھے۔ رفاہِ عام کے کاموں میں غیر معمولی دلچسپی لینے کے علاوہ بڑے فیاض اور علم و فن کے بڑے قدردان تھے تاریخ میں اُن کا اور ان کے وفادار وزیر سالار جنگ اول کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا، کہ اس رحمدل بادشاہ اور خیر خواہ وزیر نے ریاست حیدرآباد کی اصلاح اور ترقی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اس طرح حیدرآباد جدید کی تعمیر کا کام آغاز کیا۔ جس کو بعد کے زمانہ میں ترقی ہوتی گئی۔



نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ آصف جاہ خامس



نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس

# نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس (۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء)

تاریخ میں ایسی مثالیں شاذ ہی ہوں گی جب کہ ایک نہایت کمسن شہزادہ کو تخت نشین کیا گیا ہو۔ اور پھر بھی حکومت کامیابی سے چلی ہو۔ چنانچہ یہ ایک اہم واقعہ ہے کہ ۱۸۶۹ء میں افضل الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے چہیتے فرزند نواب میر محبوب علی خاں کو تین سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا گیا اور ایک مجلس تولیت قائم ہوئی جس کے اراکین نواب سالار جنگ اول اور نواب شمس الامراء تھے۔ اور انھیں کے سپرد حکومت کے جملہ کاروبار تھے۔

نواب میر محبوب علی خاں کے سن بلوغ کو پہنچنے سے قبل کے چند واقعات نہایت اہم ہیں ایک تو یہ کہ سالار جنگ اول نے واپسی برار کا مسئلہ چھیڑ دیا اور اسی سلسلہ میں خود انگلستان گئے جہاں آپ کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۷۷ء میں اعلیٰ حضرت کو ساتھ لے کر سالار جنگ اول نے دہلی دربار میں شرکت کی۔ اور تیسرا اہم واقعہ خود سالار جنگ کے ۱۸۸۳ء میں انتقال کر جانے کا ہے۔ ایسے وفادار اور مدبر وزیر کسی ملک کی تاریخ میں شاید ہی گذرے ہوں، جو اپنے ملک اور مالک کے لئے ہمہ تن وقف ہوگئے ہوں۔ چنانچہ سالار جنگ کو یہ شرف حاصل رہا کہ ناصر الدولہ، افضل الدولہ اور نواب میر محبوب علی خاں جیسے تین ہر دلعزیز بادشاہوں کے زمانے میں تقریباً تیس سال تک انھوں نے نہایت تدبر اور وفاداری سے ملک اور مالک کے خدمات انجام دئے۔ اور سچ تو یہ کہ حیدرآباد جدید کی ترقیوں کی داغ بیل ڈالنے میں بڑا حصہ لیا۔

سالار جنگ نہایت ہردلعزیز تھے ان کی وفات کا صدمہ یوں تو ساری رعایا کو ہوا لیکن سب سے زیادہ اعلیٰ حضرت کو ہوا کیونکہ اعلیٰ حضرت دل سے ان کی قدر کرتے تھے۔ سالار جنگ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سالار جنگ ثانی، پھر سر آسماں جاہ، سر وقار الامراء اور آخر کار مہاراجہ سرکشن پرشاد یکے بعد دیگرے مدارالمہام مقرر ہوئے۔

اعلیٰ حضرت مرحوم بڑی خوبیوں کے انسان اور بڑے ہردلعزیز بادشاہ تھے سرکار انگریزی سے ان کے زمانہ میں دوستانہ تعلقات میں اضافہ ہوا لارڈ ڈفرن نے پہلی مرتبہ حیدرآباد آکر اس رسم کی ابتدا کی کہ گورنر جنرل کو ضرور حیدرآباد آنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد سے ہر وائسرائے اپنی واپسی سے قبل ضرور حیدرآباد آجایا کرتے ہیں۔ "تاریخ دکن میں مسئلہ برار یوں بھی کوئی دل خوش کن چیز نہ تھی۔ اس پر ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے حیدرآباد آکر برار کے دوامی پٹہ پر مجبوراً اعلیٰ حضرت سے دستخط لے لئے کہ برار مملکت تو سرکار نظام کی ہو لیکن اس پر قبضہ ہمیشہ کے لئے سرکار انگریزی کا رہے۔ اور اس کے لئے سالانہ ۲۵ لاکھ کی پیشکش سرکار نظام کو دی جایا کرے۔ چنانچہ یہ رقم اب تک ہر سال وصول ہوتی ہے۔

اعلیٰ حضرت مرحوم کا زمانہ جدید ترقیات کے آغاز کا ہے اس دور میں نہ صرف بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں جیسے زنانی شفاخانہ، محبوبیہ ٹاؤن ہال وغیرہ بلکہ بہت سی سیاسی اصلاحیں عمل میں آئیں۔ مثلاً سکہ محبوبیہ جاری ہوا۔ کیبنٹ کونسل اور لیجسلیٹو کونسل کا قیام عمل میں آیا۔

۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی کی طغیانی حیدرآباد کے لئے ایک زبردست سانحہ تھا، اس وقت اعلیٰ حضرت نے جس طرح رعایا کی مدد فرمائی ہے وہ عدیم المثال ہے۔

غرض اعلیٰ حضرت نہ صرف خود بڑے شاعر و عالم اور قدردان علم و فن تھے بلکہ غیر معمولی خوبیوں کے چرچے نہ صرف ریاست حیدرآباد میں بلکہ دور دراز ملکوں تک پہنچے ہوئے تھے۔

۱۹۱۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ملک پر ان کے احسانات اس قدر ہیں کہ حیدرآباد اپنے محبوب بادشاہ کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

میر محمود علی

# باغِ عام

## اور مدح حضرت آصف سابع خلد اللہ

کیا حسیں ہے صورتِ گلفام باغِ عام کی
آنکھ ہو اور شکلِ دل آرام باغِ عام کی

صبح اس گلزار کی آئینۂ رخسارِ حور
شانۂ گیسوئے لیلیٰ شام باغِ عام کی

### دیگر

نرگسِ شہلا میں عشوے چشمِ مے آشام کے
سنبلِ پیچاں میں گھونگر زلفِ عنبر فام کے

بارک اللہ جس قدر پانی کے چشمے ہیں یہاں
سب ہیں آئینے جمالِ روئے باغِ عام کے

### دیگر

روئے گل پر کاکلِ سنبل ہے بل کھائی ہوئی
برگِ گل میں لعلِ لب کی ہے جھلک آئی ہوئی

وہ ہے باغِ عام پر جوبن کہ انساں کیا جلیل
بنکے چشمِ شوق نرگس بھی تماشائی ہوئی

### دیگر

آج باغِ عام سے ہی اور ہی شانِ دکن
ہر کلی اس بوستاں کی ہے گلستانِ دکن

پتی پتی نے لکھا ہے کلکِ قدرت سے جلیل
شاہِ عثماں آصفِ سابع سلیمانِ دکن

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل



حیدر یار خاں صبر جنگ منیر الدولہ منیر الملک

# چارمینار

عظمتِ شاہانِ ماضی کی نرالی یادگار
اے وطن کی سرزمینِ حسن کے آئینہ دار

تجھ میں ذوق و شوق کی تابندگی پاتا ہوں میں
تجھ میں اپنے حوصلوں کی زندگی پاتا ہوں میں

شہر کے سینے میں روشن ہے ترا نقشِ وفا
تیرے میناروں میں دل کی رفعتیں جلوہ نما

چار سُو جلتا ہے تیرے عشقِ دائم کا چراغ
دیکھ کر تجھ کو، فلک کی سمت جاتا ہے دماغ

بادۂ سرمستئ الفت کا تو اک جام ہے
اتحادِ میکدہ کا تجھ میں اک پیغام ہے

ثبت ہیں سکوں کے دل پر تیری تصویریں ہنوز
ظلمتوں میں بھی ہیں روشن تیری تقدیریں ہنوز

تو جہانِ حسن کے نایاب شہ کاروں میں ہے
عشق کی برقِ تجلّی تیری دیواروں میں ہے

رات کی اٹھتی ہے جس دم تیرے چہرے سے نقاب
جب چمکتا ہے دکن کی سرزمیں پر آفتاب

سربلندی کی فضا پر ناز فرماتا ہوا
تو نظر آتا ہے اک تلوار چمکاتا ہوا ـــ

باقی



درگاه قلی خان سالار جنگ موتمن الدوله خان دوران

# وزرائے آصفی

## شیر جنگ تولد ۱۱۱۳ھ وفات ۱۱۸۹ھ

خاندان سالار جنگ کے مورث اعلیٰ امیر الدولہ امیر الملک شیر جنگ حمید یار خاں ہیں جو حضرت اویس قرنی کی اولاد سے تھے، اویس قرنی تاریخ اسلام میں خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔ وہ آنحضرت کے زمانہ میں موجود تھے حضرت علی مرتضیٰ علیہ السّلام کے ہمراہ جنگ صفین میں حاضر تھے اور اسی جنگ میں جام شہادت پیا، اویس قرنی کی اولاد سے اویس ثالث اپنے لڑکے محمد علی کے ہمراہ مدینہ منورہ سے دکن آئے، اور بیجاپور پہونچے یہاں اس زمانہ میں علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ) حکمران تھا ۔ بادشاہ نے آپ کی بڑی عزت کی اور آپ کے فرزند محمد علی کی شادی ملا احمد نائطی کی دختر سے کردی گئی اور "دبیر سلطانی" کا عہدہ بھی دیا گیا ۔

علی عادل شاہ کے بعد شیخ محمد علی کے دونوں فرزند محمد باقر اور محمد حیدر، دربار مغلیہ سے متعلق ہوگئے، عالمگیر اورنگ زیب نے دو ہزاری منصب سے سرفراز کیا محمد باقر کے فرزند محمد تقی بھی عالمگیری عہد میں منصب سہ صدی سے ممتاز ہو چکے تھے ۔ اور فرخ سیر کے زمانہ میں ان کو اورنگ آباد میں "داروغہ خزینہ" کی خدمت ملی ۔

حضرت آصفجاہ اول نے ان کو قلعہ جات دکن کا داروغہ مقرر کیا ۔ انھیں محمد تقی کے فرزند شمس الدین محمد حمید یار خاں شیر جنگ ہیں ۔

شیر جنگ کی ولادت اورنگ آباد میں ۱۱۱۳ھ میں ہوئی حضرت آصفجاہ اول نے سب سے پہلے دو صدی منصب کے ساتھ فیل خانہ کا داروغہ مقرر کیا ۔ اس کے بعد آپ کو مختلف خدمات عطا ہوئیں جن کو آپ نے خوش اسلوبی سے انجام دیا ۔ آصفجاہ کا بڑا اعتماد آپ پر تھا ، حمید یار خاں کا خطاب بھی آصفجاہ نے عطا کیا تھا ۔

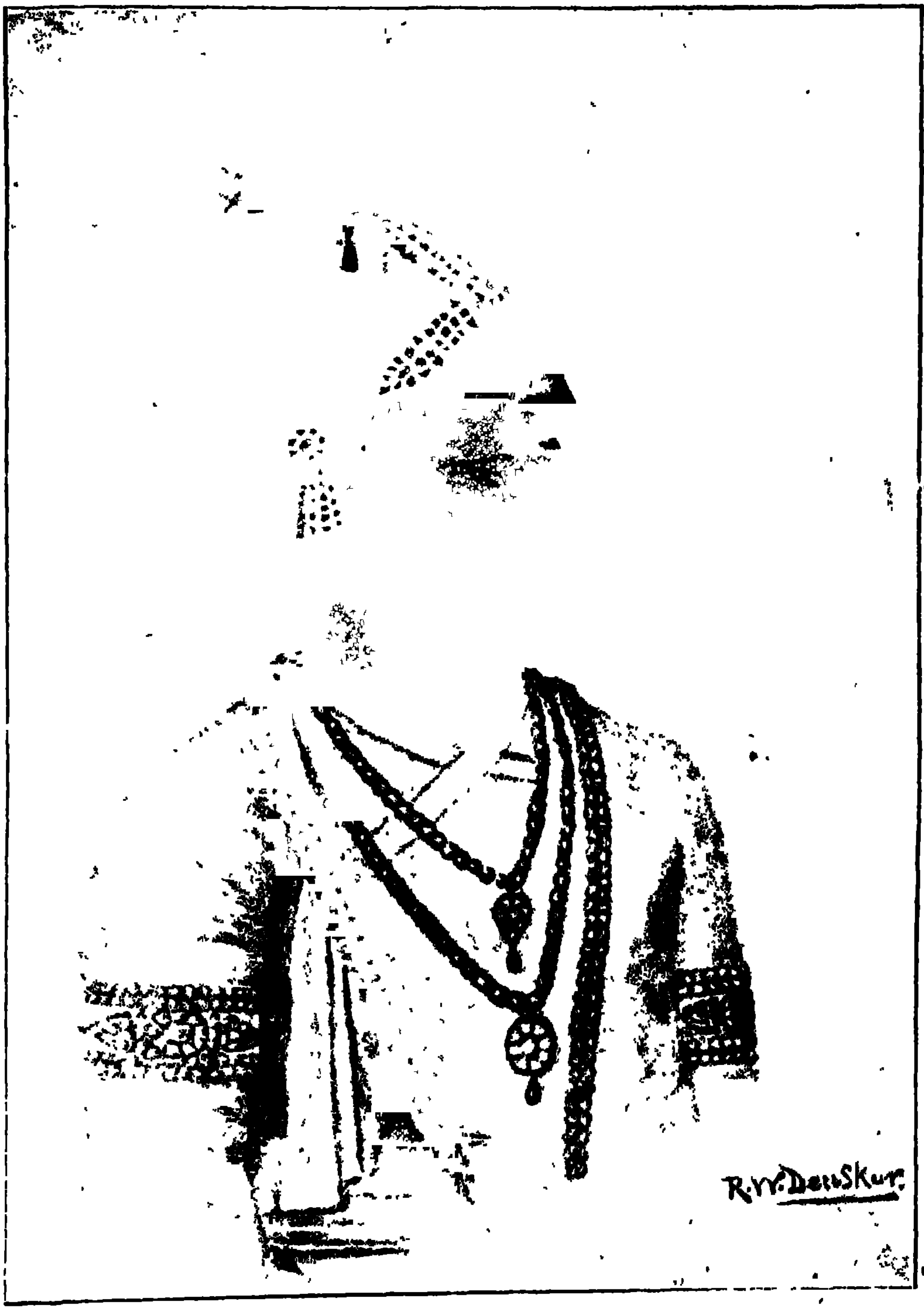
نواب ہدایت محی الدین خان مظفر جنگ کے مارے جانے پر نواب صلابت جنگ کی مسند نشینی شیر جنگ کی جرأت کی وجہ سے ہوئی تھی کیونکہ بعض امرا کی خواہش تھی کہ نواب نظام علی خان (آصفجاہ ثانی) کو مسند نشین کیا جائے چونکہ نواب صلابت جنگ بڑے بھائی تھے اس لئے شیر جنگ نے کہا کہ بڑے بھائی کے ہوتے ہوئے چھوٹے کو مسند نشین کرنا خاندان آصفی کی روایات کے خلاف ہے ، اور پیش قدمی کر کے نواب صلابت جنگ کو مسند نشینی کی نذر پیش کردی ۔ آپ کے بعد دوسرے امرا نے بھی آپ کی پیروی کی

نواب صلابت جنگ کے زمانہ میں شیر جنگ نے دیوانی کے اہم فرائض بھی انجام دئے ۔ (۱۱۶۲ھ) نواب آصفجاہ ثانی کے ابتدائی ایام میں چونکہ شیر جنگ سے موافقت نہیں تھی اس لئے انھوں نے پونہ میں اقامت کرلی تھی، بعد میں شیر جنگ مورد عنایت شاہی ہوئے ۔ رکن الدولہ کے مشیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے ۔ اس کے بعد انھوں نے مختلف اہم خدمات کو انجام دیا اور آخر زمانہ میں جبکہ ان کا سن بھی زیادہ ہوگیا تھا ان کو صوبہ اورنگ آباد کی نظامت کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا ۔ اس خدمت کو بھی وہ پانچ سال تک انجام دیکر ۱۱۸۹ھ میں انتقال فرمایا ۔ اورنگ آباد میں سپرد خاک کئے گئے ۔

شیر جنگ ، سخاوت ، شجاعت میں مشہور تھے ، علمی قابلیت بہت اچھی تھی ۔ ان کو دو لڑکے تھے ۔ بڑے محمد صفدر خان غیور جنگ جو درگاہ قلی خان کے داماد تھے ۔ اور دوسرے تقی یار خان ذوالفقار جنگ جنھوں نے عنفوان شباب میں انتقال کیا ۔ اول الذکر کی اولاد سے نواب سالار جنگ بہادر ہیں، جو آپ کی چھٹی پشت کے دادا ہوتے ہیں ۔



میر محمدی خاں رکن الدولہ




سہراب جنگ معین الدولہ مشیر الملک اعظم الامرا ارسطو جاہ

# رکن الدولہ میر موسیٰ خان وفات ۱۱۹۰ھ

میر محمد یار نام اور رکن الدولہ میر موسیٰ خان احتشام جنگ خطاب تھا ۔ آپ کے اجداد بخارا کے رہنے والے تھے رکن الدولہ کے دادا ہندوستان آئے اور نواب غازی الدین خان فیروز جنگ کے فرزند میر قمرالدین خان آصف جاہ اوّل کی تعلیم دینے پر مامور کئے گئے ۔ ترکی خان ان کو خطاب ملا ۔ ان کے فرزند میر موسیٰ تھے ، جو دیورکنڈہ کی وقائع نگاری پر مامور کئے گئے ۔ پھر مظفر جنگ کے یہاں ایک رسالہ کے افسر مقرر ہوئے ، ان کے بعد ان کے فرزند میر محمد یار کو باپ کی جگہ مامور کیا گیا ۔ نواب مظفر جنگ کے مارے جانے پر صلابت جنگ نے محمد یار کو موسیٰ خان کے خطاب کے ساتھ ایک خاص فوج کی کمانڈری پر مقرر کیا ۔ رفتہ رفتہ انھوں نے ترقی کی نام پیدا کیا اور جہانگیری سایہ پر ترقی پائی ، چونکہ طالع یاور تھا ، حضرت آصف جاہ ثانی کی نظر عنایت مبذول ہوگئی اور ۱۱۸۰ہجری میں خطاب رکن الدولہ احتشام جنگ کے ساتھ منصب ہفت ہزاری اور شش ہزار سوار کا اعزاز ملا اور خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے ۔ ان کے دیوانی کے کاروبار میں نواب شیر جنگ کو زیادہ دخل تھا ، وہ مشیر خاص کی حیثیت رکھتے تھے ۔

۱۱۹۰ہجری میں ایک سپاہی فیضو نام نے آپ کو شہید کر دیا ۔ کوہ مولا کے دامن میں دفن کئے گئے ۔

ان کی دیوانی کے اہم واقعات یہ ہیں :-

(۱) حیدر علی کو انگریزوں کے ساتھ جنگ کرنے میں آصفی فوج نے مدد دی ، مگر حیدر علی کو ناکامی ہوئی ۔ محمد علی والاجاہ نے نظام اور انگریزوں میں صلح کرا دی ، اس صلح کے لئے رکن الدولہ مدراس گئے ۔

(۲) مرہٹوں سے دو مرتبہ جنگ ہوئی ۔

(۳) موسیٰ ندی میں طغیانی آئی اور فصیل توڑ کر پانی اندر چلا آیا ۔

رکن الدولہ کو اولاد نہ تھی ۔ لیکن ان کے بھائی نواب شمس الامراء کی اولاد موجود ہے ۔ ان کے سلسلے میں نواب تہور جنگ رکن الملک کی ایک قابل ذکر ہستی تھی جو اپنے کردار اور زہد و ورع کی وجہ سے بہت مشہور تھے ۔

# ارسطوجاہ

تولد ۱۱۴۵ھ     وفات ۱۲۱۹ھ

غلام سید نام اور معین الدولہ سہراب جنگ مشیر الملک اعظم الامرا ارسطوجاہ فرزند ارجمند وکیل مطلق مختار دولت آصفیہ خطاب تھا۔ ۱۱۴۵ھ میں تولد ہوئے، نوشیروان عادل کی اولاد سے تھے، آپکے باپ فرخ نژاد خان کو حضرت آصفجاہ اول نے صوبہ دار برار مقرر کیا تھا۔ غلام سید خان آصفجاہ ثانی کے رفیق اور مصاحب تھے، حیدر جنگ کے مارے جانے کے بعد معین الدولہ سہراب جنگ کے خطاب کے ساتھ محالات صوبہ برار اور خجستہ بنیاد کی دیوانی پر مامور کئے گئے۔

اس کے بعد پونہ اور ناگپور کی سفارت پر بھیجے گئے، چنانچہ سہراب جنگ نے راؤ پنڈت پردھان اور رگھوجی بھونسلہ کے پاس جاکر اپنا مفوضہ کام نہایت حسن وخوبی سے انجام دیا۔ اس کے بعد ایک عرصہ بعد مشیر الملک اعظم الامرا کے خطاب کے ساتھ خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے (۱۷۸۱ء ، ۱۱۸۹ھ)

آپ کی دیوانی کے اہم واقعات کی بڑی تفصیل ہے، جن کی صراحت کا یہ موقع نہیں ہے، مختصراً اس کا اظہار کیا جاتا ہے:-

(۱) سلطنت آصفیہ نے مرہٹوں کی تائید سے میسور پر چڑھائی کی مگر عین وقت پر مرہٹوں نے ساتھ نہیں دیا۔ الغرض تنہا آصفی فوج نے میسور پر حملہ کیا اور فتحیاب ہوئی۔

(۲) انگریزوں کے ساتھ شریک ہوکر سلطنت آصفیہ نے میسور کی تیسری لڑائی میں حصہ لیا۔

(۳) مرہٹوں کے ساتھ جنگ کھرڈلہ واقع ہوئی، جس میں بعض وجوہ سے آصفی فوج ناکام رہی۔

(۴) اعظم الامرا پونہ میں نظر بند کئے گئے۔

(۵) پونہ میں اعظم الامرا نے سیاسی چال چلی، روسا مرہٹہ میں نفاق ڈالکر ان کو آپس میں جدا کر دیا، اور پھر اپنی سیاسی چال اور تدبر سے ان کی صفائی بھی کرادی، اور صفائی کرانے کے بعد جنگ کھرڈلہ کے نقصانات کی تلافی میں ایک کروڑ نقد تین کروڑ کے دستاویزات معافی چوتھ کی سند مالک دولت آباد وغیرہ واپس لیکر حیدرآباد واپس ہوئے۔

(۶) میسور کی چوتھی لڑائی میں انگریزوں کی مدد کی گئی اور فتحیاب ہوئے۔

(۷) آصفجاہ ثانی کا انتقال ہوا اور آصفجاہ ثالث مسند حکومت پر جلوہ گر ہوئے، اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ۱۲۱۹ھ میں ارسطوجاہ کا انتقال ہو گیا سرور نگر میں دفن ہوئے۔ ارسطوجاہ اپنے ملک اور مالک کے سچے خیر خواہ رہے، مرتے دم تک آپ نے ملک اور مالک کی خدمت نہایت دیانت داری سے انجام دی، وہ اپنے وقت کے بڑے سیاست داں تھے، انھوں نے بیسیوں موقعوں پر سیاسی دل ودماغ سے کام لیکر کامیابی حاصل کی۔

ارسطوجاہ مذہبی آدمی تھے۔ فرائض کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے، جود وسخا میں مشہور تھے۔ علما و فضلا کی صحبت سے بڑی دلچسپی تھی۔ شعر و سخن سے شغف تھا، ان کے دربار نے اردو شاعری کی بھی بڑی خدمت کی۔



سید ابوالقاسم میر عالم



علی زمان خان غیور جنگ منیر الدولہ منیر الملک امیر الامراء

# میر عالم

تولد ۱۱۶۶ھ وفات ۱۲۲۳ھ

ابوالقاسم میر عالم کے والد سید رضی شوستر (ایران) کے شیخ الاسلام کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، سید رضی شوستر ہی میں پیدا ہوئے مگر ۱۱۴۷ھ میں وہ اپنے بھائی کے ہمراہ ہندوستان آئے، شاہ جہاں آباد میں چند روز قیام کے بعد شجاع الدولہ ناظم بنگال کے پاس بنگال چلے گئے اور وہاں ان کے داماد مرشد قلی کی رفاقت میں رہنے لگے، اور مرشد قلی کے ساتھ حیدرآباد آئے، آصفجاہ کی ملازمت اختیار کی۔ دارالانشا میں مامور کئے گئے حضرت آصفجاہ نے ایک جاگیر بھی مرحمت فرمائی تھی۔ ۱۱۹۴ھ میں سید رضی کا حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ دائرہ میر مومن میں دفن ہوئے۔

سید رضی بڑے قابل فرد اور مجتہد کا درجہ رکھتے تھے۔ شاعری کا بھی شوق تھا۔ اقدس تخلص کرتے تھے۔

میر ابوالقاسم المخاطب بہ میر عالم کی ولادت حیدرآباد میں ۱۱۶۶ھ م ۱۷۵۳ء ہوئی۔ عربی اور فارسی میں بڑی اچھی قابلیت رکھتے تھے، ریاضی میں بھی مہارت تھی، نظم بر داشتہ عربی لکھا کرتے تھے۔ فارسی شاعری اور انشا پردازی کا خاص ذوق تھا۔ بہرحال میر عالم اپنے وقت کے ایک بلند پایہ ادیب اور قابل فخر شاعر تھے

یہ امر خاص طور سے قابل تذکرہ ہے کہ میر عالم کی ابتدائی ملازمت ان کی شاعری کے طفیل ہوئی۔ اگرچہ ان کو باپ کی جاگیر مل چکی تھی مگر ملازمت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ ایک مرتبہ جب ارسطوجاہ کی مدح میں قصیدہ لکھا تو ارسطوجاہ نے ان کے کلام کی لطافت اور بلاغت سے متاثر ہو کر اپنا سکریٹری بنالیا۔ اس وقت سے ان کی ترقی ہونے لگی

اس کے بعد وہ صدر تعلقدار بنائے گئے۔ انہوں نے اپنے علاقہ کا انتظام نہایت عمدہ کیا رعایا اور مالک دونوں کی خوشنودی حاصل کی۔

صدر تعلقداری کے بعد میر عالم کو وکالت کی خدمت دی گئی۔ سرکار کمپنی کی جانب سے ایک سفیر حیدرآباد آیا تو ارسطوجاہ نے اپنے اور اس انگریز سفیر کے درمیان ان کو وکالت پر مامور کیا۔ معاملات نہایت عمدگی سے طے پاگئے، اس کے بعد میر عالم کو سفارت کے لئے منتخب کیا گیا اور وہ حضرت آصفجاہ ثانی کی جانب سے گورنر جنرل (کارنوالس) کے پاس بھیجے گئے (۱۲۰۲ھ) میر عالم اس سفارت میں کامیاب ہو کر کلکتہ سے واپس آئے، اس کامیابی کے صلہ میں ان کو خطاب میر عالم کے ساتھ دیگر اعزازات سے بھی ممتاز کیا گیا۔ اب وہ پیشوا کے پاس پونہ روانہ کئے گئے۔ اور اس کے بعد میسور کی چوتھی لڑائی میں حیدرآبادی فوج کی سپہ سالاری کے فرائض ان کے تفویض کئے گئے۔

ارسطوجاہ کے انتقال پر آصفجاہ ثالث نے میر عالم کو دیوانی کی اہم خدمت عطا فرمائی۔ (۱۲۱۹ھ)

میر عالم نے اپنی دیوانی کے زمانہ میں کئی اصلاحیں فرمائیں چنانچہ قلمرو آصفی میں سب سے پہلے ٹپہ رسانی (ڈاک) کا انتظام کیا گیا۔ حیدرآباد سے کلکتہ، مدراس، بمبئی، پونہ اور مچھلی بندر تک ٹپہ کا انتظام ہوا۔ اس کے لئے راستے میں مسافر خانے، مسجدیں بنوائیں اور باؤلیاں کھدوائیں آج تک بھی اکثر سرائیں موجود ہیں۔

۱۲۲۰ھ میں ایک قحط ہوا، میر عالم نے اس کا معقول انتظام فرمایا۔ بہرحال میر عالم ایک منتظم اور مدبر دیوان ثابت ہوئے۔

شوال ۱۲۲۳ھ میں میر عالم کا انتقال ہوا۔ دائرہ میر مومن میں اپنے والد کے پہلو میں دفن کئے گئے۔

میر عالم کی بنائی ہوئی کئی چیزیں آج تک موجود ہیں مثلاً میر عالم کا تالاب، میر عالم کی منڈی، بارہ دری اور اس کا باغ وغیرہ۔ میر عالم صاحب تصنیف تھے فارسی نثر و نظم میں کئی کتابیں ہیں ان میں سے حدیقۃ العالم اور مثنوی مدح ماہ لقابائی چندا مشہور ہیں۔

میر عالم بڑے سخی تھے ہر روز ان کے باورچی خانہ سے دو سو مساکین کو کھانا ملتا تھا۔ وہ بڑے معاملہ فہم، دوررس دوربیں، صاحب تدبیر، حزم و احتیاط کرنے والے اور عاقبت بیں تھے۔

# شمس الامرا ثانی امیر کبیر

## تولد ۱۱۹۵ھ انتقال ۱۲۷۹ھ

نواب محمد فخر الدین خان تیغ جنگ ابوالفتح خان شمس الامرا اول کے فرزند ہیں حیدرآباد میں آپ کی ولادت ہوئی (۱۱۹۵ھ) باپ کے انتقال کے وقت بہت کم سن تھے، آپ کی کم عمری سے ہی آصفجاہ ثانی کے نوازشات مبذول ہوتی رہیں۔

موروثی خطابات تیغ جنگ، شمس الدولہ، شمس الملک، شمس الامرا (ثانی) کے ساتھ امیر کبیر (اول) کا جلیل القدر خطاب بھی ملا۔

امیر کبیر مختلف حیثیتوں سے خاندان پائگاہ کے چشم و چراغ ہیں، آپ کی ممتاز ہستی نہ صرف امرا پائیگاہ بلکہ تاریخ دکن میں بھی اہم حیثیت رکھتی ہے۔ اور تاریخ دکن اپنے اس قابل فخر سپوت پر ہمیشہ فخر کرے گی۔

امرا پائگاہ میں آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں، جو بادشاہ کی دامادی کے رشتہ میں منسلک کئے گئے چنانچہ ۱۲۱۵ھ میں حضرت آصفجاہ ثانی نے اپنی صاحبزادی بشیر النساء بیگم کی شادی آپ سے فرماکر دامادی کے رشتہ سے ممتاز کیا۔ اور آج تک آپ کی اولاد کو یہ فخر حاصل ہو رہا ہے کہ وہ خاندان آصفی کی شہزادیوں کے ساتھ ازدواج کا امتیاز حاصل کرتے ہیں۔

نواب شمس الامرا سے ... ھ میں منصب مدار المہامی پر فائز ہوئے مگر چہ ماہ نہایت کامیابی کے ساتھ کام کرنے کے بعد خدمت سے سبکدوش ہوئے۔

امیر کبیر کی ذات علما، شعرا اور مصنفین کے لئے ملجا و ماوی تھی۔ آپ علم و فن کی ترویج کے لئے لوگوں کی ہمت افزائی کا پورا سامان کرتے تھے، ان کو فکر معاش سے مستغنی کرنے کے لئے مناسب ماہوار مقرر فرماتے تھے چنانچہ حضرت فیض، قیس، آفاق، شہرت وغیرہ کو ماہواریں ملا کرتی تھیں۔

ترقی تعلیم سے آپ کو بڑی دلچسپی تھی۔ اپنے صرفے سے کئی مدرسے قائم کئے تھے، یہاں کے مدرسین کو بیش قرار ماہوار اور طلبہ کو وظائف کے علاوہ کتابوں وغیرہ سے بھی مدد دی جاتی تھی۔

امیر کبیر کے سب سے بڑے اور قابل فخر کارنامے یہ ہیں کہ آپ نے مغربی علوم و فنون خصوصاً سائنس اور ریاضی وغیرہ کی کئی کتابیں اُردو میں ترجمہ کراکے شائع فرمائیں اور اُن کی تعلیم کا انتظام فرمایا۔ اردو زبان میں مغربی علوم کے ترجمہ کرنے کی یہ سب سے پہلی کوشش تھی۔ دہلی کالج، علی گڈھ وغیرہ کی تحریکیں سب اس کے بعد کی ہیں۔ ارباب کمپنی نے کلکتہ میں نثر اردو میں قصہ کہانیاں وغیرہ کی کتابیں مرتب کرائیں تھیں، یہ کارنامہ ان دنوں تاریخ ادب اُردو کا ایک ممتاز باب سمجھا جاتا ہے، لیکن امیر کبیر نے زبان اُردو کی جو خدمت سائنس کے کتابوں کے ترجمہ کی کی ہے، وہ ان قصے کہانیوں کے کاموں سے زیادہ درخشاں اور زیادہ سود مند ہے۔

امیر کبیر کو فن تعمیر سے بھی بڑی دلچسپی تھی آپ نے کئی عالی شان عمارتیں اور بازار وغیرہ تعمیر کرائے۔



محمد ابوالفخر فخرالدین خان امام جنگ ثالث خورشید الدولہ
خورشید الملک



مہاراجہ چندولال

# مہاراجہ چندو لعل

تولد ۱۱۸۰ھ  انتقال ۱۲۶۱ھ

مہاراجہ چندو لعل بہادر، اکبری نورتن کے ایک رتن راجہ ٹوڈرمل کی اولاد سے تھے، آپ کے جد اعلیٰ رائے مول چند جو راجہ ٹوڈرمل کی پانچویں پشت سے تھے حضرت آصفجاہ اول کے زمانہ میں کروڑگیری کی تعلقداری پر مامور تھے، ان کے بعد ان کے فرزند رائے بھمی رام کو آصفجاہ ثانی نے اس خدمت سے سرفراز فرمایا۔ ان کے دو لڑکے تھے، رائے نانک رام اور رائے نارائن داس نارائن داس کے فرزند رائے چندو لال ہیں۔

بھمی رام کے مرنے پر نانک رام کو ان کی موروثی خدمت ملی۔ اور ان کے بعد ان کے فرزند رائے لکپت رائے اس جگہ مامور ہوئے مگر دو سال میں انھوں نے انتقال کیا۔

مہاراجہ چندو لعل ۱۱۸۰ھ میں تولد ہوئے، رواج زمانہ کے موافق فارسی اور عربی کی تعلیم پائی اور کافی قابلیت پیدا کی۔ سن شعور کو پہونچکر اپنے چچا نانک رام کے ماتحت سررشتہ کروڑگیری میں ایک خدمت پر مامور ہوئے اور پھر رائے لکپت رائے کے مرنے پر تعلقدار کروڑگیری ہوگئے ارسطو جاہ نے راجہ چندو لعل کی قابلیت اور لیاقت سے واقف ہوکر ان کو قلعہ سدہوٹ وغیرہ کے انتظام پر روانہ کیا، راجہ بہادر کا خطاب عطا ہوا سابقہ خدمت بھی بدستور بحال رہی جس پر آپ کے غیاب میں آپ کے بھائی کارگزار رہے۔

میر عالم بہادر کی وزارت میں آپ کو خدمت پیشکاری پر سرفراز کیا گیا اور مہاراجہ کا خطاب عطا ہوا۔ منیر الملک کی دیوانی میں آپ پیشکاری کے ساتھ دیوانی کے کاموں میں دخیل رہے اور ان کے انتقال پر اگرچہ آپ کو باضابطہ دیوانی کی خدمت نہیں ملی تھی مگر چونکہ کوئی اور شخص دیوان نہیں تھا اس لئے آپ ہی دیوانی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ خطاب راجایان مہاراجہ سے ممتاز کئے گئے۔

مہاراجہ چندو لعل نے اپنے زمانہ میں خوب ہی داد و دہش کی بیسیوں اصحاب کو جاگیرات، انعام، اور مناصب سے نہال کر دیا۔

۱۲۵۹ھ میں مہاراجہ چندو لعل خدمت پیشکاری سے مستعفی کئے گئے اور ۱۲۶۱ھ میں وفات پائی۔

آپ ایک علم دوست، ذی علم، فیاض سخی، امیر تھے، علما فضلا سے بڑی دلچسپی تھی، شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ سخن فہم اور سخن سنج تھے اس کے ساتھ ہی بلند پایہ شاعر تھے، آپ کے فارسی اور اردو کلیات شائع ہو چکے ہیں۔ شاداں آپ کا تخلص تھا۔

آپ کا کلام سنجیدہ، شگفتہ اور پسندیدہ مضامین کا گنجینہ ہے، کلام کی نمکینی، انداز بیان کی جدت اور تخیل کی بلندی آپ کی قادر الکلامی کے شاہد ہیں، آپ کے کلام کا بڑا حصہ معرفت اور تصوف سے بھرا ہوا ہے۔

آپ کے دربار میں ہر وقت شعرا کا جمگھٹا رہا کرتا تھا۔ ان کی بڑی بڑی تنخواہیں مقرر تھیں۔

مہاراجہ کی سخاوت اور خیرات عام و خاص میں مشہور تھی، بلا لحاظ مذہب و ملت فقیروں، مشائخین، گوسائیں، شاستری وغیرہ کو روزینے روپیے کے علاوہ روز میوہ، اور شیرینی پارچے، دوشالے وغیرہ بھی تقسیم ہوا کرتے تھے، بعض مرتبہ ایک ایک ہزار دوشالے روزانہ تقسیم ہوتے تھے۔

آپ کو تعمیرات سے بھی دلچسپی تھی۔ بارہ دری مشہور ہے جو باغ ارم سے موسوم تھی۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے کئی عمارتیں بنائی ہیں۔ بہرحال تاریخ دکن میں مہاراجہ چندو لعل بھی اہم شخصیت کے مالک ہیں۔

## منیر الملک ثانی

تولد ۱۱۸۴ھ وفات ۱۲۴۸ھ

علی زمان خان المخاطب غیور جنگ، منیر الدولہ، امیر الامرا، منیر الملک ثانی، غیور جنگ، صفدر یار خان کے فرزند اور شیر جنگ منیر الملک کے پوتے تھے۔ صفدر یار خان، غیور جنگ کے انتقال پر ان کے چاروں لڑکوں نے جائداد آپس میں تقسیم کر لی۔ حضرت آصفجاہ ثانی نے ان کو منیر الملک کے خطاب کے ساتھ پنج ہزاری منصب اور سہ ہزار سوار کا اعزاز عطا فرمایا اور بخشیگری فوج کی خدمت سے سرفراز کئے گئے۔

منیر الملک، میر عالم کے داماد تھے، ان کی دو لڑکیاں یکے بعد دیگرے آپ سے بیاہی گئیں۔ میر عالم نے آپ کو خانہ داماد کی حیثیت سے اپنے ہی پاس رکھا تھا۔ ان کے انتقال کے چند ماہ بعد منیر الملک خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے (۱۲۲۴ھ)

آپ کی دیوانی کے اہم واقعات حسب ذیل ہیں:—

(۱) پنڈاروں کا ہمیشہ کے لئے انسداد ہو گیا۔ ان کی لوٹ مار سے قلمرو آصفی کو نجات ملی۔
(۲) سکھوں اور عربوں میں سخت فساد ہوا فتنہ فرو ہونے کے بعد سکھوں کو شہر بدر کیا گیا۔
(۳) مبارز الدولہ نے دوسری مرتبہ ہنگامہ برپا کیا اور ان کو تا حیات قلعہ محمد نگر میں نظر بند کیا گیا۔
(۴) رود موسیٰ کو قیامت خیز طغیانی ہوئی۔
(۵) حضرت آصفجاہ ثالث نے انتقال فرمایا اور آصفجاہ رابع نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

۱۲۴۸ھ میں منیر الملک کا انتقال ہوا۔ دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ آپ کو چار لڑکے تھے: اشجع الدولہ، شجاع الدولہ، سراج الملک، اکرم الدولہ۔ منیر الملک بھی اپنے دادا کی طرح بڑے سخی تھے، محرم میں بڑی خیرات کیا کرتے، سادات اور حجاج وغیرہ ہمیشہ آپ کے ہاں مہمان رہا کرتے، لذیذ کھانوں سے بھی آپ کو رغبت تھی، ہر وقت باورچی خانہ گرم رہا کرتا۔ فی باورچی دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ دیا کرتے تھے۔ تعمیر سے بھی آپ کو دلچسپی تھی چینی خانہ، آئینہ خانہ آپ ہی کی یادگار ہیں، اورنگ آباد میں بھی آپ نے ایک محل تعمیر کیا تھا۔

## سراج الملک

تولد ۱۲۲۴ھ وفات ۱۲۶۹ھ

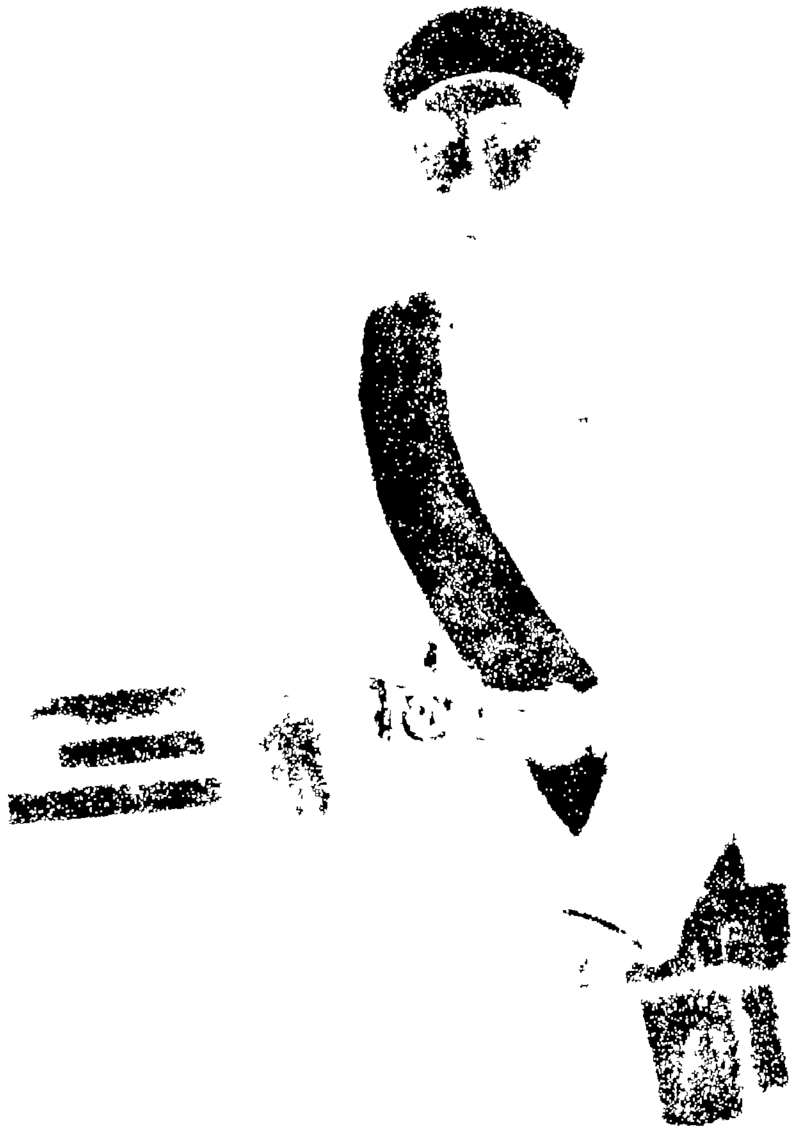
میر عالم علی خان المخاطب شیر جنگ سراج الدولہ سراج الملک، منیر الملک امیر الامرا کے تیسرے فرزند اور میر عالم کے نواسے تھے۔ سراج الملک دو مرتبہ دیوانی کی خدمت سے سرفراز کئے گئے پہلی مرتبہ ۱۲۵۹ھ میں اور دوسری مرتبہ ۱۲۶۲ھ میں۔ پہلی بار تو کچھ عرصہ کے بعد سبکدوش ہو گئے اور دوسری بار تقریباً سات سال تک یہ خدمت انجام دی اور برسر خدمت ہی آپ کا انتقال ہوا۔ دوسری مرتبہ دیوانی کے لئے رزیڈنٹ صاحب نے بڑی کوشش کی تھی۔ آپ کی دیوانی کے زمانہ میں حسب ذیل اہم واقعات ہوئے:—

(۱) عربوں اور روہیلوں میں فساد ہو گیا۔ (۲) مبارز الدولہ نے مولوی سلیم کے بہکانے سے ایک ہنگامہ کیا آخر مبارز الدولہ قلعہ محمد نگر میں نظر بند کر دیئے گئے اور مولوی سلیم کو حبس دوام کی سزا ہوئی۔ (۳) راجہ چندو لعل کی داد و دہش کے باعث خزانہ عامرہ خالی ہو گیا تھا۔ انگریزی فوج کنٹنجنٹ کی ماہوار ادا نہ ہو رہی تھی، کئی لاکھ روپیہ اس کی ماہوار کا فاضل ہو گیا تھا، اس لئے حسب مطالبہ لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ملک برار کو بطور امانی انگریزوں کے تفویض کرنا پڑا۔ طے یہ ہوا تھا کہ بعد وضع اخراجات باقی رقم سرکار عالی کے خزانہ میں داخل کی جائیگی (۱۲۶۹ھ ۱۸۵۳ء)

اس معاہدہ کے کچھ عرصہ بعد نواب سراج الملک کا انتقال ہو گیا۔ آبائی مدفن دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ سراج الملک سلیم سخن، صاحب اخلاق و مروت، باریک بین، دور رس، صاحب تدبیر امیر تھے، اہل کمال کے بڑے قدردان تھے۔ علما، و فضلاء سے بڑی محبت تھی۔



نواب سراج الملک بہادر وزیر اعظم دولت آصفیہ



میر تراب علی خان شجاع الدوله نواب مختار الملک سالار جنگ بهادر اول
وزیر اعظم دولت آصفیه

# مختار الملک

تولد ۱۲۴۴ھ وفات ۱۳۰۰ھ

میر تراب علی خان المخاطب سالار جنگ شجاع الدولہ مختار الملک، شجاع الدولہ کے فرزند تھے، اور شجاع الدولہ امیر الامرا منیر الملک کے صاحبزادے تھے، میر عالم کی دختر آپ کی دادی تھیں۔

۱۲۴۴ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، کم سنی میں شفیق باپ کے سایہ سے محروم ہوگئے، دادی اور چچا سراج الملک نے تعلیم و تربیت دی۔ عربی، فارسی کے ساتھ انگریزی سے بھی آپ بخوبی واقف تھے، فنون سپہ گری کی بھی آپ کو تعلیم دی گئی تھی۔

سراج الملک نے صرف کتابی علم کا انتظام نہیں فرمایا تھا بلکہ کاروبار ریاست کے تجربہ کا بھی انتظام ہوا، مسٹر ڈیٹس کی جگہ آپ تعلقدار بنائے گئے اور سراج الملک نے اپنی جاگیرات کا انتظام بھی آپ کے ذمہ فرمایا تھا۔ ان وجوہ سے آپ کو عملی کام کرنے کا اچھا موقعہ ہاتھ آیا۔ آپ نے جاگیرات اور سرکاری علاقے کا نہایت عمدہ انتظام فرمایا تھا۔

سراج الملک کے انتقال پر ۱۲۶۹ھ میں حضرت آصفجاہ رابع نے دیوانی کے لئے آپ کو منتخب کیا، اور قلمدان وزارت آپ کے سپرد ہوا، اس وقت آپ چوبیس سالہ نوجوان تھے۔

نواب مختار الملک کی دیوانی کے اہم واقعات، اصلاحات، اور جدید تنظیم وغیرہ سے معلوم ہیں، اس مختصر یادداشت میں ان کا اظہار ہے، تو بعض اہم واقعات یہ ہیں :۔

(۱) حضرت آصفجاہ رابع غفران منزل کا ۱۲۷۳ھ میں انتقال ہوا۔ اس کے بعد پھر آپ ہی کی وزارت میں آصفجاہ خامس نے بھی ۱۲۸۵ھ میں عالم جاودانی کی راہ لی، اعلیحضرت غفران مکان میر محبوب علی خان مسند حکومت پر بٹھائے گئے اور ریجنسی کے ذریعہ ریاست کا کام ہونے لگا۔

(۲) آپ ہی کے دیوانی کے زمانہ میں ہندوستان کا وہ فتنہ برپا ہوا جو غدر ۱۸۵۷ء کے نام سے مشہور ہے، حیدرآباد میں بھی اس آگ کی چنگاریاں پہونچیں مگر آپ کے حسن انتظام نے ان کو فوراً سرد کر دیا۔

(۳) بحیثیت دیوان سلطنت آصفیہ آپ نے یورپ کا سفر فرمایا۔

(۴) پہلی مرتبہ سلطنت آصفیہ کے رئیس نے دربار قیصری دہلی میں شرکت فرمائی۔

(۵) ایک سخت قحط ہوا، جس کا انتظام اعلیٰ پیمانہ پر کیا گیا۔

(۶) نیا محل تعمیر ہوا افضل گنج کی آبادی ہوئی۔

(۷) جنگ میں جدید اصلاحات جاری ہوئے۔ مالگزاری، تعلیم، عدالت، تعمیرات وغیرہ کی تنظیم ہوئی۔

ان اصلاحات کی مختصر روئداد حسب ذیل ہے :۔

**(الف)** مالگزاری کا جدید انتظام ہوا، قدیم طریقہ ملک کو قول اور ٹھیکہ پر دینے کا موقوف کیا گیا، اس کے بجائے سرکار نے خود محال کے وصول کرنے کا قاعدہ نافذ کیا، تحصیلدار، تعلقدار، صوبہ دار مقرر ہوئے، ملک کو چار صوبوں میں تقسیم کیا گیا۔ مجلس مالگزاری قائم ہوئی ان وجوہ سے ساہوکاروں اور دولت مند اصحاب کے ظلم و ستم سے رعایا محفوظ و مامون ہوگئی۔

(ب) عدالت کے لئے جدید محکمے، فوجداری، دیوانی، عدالت عالیہ کا قیام عمل میں آیا اور منظم طور پر عدالت کا کاروبار ہونے لگا۔ عدالتوں کے لئے شرع اسلام اور دھرم شاستر کو قانون قرار دیا گیا اسی کے لحاظ سے فیصلے ہونے لگے۔

(ج) ملک کی تعلیم کی طرف پوری توجہ کی گئی اضلاع اور تعلقات میں مدرسے کھولے گئے حیدرآباد میں مدرسہ دارالعلوم، مدرسہ عالیہ وغیرہ کا افتتاح کیا گیا۔

(د) تعمیرات کے لئے جدید محکمہ قایم ہوا۔ نئے راستے بنائے گئے، قدیم عمارات کی ترمیم ہونے لگی۔

(و) قلمرو آصفی میں ریل اور تار جاری ہوئے۔ (۱۰) فوج کی اصلاح ہوئی باقاعدہ فوج کی بنیاد قائم ہوئی۔

غرضکہ اصلاحات اور انتظامات کی ایک طویل فہرست ہے، بہرحال نواب مختار الملک نے ایک باقاعدہ اور منظم ریاست کی صورت میں سلطنت آصفیہ کو مبدل کر دیا لیکن رئیس وقت ساتھ نہ دے تو وزیر کی بساط نہیں کہ کچھ انتظام کر سکے، سر سالار جنگ کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو ایسے رئیس ملے جو ان کے کاموں کو نہ صرف اچھی نظر سے دیکھ کر قدر فرمائی بلکہ ان کے نفاذ کے لئے احکام صادر فرمائے۔

سنہ ۱۳۰۰ھ میں نواب مختار الملک کا ہیضہ سے انتقال ہوا، اور دائرۂ میر مومن میں دفن کئے گئے۔

مختار الملک نیک مزاج، خوش خلق حسن سیرت کے انسان تھے، ان کا حافظہ غضب کا تھا، معاملہ فہمی میں اپنی آپ نظیر تھے تدبر و سیاست میں ان کا ثانی نہیں تھا، وہ ہر شخص کو دیکھ کر اس کی عادت اور خصلت سے بخوبی واقف ہو جاتے تھے۔ شعر و سخن، موسیقی کے ساتھ ریاضی اور تاریخ سے بڑا شغف تھا ——— انھیں دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔

## راجہ نریندر بہادر

تولد سنہ ۱۲۴۴ھ انتقال سنہ ۱۳۰۶ھ

راجہ نراین پرشاد نریندر بہادر، راجہ دہراج بالا پرشاد کے فرزند اور مہاراجہ چندو لعل کے پوتے تھے، راجہ راجایان راجہ بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔

سنہ ۱۲۴۴ھ میں تولد ہوئے، عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی سے بھی واقف تھے سنہ ۱۲۶۹ھ میں خدمت پیشکاری سے سرفراز ہوئے، سالار جنگ مختار الملک کے انتقال پر بہ شرکت عماد السلطنت بہادر دیوانی کے فرائض انجام دیتے رہے، اس زمانہ کا اہم واقعہ اعلیٰحضرت غفران مکان آصفجاہ سادس کا پورے اختیارات کے ساتھ مسند نشین ہونا ہے۔

راجہ نریندر بہادر ایک مدبر، فیاض، تجربہ کار، سیر چشم انسان تھے، آپ کو صرف ایک دختر تھیں جو راجہ ہری کشن بہادر سے بیاہی گئیں، مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر آپ کے نواسے اور جانشین ہیں۔

سنہ ۱۳۰۶ھ میں راجہ نریندر بہادر کا انتقال ہوا۔



مہاراجہ داران پرشاد نریندر بہادر



میر لائق علی خان سالار جنگ منیرالدوله عماد السلطنه

# عماد السلطنت

تولد سنہ ۱۲۸۰ھ وفات سنہ ۱۳۰۹ھ

میر لائق علی خان المخاطب سالار جنگ منیر الدولہ مختار الملک عماد السلطنت، مختار الملک اوّل کے بڑے فرزند تھے سنہ ۱۲۸۰ھ میں حیدرآباد میں آپ کی ولادت ہوئی، قابل باپ کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہوئی، ابتدائی تعلیم میں آپ مرحوم اعلیٰحضرت غفران مکان کے ساتھ شریک اور ہم مکتب رہے اس کے بعد مدرسہ عالیہ میں شریک ہوئے، تکمیل تعلیم کے لئے انگلستان بھی روانہ کئے گئے تھے (سنہ ۱۲۹۷ھ)

اعلیٰحضرت غفران مکان نے اختیارات کے ساتھ مسند نشین ہوتے ہی آپ کو قلمدان دیوانی مرحمت فرمایا (سنہ ۱۳۰۱ھ) آپ کی دیوانی کے اہم واقعات حسب ذیل ہیں۔

(۱) اعلیٰحضرت نے کونسل آف اسٹیٹ قائم فرمائی اور اپنی صدارت سے اس کو ممتاز کیا۔ (۲) دفتر فینانس قائم ہوا۔ (۳) مجلس وضع قوانین کا قیام ہوا۔ (۴) ویسرایان ہند کے حیدرآباد آنے کا سلسلہ قائم ہوا۔ (۵) سرکاری زبان اردو قرار دی گئی، تمام سرکاری دفاتر میں اردو میں کاروبار ہونے لگا۔

سنہ ۱۳۰۴ھ خدمت دیوانی سے آپ مستعفی ہو گئے، علٰحدگی کے بعد دوبارہ آپ نے یورپ کی سیاحت فرمائی، قسطنطنیہ میں سلطان عبدالحمید خان سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔

یورپ کے سفر سے واپسی کے بعد سنہ ۱۳۰۹ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ خاندانی مدفن دائرہ میر مومن میں سپرد خاک کئے گئے۔

عماد السلطنت نہایت قابل فرد تھے، ذہن اور حافظہ میں وہ اپنے باپ سے بھی سبقت لے گئے تھے، آپ کی ذہانت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ قسطنطنیہ میں ایک ہفتہ میں ترکی زبان میں اتنا ملکہ حاصل کر لیا کہ ڈنر کے موقع پر اسی زبان میں تقریر فرمائی۔ آپ کے مضامین موقر رسالوں میں شائع ہوتے تھے، آپ کے ایک مضمون پر گلاڈسٹون نے تعریفی خط لکھا تھا۔

آپ کی خوش اخلاقی اور ملنساری کا سب کو اعتراف تھا۔ فنون سپہ گری سے بھی آپ کو دلچسپی تھی۔ والنٹرکور آپ ہی نے قائم فرمائی تھی اعلیٰحضرت غفران مکان کے ساتھ اکثر سیر و سیاحت میں ہم رکاب رہا کرتے تھے۔

# امیر اکبر سر آسمان جاہ

تولد سنہ ۱۲۵۶ھ انتقال سنہ ۱۳۱۶ھ

محمد ظہیر الدین خان آسمان جاہ کے والد محمد سلطان الدین خان سیف جنگ تھے، سنہ ۱۲۵۶ھ میں تولد ہوئے، آپ کی صغیر سنی میں والد کا انتقال ہو گیا، اس لئے چچا محمد رفیع الدین خان امیر کبیر ثانی نے آپ کی پرورش فرمائی اور ان ہی کی نگرانی میں تعلیم ہوئی۔ نواب رحمت یار جنگ بہادر کوتوال کے دادا آپ کے استاد تھے۔

مختلف اوقات میں آپ کو حسب ذیل خطابات عطا ہوئے۔

"رفعت جنگ بشیر الدولہ عمدۃ الملک امیر اکبر آسمان جاہ" سرکار عالی کی مختلف خدمات کو آپ نے بحسن و خوبی انجام دیا جن کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

۱۲۸۶ھ میں نواب مختار الملک نے سلطنت آصفیہ کی جدید تنظیم فرمائی تھی، چار صدر المہام مقرر کئے تھے، ان میں سے ایک نواب بشیر الدولہ آسماں جاہ بھی تھے، عدالت کا سررشتہ آپ سے متعلق تھا۔ مولوی سید محمد مودودی صاحب معتمد تھے۔ آسمان جاہ یہ خدمت بلا تنخواہ انجام دیتے رہے۔

اس کے بعد جب نواب مختار الملک انگلستان تشریف لے گئے تو اپنے سررشتہ کا کام مدار المہام کی حیثیت سے کرتے رہے، او مختار الملک کے انتقال پر ایجنسی کے رکن ہو گئے اس زمانہ میں آپ ہی نے ویسرائے کی خدمت میں مرحوم اعلیٰحضرت غفران مکان کو پورے اختیارات کے ساتھ مسند نشین کرنے کی تحریک کی تھی۔ پرنس آف ویلز (اڈورڈ ہفتم) کے ہندوستان آنے پر بمبئی میں آسمان جاہ نے سلطنت آصفیہ کی جانب سے استقبال کے فرائض انجام دئے تھے اور اس کے بعد ۱۳۰۴ھ میں ملکہ وکٹوریہ کی پنجاہ سالہ جوبلی میں سرکار عالی کی جانب سے شرکت فرمائی تھی۔

اسی ۱۳۰۴ھ میں جبکہ آپ لندن میں تھے آپ کو قلمدان مدار المہام سے سرفراز کیا گیا۔ خاندان پائگاہ میں آپ ہی سب سے پہلے شخص ہیں جن کو یہ خدمت عطا ہوئی تھی، آسماں جاہ کے زمانہ وزارت میں مختلف اصلاحیں ہوئیں سررشتہ عدالت، اور کروڑگیری میں اصلاح ہوئی۔ موازنہ، مداخل مخارج میں تنظیم ہوئی، آبرسانی، رجسٹریشن کے دفاتر قائم ہوئے۔

اس کے علاوہ بعض سیاسی مقدمات مثلاً جیکب کا ہیرا کا مقدمہ، سردار جنگ کا ریلوے و معدنیات کا مقدمہ، مہدی حسن کی میم کا مقدمہ، سرور الملک کے رشوت کا مقدمہ وغیرہ بھی آپ کی وزارت کے اہم ترین واقعات ہیں جو حیدرآباد کے میدان سیاست میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۳۱۱ھ میں آسماں جاہ نے مدار المہامی سے علحدگی اختیار کی اور ۱۳۱۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ درگاہ برہنہ شاہ میں مدفون ہوئے۔ آسماں جاہ کو سیر و سیاحت سے دلچسپی تھی یورپ کے کئی ممالک دیکھے، مصر میں خدیو مصر سے ملاقات کی، ہندوستان کے شمالی او جنوب کے کئی شہر کا معائنہ کیا۔

انگلستان میں آپ کی بڑی عزت و وقعت ہوتی تھی، کئی دعوتیں ہوئیں تھیں۔ زمانہ وزارت میں "سر" کا خطاب ملا تھا۔

آپ کو تعمیر عمارات کا بڑا شوق تھا، بشیر باغ، آسمان گڈھ، اکبر باغ، سرور نگر کا باغ سب آپ کی یادگار رہیں، اس کے علاوہ اجمیر کا سماع خانہ، درگاہ حضرت شاہ خاموش، عمدہ ساگر، چوک کی گھڑیال، آپ ہی کے تعمیر کئے ہوئے ہیں۔

آسمان جاہ نہایت وسیع اخلاق، شرم و حیا کے پتلے تھے، اپنے ملازمین کی بڑی قدر کرتے ان کے متوسلین کے ساتھ حسن سلوک کرتے تھے۔

نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کی صاحبزادی سے آپ کی شادی ہوئی تھی، مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

نواب معین الدین خان (امانت جنگ معین الدولہ بہادر) آپ کے اکلوتے فرزند ہیں۔ جو معین المہامی کی خدمت کئی سال تک انجام دے چکے ہیں اور شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا دیوان معینِ سخن آج کل زیر طبع ہے۔



محمد مظہر الدین خان رفعت جنگ بشیر الدولہ عمدۃ الملک
اعظم الامرا امیر کبیر سر آسمان جاہ



محمد فضل الدین خان سکندر جنگ اقبال الدولہ اقتدار الملک
سر وقار الامراء

# اقبال الدّولہ وقار الامراء

تولد ۱۲۷۲ھ وفات ۱۳۱۹ھ

محمد فضل الدین خان المخاطب سکندر جنگ اقبال الدولہ اقتدار الملک وقار الامراء، کے والد محمد رشید الدین خان امیر کبیر ہیں۔ آپ خورشید جاہ کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۲۷۲ھ میں ولادت ہوئی اور ۱۳۱۹ھ میں عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔

ابتداً اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم پائی، جوانی میں انگریزی تعلیم سے بھی استفادہ فرمایا۔

نواب آسمان جاہ کی وزارت کے زمانہ میں آپ نے صدر المہام مالگزاری کی خدمت انجام دی اور ان کے بعد مدار المہامی کی خدمت جلیلہ پر سرفراز ہوئے (۱۳۱۱ھ) سات سال سے زیادہ اس خدمت کو انجام دیکر ۱۳۱۹ھ میں مستعفی ہوئے، اور چند ماہ کے بعد انتقال فرمایا۔ خاندانی قبرستان درگاہ بر ہنہ شاہ میں سپرد خاک کئے گئے۔

نواب فضل الدولہ آصفجاہ خامس کی دختر نیک اختر سے آپ کا بھی عقد ہوا، ان کے بطن سے آپ کے بڑے فرزند نامور جنگ سلطان الملک کی پیدائش ہوئی آپ کے دوسرے فرزند محمد ولی الدین خان المخاطب ولی الدولہ مرحوم تھے۔

وقار الامراء یورپ بھی تشریف لے گئے تھے اور آٹھ ماہ تک وہاں آپ کا قیام رہا۔ یورپ کے طریقہ تعلیم سے بڑے متاثر ہوئے اور اپنے دونوں لڑکوں کو وہاں تعلیم کے لئے روانہ فرمایا۔ ولی الدولہ مرحوم کئی سال تک ریڈین کالج میں زیر تعلیم رہے۔

وقار الامراء داد و دہش میں بڑے مشہور تھے، نہ صرف اپنے ذاتی خزانہ سے بلکہ دیوانی کے زمانہ میں سرکاری خزانہ سے بھی آپ نے خوب سخاوت فرمائی۔

آپ کے زمانہ وزارت میں سررشتہ علوم وفنون کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اولاً سید علی بلگرامی نے کئی کتابوں کا ترجمہ فرمایا اور پھر مولانا شبلی مرحوم اس سررشتہ کے ناظم قرار پائے تھے۔ مولانا نے کئی کتابیں اسی زمانہ میں تالیف فرمائیں۔

وقار الامراء نے بصرف کثیر فلک نما کی تعمیر فرمائی تھی۔ مگر اس کے بعد قرضہ کی وجہ سے (۲۲) لاکھ میں اس کو اعلیٰحضرت کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

نواب وقار الامراء کے چھوٹے فرزند نواب ولی الدولہ بہادر نے کئی سال تک صدر اعظمی کی خدمت انجام دی۔ وہ اپنے اخلاق، سادہ مزاجی اور نیک طبع کی وجہ سے بہت ہر دل عزیز تھے چنانچہ دو سال قبل جب وہ حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے اور وہیں انتقال فرمایا تو اہل ملک کو ان کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ ان کی بیگم صاحبہ کو علم وفضل اور اصلاح نسواں سے خاص شغف ہے، اور حیدرآباد کی کوئی مجلس نسواں ان کے مشوروں اور امداد سے محروم نہیں رہتی

# مہاراجہ یمین السلطنت بہادر

تولد ۱۲۷۹ھ

رائے کشن پرشاد الخاطب راجہ راجایان مہاراجہ راجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت بہادر، راجہ ہرکشن کے فرزند اور راجہ نریندر بہادر کے نواسے ہیں۔

حیدرآباد میں ۱۲۷۹ھ میں آپ کی ولادت ہوئی نانا کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہوئی، گھر کی تعلیم کے بعد مدرسہ عالیہ میں تعلیم پائی۔ اُردو، فارسی، عربی، انگریزی وغیرہ میں کافی مہارت حاصل فرمائی۔

نانا کے انتقال پر ان کی جاگیرات آپ کے نام بحال کی گئیں اور ۱۳۱۰ھ میں خدمت پیشکاری اور معین المہامی فوج سے سرفراز کئے گئے، سروقارالامرا کے مستعفی ہوتے پر خدمت جلیلہ مدارالمہامی پر اولاً منصرم (۱۳۱۹ھ) اور پھر مستقل کئے گئے (۱۳۲۰ھ) کامل دس سال کے بعد ۱۳۳۰ھ میں اس سے مستعفی ہوئے۔ دوبارہ ۱۳۴۵ھ میں صدارت اعظمیٰ پر آپ کا تقرر ہوا۔ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ میں بوجہ پیرانہ سالی آپ نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

آپ کا زمانہ مدارالمہامی اور صدارت عظمیٰ اہم واقعات اور انتظامات سے مملو ہے جس کی مختصر صراحت بھی طویل صفحات کی متقاضی ہے۔

اعلیٰحضرت آصفجاہ سادس غفران مکاں نے آپ ہی کی مدارالمہامی کے زمانہ میں فردوس بریں کی راہ لی اور اعلیٰحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ برار کے متعلق قطعی تصفیہ ہوا، بیسیوں جدید محکمے قائم ہوئے، بیسیوں فاتر کی اصلاح اور تنظیم ہوئی، نئی اسکیمیں جاری ہوئیں محکمہ جات عینانس تعمیرات، مالگزاری، عدالت تعلیمات، فوج غرض ہر ہر سررشتہ میں اس قدر اصلاحیں ہوئیں کہ ان کا اظہار دشوار ہے۔

مہاراجہ بہادر کی ذات محاسن اور اخلاقی خوبیوں سے مملو ہے، آپ کی عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت، تلنگی، مرہٹی، اردو، ہندی کیا منظمہ ہے آپ اُردو، اور فارسی کے زبردست شاعر اور ادیب ہیں، داغ اور آصف سے تلمذ حاصل ہے نعت اور تصوف میں آپ کا کلام بجد دلچسپ اور دل آویز ہوتا ہے۔ شاد آپ کا تخلص ہے۔

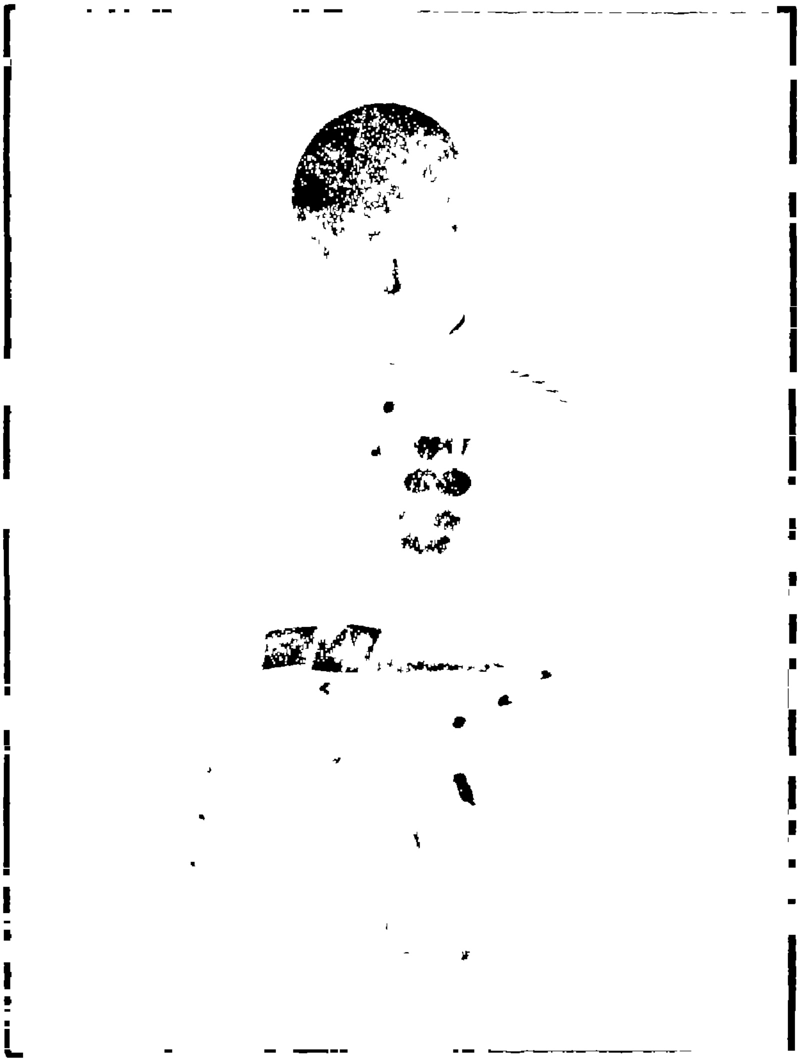
مشرقی امراء کا آپ زندہ نمونہ ہیں، حسن و اخلاق، سخاوت، مروّت، رواداری آپ کے خصوصی اور امتیازی جوہر ہیں، فقیر دوست، فقیر منش اور صوفی مشرب ہیں، آپ کے یہاں ہمیشہ فقرا، صوفیا، مشائخین، شعرا، اور اہل کمال کا مجمع رہا کرتا ہے۔ مشاعرے ہوا کرتے ہیں۔

مہاراجہ بہادر کو تصنیف و تالیف سے بھی شغف ہے کئی درجن کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں، نظم و نثر پر آپ کو پورا عبور حاصل ہے، نہایت خوش خط ہیں، درگاہوں، مندروں، مسجدوں کی زیارت کا شوق ہے۔ ہندوستان کے مشہور زیارت گاہوں خواہ ہندوؤں سے متعلق ہوں یا مسلمانوں کی آپ نے دونوں کی زیارت کی ہے۔

علم دوستی، سخاوت، رواداری میں آپ اپنے جد اعلیٰ مہاراجہ چندولعل کے مکمل نمونہ ہیں۔

گورنمنٹ انگریزی میں بھی آپ کو اعزاز حاصل ہے چنانچہ "کے، سی، آئی، ای۔" اور "جی، سی، آئی، ای" کے خطابات آپ کو ملے ہوئے ہیں۔

بہرحال مہاراجہ بہادر، ایک نیک مزاج، خوش اخلاق اور مالک کے وفادار امیر ہیں۔



مہاراجہ یمین السلطنت سرکشن پرشاد بہادر

# سالار جنگ بہادر

(ولادت ۱۳۰۶ھ)

نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ بہادر، عماد السلطنت مختار الملک ثانی کے اکلوتے لختِ جگر ہیں، ۱۴ر شوال ۱۳۰۶ھ کو بمقام پونا آپ کی ولادت ہوئی، ایک ماہ کے اندر ہی سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور پھر مدرسہ عالیہ میں شریک کئے گئے ۱۹۰۲ء میں آپ نے مڈل کا امتحان کامیاب کیا اور پھر میٹرک میں کامیاب ہوے۔ آپ نے مدرسہ میں اپنے عمدہ اخلاق سے نہ صرف ہم کلاس طلبہ کو گرویدہ کر لیا بلکہ اساتذہ کو بھی اپنا مداح بنا لیا مسٹر سیلن سابق پرنسپل آپ کی طالب علمانہ خوبیوں کا ہمیشہ اعتراف کرتے رہے۔

**اعلیٰ حضرت سلطان العلوم** نے اپنی مسند نشینی کے پہلے ہی سال آپ کے اسٹیٹ کی کورٹ کی نگرانی کو برخاست کر کے آپ کی نگرانی میں دے دیا۔ بااختیار ہو کر آپ نے اپنے جاگیرات کا دورہ کیا۔ رعایا کی حالت بچشم خود معائنہ کر کے ان کی اصلاح اور صلاح و فلاح کے احکام دئے۔

اس کے چند ماہ بعد ۲۵ رجب ۱۳۳۲ھ میں آپ مدار المہامی کی جلیل القدر خدمت سے سرفراز کئے گئے تقریباً تین سال آپ نے اس خدمت کو انجام دیا آپ کے زمانہ میں کئی جدید محکمے قائم ہوے، آب پاشی، آب رسانی کو وسعت ہوئی، تعمیرات کی ترقی ہوئی، تعلیمات میں جدید اسکیم نافذ ہوئے جس کی تفصیل آخر میں درج ہے۔

محرم ۱۳۳۳ھ کو آپ نے خدمت مدار المہامی سے سبکدوشی حاصل کی۔ علم و فن، تعلیم، صنعت و حرفت سے آپ کو بڑی دلچسپی ہے، اس کی تفصیلی صراحت کا یہاں موقع نہیں ہے۔ البتہ چند امور درج کئے جاتے ہیں:۔

مدرسۂ دار العلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی کی آپ نے صدارت فرمائی اور حوصلہ افزا خطبہ سنایا، آپ ہی کے عہد وزارت میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔

مسلم یونیورسٹی کو ایک لاکھ کا گراں قدر چندہ عطا فرمایا۔ اور سالانہ بارہ سو روپے بحال رکھے۔ انجمن ترقی اُردو کو دس ہزار کا چندہ دیا اپنے اعزہ اور متوسلین کی تعلیم کی طرف خاص توجہ مبذول ہے، ہونہار طلبہ کو ہندوستان اور یورپ میں تعلیم پانے کے لئے وظائف سے امداد فرماتے ہیں۔

صنعت و حرفت کے فروغ کے لئے آپ نے دلچسپی لے کر کئی کمپنیوں کی ڈائرکٹری قبول فرمائی ہے۔ اور بیسیوں کمپنیاں خود آپ نے قائم کیں جو کامیابی سے چل رہی ہیں۔

آپ کا سب سے زیادہ قابل قدر کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے "ولی" کے دو صد سالہ جشن کی صدارت فرمائی اور دکھنی ادب کی سرپرستی کا اعلان کیا چنانچہ آپ کی توجہ اور گراں قدر عطیہ سے بیسیوں دکھنی ادب کی قابل قدر کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو رہی ہیں۔ یہ آپ کا کارنامہ ہے جس پر موجودہ اور آئندہ نسلیں فخر کریں گی زمانہ مٹا سکے گا اور نہ حوادثات اس کو محو کر سکیں گے۔

ایک اور عظیم بالشان اسکیم آپ کے زیر غور ہے وہ یہ ہے کہ آپ کا ارادہ ہے کہ ایک عالی شان محل تعمیر کیا جائے اور اس میں

آپ کے یہاں کے عجائبات اور نادر روزگار اشیاء اور نایاب کتابیں وغیرہ پبلک استفادہ کا موقع دیا جائے۔

یہ اسکیم جس قدر مفید جس قدر ضروری اور کار آمد ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، خدا سے دعا ہے کہ آپ کے نیک ارادے کو جلد عملی صورت نصیب ہو جائے۔

نواب سالار جنگ بہادر کے عہد وزارت میں قانون و قواعد اوزان و پیمانہ جات جاری کئے گئے۔ مسالخ پر سند یافتہ ملاؤں کا جو ماہوار یاب ہوں تقرر کرنے کا حکم دیا گیا عارضی دستور العمل تھا ممالک محروسہ سرکار عالی نافذ کیا گیا اور مسٹر ویکفیلڈ کمشنر تھا مقرر کئے گئے۔ اراضی نامہ جات جو بندوبست کی شنوائی کے وقت پیش ہوں ان کا قطعی تصفیہ تعلقداران ضلع کو کرنے کا حکم ہوا۔ سیول سرویس کلاس قائم ہوئی اور قواعد داخلہ و انتخاب طلبہ بنائے گئے، قانون تادیب خانہ جات ممالک محروسہ سرکار عالی نافذ ہوئے۔ جدید جوڈیشل کمیٹی کی تنظیم عمل میں لائی گئی، مائینگ بورڈ کا قیام منظور فرمایا گیا انگریزی الفاظ کے سرکاری مراسلات میں استعمال کرنے کی ممانعت فرمائی گئی۔ ضابطہ جوڈیشل کمیٹی ممالک محروسہ سرکار عالی نافذ کیا گیا قواعد پولیس ٹریننگ اسکول جاری کئے گئے۔ حسب ذیل طلبہ کو وظیفہ تعلیمی یوروپ و ایشیاء دیا گیا:۔

(۱) سمیع اللہ شاہ بی، ایس، سی ولد سید امجد اللہ سول انجینیرنگ۔ ۲۔ سید محمد یونس بی، اے ولد سید عطا حسین سول انجینیرنگ۔ ۳۔ حیدر علی خاں ایل یم یس ولد حکیم دادے علی طبابت۔ ۴۔ محمد الیاس برنی ام، اے ولد محمد ابراہیم (زیر تصفیہ)

## وظائف تعلیم ایشیا

۱۔ محمد سراج الدین احمد ولد ڈاکٹر معین الدین انجینیرنگ۔ ۲۔ ام، اے۔ لناریلو ولد یم ل انڈیا طبابت۔ ۳۔ دی ایچ کونا پور ولد ہنمنت راؤ کونا پور طبابت محکمہ آثار قدیمہ ممالک محروسہ سرکار عالی قائم کیا گیا اور غلام یزدانی صاحب بی، اے ان کی نظامت پر تقرر ہوا قانون انجمن ہائے امداد قرضہ نافذ ہوا۔ قواعد نگرانی اقوام جرائم پیشہ جاری کئے گئے اور قواعد امتحان زبان دانی عہدہ داران سررشتہ تعلیمات نافذ ہوئے۔

نواب صاحب نے گذشتہ نو سال کے عرصے میں تقریباً پچا نوے ہزار روپے سے ہندوستان اور انگلستان میں تعلیم پانے والے طلبہ کی امداد فرمائی اور تقریباً اٹھارہ ہزار روپے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور مدرسہ آصفیہ کی ماہانہ امداد میں اور تقریباً بیس ہزار روپے اخبارات و رسائل کے چندوں میں عطا کئے ہیں۔ اس کے علاوہ موقتی طور پر علمی و ادبی انجمنوں اور اصحاب کو بھی خاطر خواہ رقمی امداد کرتے رہتے ہیں۔

**نصیر الدین ہاشمی**

## ایمان سخن

ادارۂ ادبیات اردو کے سلسلۂ انتخابات شعرائے دکن کی ایک دلچسپ کتاب جس میں مولوی سید محمد صاحب ام، اے نے نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد کے ملک الشعراء کا کلام انتخاب کر کے اپنے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے قیمت ۱۲ر



نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ بہادر



صدر پرورش علی خان مکرم الدوله

# سر سیّد علی امام مؤید الملک مرحوم

سر سید علی امام المخاطب مؤید الملک مرحوم آپ کے والد سید امداد امام مرحوم المتخلص بہ اثر۔ پٹنہ کے روساء سے تھے۔

آپ کا خاندان سادات بارہہ سے تعلق رکھتا ہے۔

سید علی امام کی پیدائش ۱۸۶۹ء میں مضافات پٹنہ میں ہوئی والد کی نگرانی میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی، سید امداد امام بڑے خوش قسمت تھے کہ اُن کے دونوں فرزند سید علی امام اور حسن امام ہندوستان کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔

سید علی امام گھر کی تعلیم کے بعد ضلع آرہ کے اسکول میں شریک ہوئے پھر پٹنہ میں کالج کی تعلیم پائی اس کے بعد انگلستان جاکر بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی ۱۸۹۰ء میں یورپ سے واپس آئے اور پٹنہ میں وکالت شروع کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں پٹنہ ہائی کورٹ کے وکلاء میں ممتاز شخصیت پیدا کرلی آپ ہی وہ پہلے مسلمان ہیں جو ویسرائے ہند کی کونسل میں ممبر کی حیثیت سے مامور کئے گئے کئی سال تک آپ نے اس خدمت کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ ایک طرف گورنمنٹ آپ کے کام کی قدر دان اور آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی تو دوسری طرف رعایا میں بھی ہر دل عزیز تھے اس قسم کی خوش نصیبی بہت کم اصحاب کو میسر آتی ہے۔

اس خدمت کے بعد پھر آپ نے وکالت شروع کی مگر بہت جلد پٹنہ ہائی کورٹ میں جج ہوگئے اور اس کے بعد صوبہ بہار کی کونسل میں مامور ہوئے۔ اسی خدمت سے آپ حیدرآباد میں طلب کئے گئے (۱۳۳۷ھ ۱۹۱۹ء) اور صدارت عظمیٰ کی جلیل القدر خدمت آپ کے تفویض کی گئی۔ زمانہ مابعد میں مؤید الملک کا خطاب بھی آپ کو دیا گیا۔ آپ کے صدارت عظمیٰ کے زمانہ میں یہاں کئی اصلاحیں ہوئیں اور جدید تنظیمات ہوئے، جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں (۱) باب حکومت کا قیام ہوا۔ اور سررشتہ جات کی جدید تنظیم ہوئی۔ (۲) دفتر ترقیات عامہ کا قیام ہوا غیر آباد مقامات کو آباد کرنے اور آبادی کو وسعت دینے کی بڑی اسکیم پیش نظر تھی۔ (۳) عدالت اور مال کے حکام کی علحدگی عمل میں آئی تعلقداراور تحصیل داروں سے عدالتی اقتدار علحدہ ہو کر عدالت کے لئے جدید عہدہ دار مقرر کئے گئے۔ (۴) دفاتر سرکار عالی میں تنخواہ کے متعلق جدید اسکیم ٹائم اسکیل کا نفاذ عمل میں آیا (۵) معاہدات برار نظر ثانی ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی جدید کئی اصلاحیں ہوئیں ان کی صراحت طوالت کا موجب ہے۔

حیدرآباد ہی کے زمانہ میں آپ جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) میں ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک کئے گئے۔ ۱۳۴۱ھ میں سر مؤید الملک نے صدارت عظمیٰ سے کنارہ کشی اختیار کرلی مگر اس کے بعد بھی وہ مشیر کی حیثیت سے اپنے انتقال تک حیدرآباد آتے رہے۔

سر علی امام نے بحیثیت ہندوستانی اور بحیثیت مسلمان ہندوستان میں بہت کچھ کام کئے ہیں وہ مسلم لیگ کے صدر نشین بھی ہوئے تھے ہندو اور مسلم دونوں میں وہ ہر دل عزیز تھے۔

سر علی امام بڑے خوددار، مدبر، سیاست داں تھے وہ حسن اخلاق اور حسن سیرت سے آراستہ تھے۔ ۱۹۳۲ء میں انتقال ہوا۔ رانچی میں دفن کئے گئے۔

# ہز اکسلنسی رائٹ انزیبل سر اکبر حیدری نواز جنگ بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ

محمد اکبر الخاطب رائٹ آنریبل سر حیدر نواز جنگ بہادر کے والد نذر علی مرحوم کھمبات کے متوطن اور بمبئی کے نامی گرامی تاجر تھے، حیدری آپکا خاندانی لقب ہے۔

سر اکبر کی ولادت نومبر ۱۸۶۹ء میں بمبئی میں ہوی، ابتدائی تعلیم اپنی والدہ اور نانی سے پائی، آپ کی نانی بمبئی کے مشہور جسٹس بدرالدین طیب جی کی حقیقی بہن تھیں۔ بمبئی کے سینٹ زیویر کالج سے سترہ سال کی عمر میں آپ نے بی، اے میں کامیابی حاصل کی۔ اس سے آپ کے تعلیمی شوق، خداداد حافظہ، اور غیر معمولی ذہن کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

تعلیم کے بعد سر اکبر گورنمنٹ آف انڈیا کی سلک ملازمت میں داخل ہوگئے اولاً ناگپور کے صیغہ حساب میں ایک افسر کی حیثیت سے مامور ہوے (۱۸۸۸ء) اس کے بعد لاہور پھر کلکتہ میں کارگذار رہے اور وہاں سے الہ آباد کی محاسبی میں اسسٹنٹ اکاونٹنٹ جنرل کی جگہ پر ترقی ملی الہ آباد سے آپ کا تبادلہ بمبئی میں ہوا، اور پھر بمبئی سے مدراس کی ڈپٹی اکاونٹنٹ جنرلی پر مامور کئے گئے، اسی خدمت سے آپ حیدر آباد میں طلب کئے گئے۔

مدراس کی ملازمت کے زمانہ میں آپ ہندوستان و برہما کے سرکاری مطابع کی جانچ پرتال پر مقرر کئے گئے تھے اس کام کو بھی آپنے نہایت خوبی سے انجام دیا۔

۱۹۰۵ء (۱۳۲۱ف) میں سر اکبر حیدری کا تقرر صدر محاسبی سرکار عالی پر ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر (۳۶) سال کی تھی۔ دو سال کے بعد معتمدی فینانس پر آپ کا تقرر ہوا اور پھر ۱۳۲۳ف (۱۹۱۱ء) میں معتمد عدالت وکوتوالی امور عامہ پر تبادلہ ہوگیا۔ اس خدمت پر ایک طویل زمانے تک مامور رہے۔ کچھ عرصے تک اس خدمت کے ساتھ آپ نے صدر ناظم صنعت وحرفت کا کام بھی انجام دیا ۱۳۳۹ف (۱۹۲۰ء) میں سر اکبر سرکار عالی کی ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کرکے بمبئی میں اکاونٹنٹ جنرل کی خدمت پر مامور ہوگئے۔ مگر اس کے چند ماہ بعد پھر جولائی ۱۹۲۱ء میں صدر المہام فینانس کی جگہ آپ کا تقرر ہوا اس طرح آپ دوبارہ سرکار عالی کی سلک ملازمت میں شامل ہوگئے۔

صدر المہامی فینانس کے بعد ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۶ء) میں سر اکبر صدر اعظم کی جلیل القدر خدمت پر مامور کئے گئے اور تقریباً دو سال سے آپ اس خدمت کو بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔

جس زمانہ میں سر اکبر حیدر آباد آکر صدر محاسب ہوے تھے، اس وقت صدر المہامی اور مدار المہامی (صدر اعظم) کے خدمات حیدر آباد کے مخصوص امرا اور جاگیرداروں کے لئے مختص تھے کسی اعلیٰ عہدہ دار خواہ وہ معتمد ہی کیوں نہ ہو ترقی پاکر صدر المہام یا صدر اعظم ہوجانا محال تھا اس لئے اس وقت یہ شائبہ نہیں تھا کہ ایک دن سر اکبر صدر اعظم کی جلیل القدر خدمت پر مامور ہوجائیں گے لیکن ایک زمانہ وہ آیا کہ اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع کے تدبر اور دور بین نظر کے باعث قابل اور لائق اشخاص اپنی اعلیٰ قابلیت اور عمدہ لیاقت کے باعث صدر المہام اور صدر اعظمی پر ترقی پانے لگے۔ اس قسم کا سب سے پہلا اعزاز سر فریدون الملک کو ملا تھا وہ



رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ صدر اعظم بہادر



محی الدین خاں تیغ جنگ سر خورشید جاہ



رشید الدین خاں وقار الامراء شمس الامراء امیر کبیر

سرکارِ عالی کی ایک معمولی خدمت سے ترقی کرتے ہوئے سب سے اعلیٰ خدمت صدرِ اعظمی پر مامور کئے گئے تھے۔ ان کو یہ اعزاز محض ان کی لیاقت، قابلیت، دیانت اور وفاداری کے طفیل ملا تھا۔ سر فریدون الملک کے بعد سر اکبر وہ شخص ہیں جو سرکارِ عالی کی صدر محاسبی سے ترقی کرتے ہوئے صدرِ اعظمی پر سرفراز کئے گئے ہیں، سر اکبر کو بھی یہ خدمت انہی کی طرح لیاقت قابلیت کے بل بوتے پر ملی ہے

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے سر اکبر ہندوستان کے کئی صوبوں سی پی، پنجاب، بنگال، یوپی، بمبئی اور مدراس میں مامور رہے ہر جگہ آپ نے سرکاری خدمات کو حسن و خوبی سے انجام دیا اور اپنے بعد وہاں اپنی خوش گوار یادگار چھوڑی۔ حیدرآباد میں بحیثیت معتمدی اور صدر المہامی مختلف سررشتہ جات آپ سے متعلق رہے، ہر سررشتہ میں دلچسپی لے کر آپ نے اصلاح کی کوشش فرمائی۔ جن کی تفصیل اس موقع پر طوالت کا موجب ہوگی۔

لیکن خصوصیت سے بعض سررشتہ جات کا ذکر ضروری ہے کیونکہ اس کے اظہار کے بغیر آپ کے حالات مکمل نہیں ہو سکتے سررشتہ آثار قدیمہ کا قیام آپ کی توجہ کا رہین منت ہے۔ سررشتہ طبابت کی اصلاح آپ کا ایک کارنامہ ہے،

سررشتہ تعلیمات کی جدید تنظیم اور جامعہ عثمانیہ کا افتتاح آپ کے نمایاں خدمات سے تعلق رکھتا ہے۔ یوں تو حیدرآباد میں مختلف اوقات میں "جامعہ" کے قیام کا مسئلہ زیرِ بحث ہوا۔ اور مختلف اصحاب حل و عقد نے اس کی طرف توجہ کی مگر عملی کام کسی نے نہیں کیا۔ بہرحال "جامعہ عثمانیہ" کا سہرا آپ ہی کے سر ہے سررشتہ داری سہ سالہ مالیاتی تنظیم کا قاعدہ ریلوے کی خریدی سررشتہ صنعت و حرفت میں اس کی ترقی کے لئے ایک گراں قدر رقم کا محفوظ کرنا حیدرآباد سیول سروس کی مکرر تنظیم اور ان کو اعلیٰ خدمات پر مامور کرنا یہ سب رائٹ آنریبل سر اکبر کی کارگزاریوں میں شامل ہے یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ سر اکبر کو خوش قسمتی سے اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ جیسا حکمراں نصیب ہوا اور آپ کی ہر اسکیم کو اپنی معارف نوازی اور رعایا پروری کے باعث منظوری سے ممتاز فرمایا۔

صدر المہامی فینانس کے زمانہ میں سر اکبر نے حیدرآباد کے نمائندہ کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شرکت فرمائی ہے۔

نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر کو پبلک امور سے بھی دلچسپی رہی ہے طغیانی رود موسیٰ، طاعون، انفلوئنزا وغیرہ کے زمانہ میں نہایت توجہ اور دلچسپی سے آپ نے کام کیا ہے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے صدر آپ ہی ہوئے تھے اور آپ کی توجہ سے کانفرنس نے بہت کچھ کامیابی حاصل کی تھی۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلمانانِ جنوبی ہند کی تعلیمی کانفرنس کے آپ صدر رہ چکے ہیں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سینیٹ کے رکن ہیں بہرحال آپ کے سرکاری خدمات کی طرح پبلک خدمات کی تفصیل بھی طویل صفحات کی متقاضی ہے۔

سر اکبر کو مذہب سے بڑا شغف ہے وہ صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند ہیں بزرگانِ دین کے قبوروں کی زیارت اور مشائخین و صوفیاء کی ملاقات کا آپ کو بڑا اشتیاق رہا کرتا ہے۔ آپ سادگی پسند، بیجا اسراف کو ناپسند کرنے والے اوقات مقررہ کی پابندی کرنے والے سرکاری کام کرنے کے شوقین ہر وقت مصروف رہنے کے عادی ہیں۔

سر اکبر بحیثیت ایک ماہرِ فینانس، بحیثیت ماہرِ تعلیم، بحیثیت سیاسی مدبر، بحیثیت معاشی و اقتصادی ماہر اپنی آپ نظیر ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی

# عہدِ آصفی کے امراء

اس کے قبل عہدِ آصفی کے مدارالمہاموں اور صدرِ اعظموں کے حالات اور تصاویر درج کی گئیں۔ اب عہدِ آصفی کے اُن خاص خاص امراء کے حالات اور تصویریں شامل کی جاتی ہیں جو اپنے کارناموں اور شہرت کی وجہ سے بہت مشہور تھے یا جو نائبِ حضور کے درجے تک پہنچے تھے۔

## نواب درگاہ قلی خاں سالار جنگ

نواب ذوالقدر اصل نام تھا ۱۱۲۲ھ میں بمقام سنگمنیر پیدا ہوئے۔ ان کے والد خاندان قلی خاں کی پرورش اور حضرت غفران مآب نواب آصف جاہ اوّل کی تربیت سے ان کی فطری قابلیت بہت جلد نمایاں ہوگئی۔ سنِ رشد کو پہنچنے سے قبل ہی اکثر علوم و فنون میں مہارت حاصل کرلی منکسر المزاجی کے ساتھ طبیعت میں شوخی اور ظرافت بھی تھی۔ فنِ موسیقی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ ۱۱۵۱ھ میں آصف جاہ بہادر کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا اور شاہی بلا کے زمانہ میں اپنے مربی کی حفاظت میں غیر معمولی جان بازی کا ثبوت دیا جس سے ان کی شجاعت کا ثبوت ملتا ہے دہلی سے واپس ہوکر اپنے سفر کے حالات کا ایک تفصیلی تذکرہ قلمبند کیا جو مرقعِ دہلی کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ جس میں بارھویں صدی کی دہلی کے معاشرتی، تمدنی، تاریخی، اور ادبی حالات نہایت تفصیل سے درج ہیں۔ شاعری سے فطری لگاؤ تھا اکثر فی البدیہہ اشعار کہتے تھے خود مشاعرے منعقد کرتے اور اپنی غزل آپ پڑھتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی افسوس ہے کہ بجز چند مرثیوں کے ان کا اردو فارسی کلام دستیاب نہ ہوسکا چیدہ چیدہ اشعار کہیں کہیں تذکروں میں ملتے ہیں۔

دکن کے اکثر عہدہائے جلیلہ پر فائز رہنے کے بعد تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں ۱۱۸۱ھ میں ان کا انتقال ہوا اور اپنے خاندانی مقبرہ واقع اورنگ آباد میں مدفون ہوئے۔ نمونۂ کلام حسبِ ذیل۔

### قصیدہ

پڑی ہے آکے گلے ناگہاں بلائے سفر — سفر نہیں ہے سفر بل سقر سے ہے بدتر
غرض کہ سخت مصیبت میں ہیں وضیع و شریف — غنی فقیر سبھی احتیاج میں مضطر
اسی تردد افکار میں لگی تھی نیند — کہ ناگہہ خواب میں دیکھا قریبِ وقتِ سحر
کھڑا ہے آکے سرہانے پہ پیرِ نورانی — لطیف عنصر و خوش منظر و خجستہ سیر

کہا کمال عنایت سے کیا ہے فکر تجھے ہے تیرے کام کا حامی امام جن و بشر
شہہ سریر کرامت امیر کل امیر ولی حضرت مولی وصی پیغمبر
امام جن و ملک تاجدار ملک و فلک کہا ہے لحمک لحمی جسے شہہ سرور
سوائے اس کے کہوں کون شاہ مرداں ہے خدا نے سیف دی اور دی رسول نے دختر
ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہوں سے کمینہ بندۂ درگاہ صاحب قنبر
مراد بندۂ درگاہ زود ہے کہ کرے ابوتراب کی تربت کی خاک کحل بصر

---

# مرثیہ

عالم میں پھر کے لایا پیغام غم محرم سب انبیا ہیں غمگیں اور اولیا پہ ماتم
اہل حرم ستم میں دل چاک دیدہ پرنم فریاد کر کے کہتے اے سرور دو عالم
اولاد پر ہے تیرے یہ کیا بلائے مبرم کوئی لہو میں تلملائے کوئی خاک میں ہے بیدم
درد و الم تواتر جور و جفا ہے پیہم سب مبتلا بلا میں فرصت نہیں ہے یکدم

ہیہات بیکساں را تقصیر چیست یارب
در ورطۂ ہلاکت تدبیر چیست یارب

---

یہ قصۂ مصیبت ہے سخت درد جاں کوں کیا کھول کر کہوں اب طاقت نہیں بیاں کوں
موقوف کر ارے دل غمناک داستاں کوں سب پر عیاں ہوا ہے حاجت نہیں بیاں کوں
توں سامع الدعا ہے مقصود بندگاں کوں تجھ پاس مانگتا ہوں امید دو جہاں کوں
دنیا میں آبرو دے چند روزہ میہماں کوں محمود عاقبت کر اس کلب آستاں کوں

فیض طواف درگاہ باشد نصیب عاصی
از فضل تو تمنا دارد غریب عاصی

میر سعادت علی رضوی

---

# تیغ جنگ شمس الامراء (وفات سنہ ۱۲۰۵ھ)

ابو الفتح خاں تیغ جنگ کے والد ابو الخیر خاں تھے، سلسلۂ نسب حضرت شیخ فریدالدین شکر گنج سے ملتا ہے ۔

ابو الخیر خان کو دربار مغلیہ (محمد شاہ) سے "خان بہادر" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ حضرت آصفجاہ اول کے ہمراہ رکاب دکن آئے، آصفجاہ نے دو ہزاری منصب پانچ سو سوار کا اعزاز عطا کیا اور کئی ہزار کی جاگیر ذات مرحمت فرمائی تھی ۔

وہ مالک کے بڑے وفادار اور جانثار تھے، چنانچہ جب ناصر جنگ شہید نے باپ کے خلاف صف آرائی کی تو ابو الخیر خاں کو بھی اپنا طرفدار بنانا چاہا۔ لیکن انھوں نے آصفجاہ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اسی وفاداری کے طفیل میں زمانۂ مابعد میں خود ناصر جنگ نے ان کو "شمشیر بہادر" اور صلابت جنگ نے امام جنگ کے خطاب سے عزت افزائی کی۔ برہان پور میں ابو الخیر خاں کا انتقال سنہ ۱۱۶۶ھ میں ہوا وہیں مدفون ہوئے۔

تیغ جنگ کی پیدائش برہان پور میں ہوئی، والد کے انتقال کے بعد اپنی جاگیر میں خانہ نشین تھے، نواب صلابت جنگ نے اپنے سفر برہانپور (سنہ ۱۱۷۱ھ) کے وقت آپ کو دربار کے امیروں میں شامل فرمایا۔ اس کے بعد آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علیخاں نے خاص توجہ مبذول فرمائی اور آپ کے مراتب میں بیشی ہوتی گئی۔ تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامرا (اول) کے خطابات عطا ہوئے۔ کئی لاکھ کی جاگیر مرحمت ہوئی ۔

نواب رکن الدولہ میر موسیٰ خان کے انتقال پر حضرت آصفجاہ نے آپ کو قلمدان دیوانی سے بھی سرفراز کرنا چاہا، مگر آپ نے میدان جنگ کے مقابل میدان سیاست کو پسند نہیں فرمایا ۔

پائیگاہ کے آپ ہی بانی ہیں، حضرت آصفجاہ ثانی نے کئی لاکھ کی جاگیر فوج کے لئے عطا فرمائی تھی، علاوہ جاگیرات کے نقد رقم بھی اس کے لئے مرحمت ہوتی تھی۔ پائیگاہ کی یہ فوج شاہی محافظ (باڈی گارڈ) کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے سوار بہادر اور دلاور ہوتے اور معقول تنخواہ پاتے تھے، تیغ جنگ کے چار رشتہ دار امجد الملک، سردار الملک، امام الملک اور اعظم الملک اس فوج کے اعلیٰ افسر تھے۔ تیغ جنگ کو اپنی فوج کے ساتھ بڑا شغف تھا ۔

بحالت سفر پانگل کے مقام پر سنہ ۱۲۰۵ھ میں انتقال ہوا۔ لاش کو حیدرآباد لاکر درگاہ برہنہ شاہ میں دفن کیا گیا ۔

# شمس الامرا (ثالث) امیر کبیر (ثانی) (ولادت سنہ ۱۲۲۰ھ وفات سنہ ۱۲۹۴ھ)

امیر کبیر ثانی کا نام محمد رفیع الدین خان تھا۔ آپ فخر الدین خان امیر کبیر (اول) کے بڑے فرزند تھے جن کا ذکر وزرائے سلطنت کے سلسلہ میں گزر چکا ہے۔

شوال سنہ ۱۲۲۰ھ میں آپ کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ ناموس جنگ عمدۃ الدولہ عمدۃ الملک شمس الامرا (ثالث) امیر کبیر (ثانی) کے خطابات آپ کو سرفراز ہوئے تھے۔

نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کے انتقال پر اعلیحضرت غفران مکان کی صغیر سنی کے باعث آپ نائب حضور کی حیثیت سے سلطنت آصفی کے کاروبار انجام دیتے رہے۔ اسی نائب حضوری کے زمانہ میں آپ کا انتقال ہوا (سنہ ۱۲۹۴ھ) میں خاندانی مدفن درگاہ حضرت برہنہ شاہ میں دفن کئے گئے۔

آپ کو علوم و فنون خصوصاً ریاضی اور ہیئت سے بڑی دلچسپی تھی۔ ریاضی میں آپ نے چند کتابیں تالیف فرمائی ہیں ۔



ابوالفتح خاں تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء



محمد رفیع الدین خان فاروق جنگ عمدة الدولہ عمدة الملک
شمس الامراء امیر کبیر ثانی

فن تعمیر کا بھی شوق تھا۔ آپ کی بنوائی ہوئی کئی عمارتیں موجود ہیں۔ داد و دہش میں مشہور تھے۔ آپ کی سخاوت اور فیاضی کا شہرہ دور دور تک پہنچا تھا۔ چنانچہ زمانہ شباب میں (سنہ ۱۲۶۲ھ) آپ ایک مرتبہ بیمار ہو گئے تھے، یونانی حکماء کے علاج سے فائدہ نہیں ہوا۔ انگریزی علاج شروع کیا گیا جو اس زمانہ میں ایک عجوبہ سے کم نہیں تھا۔ ڈاکٹر آپ کے لئے تبدیل آب ہوا ضروری قرار دیا کلکتہ لے گئے۔ وہاں جہاز کے ذریعہ سمندر میں تفریح ہونے لگی اور خدا کے فضل سے آپ کو صحت کلی حاصل ہو گئی۔ ایک سال تک یہاں قیام رہا کلکتہ میں آپ نے اس قدر داد و دہش فرمائی اور ولایتی سامان اس کثرت سے خرید فرمایا کہ یورپ میں بھی آپ کا نام سخاوت اور قدر دانی کے لحاظ سے مشہور ہو گیا تھا آپ کو کوئی اولاد نہیں تھی۔

## محمد رشید الدین خان شمس الامراء (رابع) امیر کبیر (ثالث)

### (ولادت سنہ ۱۲۳۰ھ وفات سنہ ۱۲۹۹ھ)

محمد رشید الدین خان، امیر کبیر فخر الدین خان کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ بمقام حیدرآباد سنہ ۱۲۳۰ھ میں ولادت ہوئی۔ اور سنہ ۱۲۹۹ھ میں انتقال ہوا پہلے آپ کو ابو الخیر خان بہادر جنگ، اقتدار الدولہ اقتدار الملک وقار الامراء کا خطاب عطا ہوا تھا۔ اس کے بعد جب امیر کبیر ثانی رفیع الدین خان کا انتقال ہوا تو آپ کو خاندانی خطاب شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء امیر کبیر کے موروثی خطاب سے سرفراز کیا گیا اور نائب حضور بنائے گئے نواب آصفجاہ ثالث سکندر جاہ بہادر کی صاحبزادی سے آپ کا عقد ہوا تھا۔ جن کے بطن سے آپ کو ۲ صاحبزادے خورشید جاہ اور وقار الامراء تولد ہوئے۔

محمد رشید الدین خاں اپنے وقت کے صاحب تدبیر و سیاست تھے۔ اس زمانہ میں آپ کو سیاسی خدمات اور پولیٹکل مسائل کے تصفیہ پر جس طرح عبور حاصل تھا وہ اپنی آپ نظیر تھا۔ داد و دہش میں مشہور تھے، اپنے بڑے بھائی کی طرح ان کو بھی سخاوت اور خیرات سے دلچسپی تھی۔ علوم و فنون کے قدردان تھے، علماء، فضلاء اور شعراء کی ہمت افزائی کرتے اور کافی صلہ دے کر ان کی قدر دانی فرماتے تھے۔

تاریخ سے خاص شغف تھا اسی شوق کے باعث تاریخ "رشید الدین خانی" آپ کی سرپرستی میں مرتب اور شائع ہوئی۔

## محمد محی الدین خان خورشید جاہ شمس الامراء (خامس) امیر کبیر (رابع)

### (ولادت سنہ ۱۲۵۱ھ وفات سنہ ۱۳۲۰ھ)

محمد رشید الدین خان کے بڑے فرزند تھے، سنہ ۱۲۵۱ھ میں ولادت ہوئی۔ آپ کی والدہ محترمہ حضرت حشمت النساء صاحبہ آصفجاہ ثالث کی صاحبزادی تھیں آپ کی تعلیم و تربیت کا خاص انتظام ہوا تھا۔ عربی، فارسی، ریاضی وغیرہ کی تعلیم کے لئے علحدہ علحدہ قابل مدرسین مامور کئے گئے۔ شہسواری اور فنون سپہ گری کا بھی اہتمام تھا۔ بہرحال دادا کی نگرانی میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ دادا کی خاص مہربانی اور لطف و کرم مبذول تھا۔

سنہ ۱۲۷۰ھ میں آپ کی شادی نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کی صاحبزادی حضرت حسن النساء بیگم صاحبہ سے ہوئی۔ اس زمانہ میں امیر کبیر اول آپ کے دادا بقید حیات تھے، بڑی دھوم سے یہ شادی ہوئی۔ دو ہفتہ تک شادی کے جشن ہوتے رہے، دن عید اور رات شب برات ہوتی تھی۔ حیدرآباد کی تاریخ میں یہ شادی اپنے دھوم دھام کر و فر شان و شوکت کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر تھی۔

دوبارہ آصفی سے مختلف اوقات میں آپ کو حسب ذیل خطابات سے متعز کیا گیا۔ ابوالخیر خاں، تیغ جنگ، خورشید الدولہ، خورشید الملک، خورشید جاہ، شمس الامراء امیر کبیر۔

شمس الامراء اور امیر کبیر کے خطابات آپ پر ختم ہو گئے، پھر کسی کو آج تک یہ خطاب نہیں ملا۔

سرکار انگریزی میں آپ کے بڑے اعزاز تھے "سر" کا خطاب ملا تھا اور آپ کی زندگی میں جس قدر وائسرائے ہند حیدرآباد آئے وہ آپ کے یہاں ضرور مدعو ہوتے تھے۔

سر خورشید جاہ کو اپنے باپ کی طرح میدان سیاست سے بڑی دلچسپی تھی۔ آپ اپنے زمانہ کے مدبر اور صاحب فراست تھے، کونسل آف اسٹیٹ کی کبینٹ پر اعلیٰحضرت غفران مکاں نے آپ کا تقرر فرمایا تھا۔

علم و فن سے دلچسپی تھی۔ تاریخ خورشید جاہی آپ کی سرپرستی میں شائع ہوئی۔ داد و دہش میں بھی شہرت رکھتے تھے، حجاز ریلوے کی تعمیر کے لئے پچیس ہزار کا چندہ دیا تھا۔ سیر و سیاحت کا شوق تھا۔ شمالی ہند اور جنوبی ہند کے کئی شہر دیکھے تھے۔ اپنی فوج کو باقاعدہ مرتب کیا تھا۔ فوجی وردی اور عمدہ ہتھیار دئے جو پائیگاہ میں اس سے پہلے نہیں تھے، ۱۳۲۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ درگاہ برہنہ شاہ میں دفن کئے گئے۔ آپ کو دو صاحبزادے تولد ہوئے، امام جنگ اور ظفر جنگ۔ آخرالذکر شہزادی حسن النساء بیگم صاحبہ کے بطن سے تھے۔

# مکرم الدولہ میر پرورش علیخاں حسام جنگ

میر پرورش علی خان المخاطب حسام جنگ مکرم الدولہ، آپ کے والد نواب قیصر الدولہ، نواب سراج الملک کے داماد تھے اس طرح مکرم الدولہ نواب مختار الملک کے ہمشیرہ زادے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ مکرم الدولہ آپ کے داماد بھی تھے، نور النساء بیگم صاحبہ آپ سے بیاہی گئی تھیں۔

مکرم الدولہ کی تعلیم مدرسہ دارالعلوم میں ہوئی، اس مدرسہ کے افتتاح کے ساتھ ہی آپ نے اس میں شرکت فرمائی تھی۔ عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔

نواب مختار الملک نے مجلس مالگزاری قائم کی (۱۲۸۶ھ) تو اس مجلس کا آپ کو میر مجلس بنایا گیا، اس کے بعد جب مجلس برخاست ہو کر صدر المہام مقرر ہوئے تو اس وقت آپ صدر المہام مالگزاری ہوئے۔

نواب مختار الملک کے سفر یورپ کے زمانہ میں آپ بشیر الدولہ کے ساتھ مل کر مدار المہامی کا کام بھی انجام دیتے رہے، آپ کی قابلیت مسلم تھی، اور عام و خاص میں آپ کی لیاقت کا شہرہ تھا۔

شادی کے ایک سال بعد (۱۲۹۶ھ) میں آپ خلل دماغ کی وجہ سے خانہ نشین ہو گئے، ۱۳۲۳ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ آپ کو کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

نصیر الدین ہاشمی

# سورما

## گولکنڈہ کا ایک افسانہ

گولکنڈہ کی زمین ہیروں کی سرزمین ہے۔ یہیں آندھرا دیس کی راج نگری تھی جسکی شاہانہ سج دھج سے اپنے پرائے سب کی آنکھیں چکاچوند ہو جاتی تھیں۔ آج بھی وہاں ان دنوں کی یاد دلانیوالے ایک آئینہ خانے کے کچھ آثار رہ گئے ہیں جنہیں دیکھتے ہوئے ایک دفعہ مجھے محسوس ہوا کہ ان آئینوں میں گزرے زمانہ کی پرچھائیاں ابھر رہی ہیں۔ جیسے من میں پیاروں کی یاد آئے!

دیکھا کہیں سلطان قلی قطب شاہ ہے۔ بشرے پر علم کا نور۔ ترکستانی وجاہت۔ لوگ اس بادشاہ کے شیدائی ہیں۔ "بڑے ملک" کے نام سے پکارتے ہیں۔ تلنگانہ کا داتا سمجھتے ہیں۔ کہیں ابراہیم قطب شاہ ہے جو آزادئے تمدن کی داغ بیل ڈال رہا ہے۔ اسکے پیچھے پیچھے محمد قلی قطب شاہ چلا آتا ہے۔ جو فلاح و ترقی کی بیل منڈھے چڑھا رہا ہے۔ اتنے میں سلطان محمد قطب شاہ نظر آیا۔ پاکیزگی حیات کا گوہر آبدار۔ ساتھ ایک ملکہ ہے۔ حیات بخشی بیگم —— دکن کی ہیروئن!

یہیں ایک آئینہ میں یہ بھی دیکھا کہ تاناشاہ کا عہد حکومت ہے۔ مغل فوجیں قلعہ کا محاصرہ کئے ہیں۔ آٹھ مہینے ہو چکے۔ مگر قلعہ والے اپنی خودداری نہیں کھوتے۔ جان پر کھیلے بیٹھے ہیں۔ مگر سچ یہ ہے، جہاں اچھے ہیں۔ وہاں برے بھی ہیں۔ ان جانثاروں میں دو چار گندم نما جو فروش بھی ہیں۔ جنہوں نے دشمنوں سے ساز باز کیا۔ چاہتے ہیں کہ وطن کو بیچ کے تن کو پالیں من کو مار ڈالیں۔ مگر غداری نہیں چھپا کرتی۔ ہوتے ہوتے اس کی خبر دکن کے جانباز۔ عبدالرزاق لاری کو بھی ہوئی۔ وہ بھلا اس نمک حرامی کو کیسے برداشت کرتا۔ اسی وقت ان بدسگالوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ اور حکم دیا کہ ان کے لاشے بے گور و کفن پھینک دو۔ تاکہ غداروں کی موت سے عبرت زندہ ہو!

یہ جیسے دن کا قصہ ہے۔ رات ہوئی۔ جو بڑی تاریک تھی۔ اس وقت سپاہی کچھ پہرے پر ہیں۔ کچھ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں کہ دس بجے۔ گیارہ بجے۔ بارہ بج گئے۔ سپاہی کو سپاہیوں کی سی باتیں سوجھتی ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک نے کہا، چلو، بدخواہوں کے لاشے دیکھیں؟ کہتے ہیں، رات کے بارہ بجے فرشتے انہیں آتشیں گرز مارتے ہیں!

دوسرا:- جانا ہے تو ایک ایک جاؤ۔ اور دیکھ آؤ۔ سب کا مل کے جانا ٹھیک نہیں۔ تم جانتے ہو، یہ وقت سرداملدار کے بھیس بدل کے نکلنے کا ہے۔ نہو کہ وہ ہمیں یوں جاتا دیکھ لے۔ اور کچھ اور سمجھے۔

تیسرا:- ٹھیک ہے۔ ویسے بھی مرد ہو۔ تو مرد بنو۔ ڈر کو کچل ڈالو۔

چوتھا:- جی، یہ لن ترانی رہنے دو۔ رات کے اس اندھیرے میں اکیلا کوئی نہیں جا سکتا۔

تیسرا:- کیا؟؟

دوسرا:- دیکھو بھئی، ہم یہ وہ نہیں جانتے۔ کچھ شرط بدو۔ اور یاروں کو تو نہیں پہچانتے نہیں۔ دس ہی روپے دلواؤ۔ ہم جاتے ہیں۔

چوتھا :۔ اچھا ہو گئی مگر ہماری بھی ایک شرط ہے۔ وہ سامنے مہندی کی باڑ ہے۔ اس کی پتیاں توڑ لو۔ وہاں جا کے نہیں پیسو۔ اور ہر ایک مردے کی ہتھیلی پر مہندی لگا آؤ۔ تب بات ہے۔ دور سے جھانک آنے کی سند نہیں۔ پھر ہم جا کے دیکھیں گے۔

دوسرا :۔ منظور !

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ اُدھر لاری بھیس بدل کر چھپا چھپا فوج کی موجودات لینے نکلا۔ یہاں پہنچا تو بدخواہوں کا ذکر سنا خیال ہوا کہیں غداری کی وبا عام تو نہیں ہو گئی۔ اس لئے ٹھٹک گیا۔ اور ایک درخت کی آڑ سے سارا ماجرا سن لیا تو اطمینان ہوا۔

جس سورما نے شرط بدی تھی اُس نے تلوار حمائل کی پیش قبض سجایا۔ اور چلا چل پہ چل اس گمبھیر جھاڑی میں پہنچا۔ جہاں لاشے تھے۔ وہاں اندھیرے کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ بے شمار جھینگر بول رہے تھے۔ کبھی گیدڑ بولتے تو یہ سمجھتا کہ کوئی اس کی دلیری پر واہ واہ کر رہا ہے۔ ترس بولتا تو خیال ہوتا کہ کوئی اس کی کامیابی پر ہنس رہا ہے۔ اور شب بیداڑ کا رتا تو سوچتا کہیں ڈرپوک سمجھ کے سردار لاری تو نہیں ٹھکر رہا!

پھر وہاں پہلے پتیاں رگڑیں۔ مہندی تیار کی۔ پھر لاشوں کے پاس آ کے ایک مردے کی ہتھیلی میں لگائی۔ دوسرے کے لگا رہا تھا کہ تیسرے لاشے نے حرکت کی۔ سورما نے غور سے دیکھا۔ اور خاموش ہو گیا۔ دوسری دفعہ لاشہ نے حرکت کی تو سورما نے بگڑ کے کہا: ٹھیر جا! تیسری دفعہ لاشے نے ہاتھ پھیلا دیا۔ سورما کو یہ بے صبری بری معلوم ہوئی۔ جھٹ پیش قبض نکالا۔ اور لاشے کے ہاتھ کو زمین پر رکھ کے اسکی ہتھیلی میں پیش قبض اتار دیا۔ اس کے بعد مہندی بھی لگا دی۔ اور پیش قبض لٹکا کر چلتا ہوا۔ سورما کی بے جگری کا یہ وہ کارنامہ تھا جسے اسوقت آسمان کی بے گنتی آنکھیں دیکھ رہی تھیں!

وہاں سے پلٹا تو کچھ دور پر رستہ میں ایک شخص چادر اوڑھے نظر آیا۔ جیسے سورما نے ٹوکا۔ ساتھ ہی تلوار کا وار بھی کیا۔ مگر اجنبی نے پینترا کاٹ کے وار خالی دیا۔ اور جلدی سے سورما کو گلے لگاتے ہوئے اُس کا نام لیکر پکارا۔

سورما نے آواز پہچان کر کہا: ہائیں؟!

اجنبی :۔ ہاں!

سورما :۔ میں صرف مہندی

اجنبی :۔ تم سرخرو ہوئے!

سورما :۔ کیسے؟

اجنبی :۔ میں وہیں تھا۔ تمہارے پہنچتے پہنچتے رستہ کاٹ کے وہاں آن پہنچا۔ ایک لاشے کو ہٹا کے اسکی جگہ لیٹ گیا کہ دیکھوں تم میں کتنا حوصلہ ہے؟!

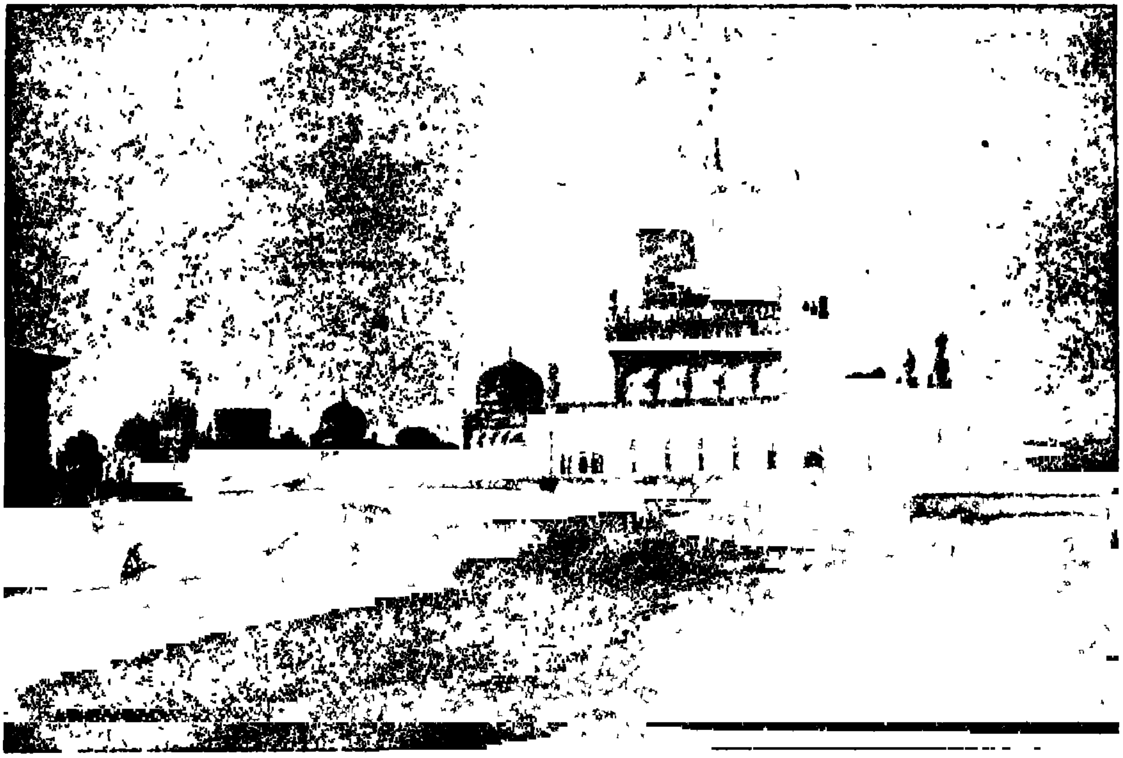
یہ کہہ کر اجنبی نے چادر سے ہاتھ نکال کے دکھایا۔ خون بہہ رہا تھا۔ اسی ہاتھ میں سورما نے پیش قبض اتار دیا تھا۔ یہ جانباز لاری کا ہاتھ تھا۔ جو مرتے مرتے بھی کہہ گیا کہ :۔ "تا جان دارم نثار ابو الحسن خواہم نمود"!!

سید وزیر حسن (عثمانیہ)

مقبرہ حضرت آصفجاہ اول



سلاطین گولکنڈہ کے مقبرے





شاہ گنج اورنگ آباد کی مسجد

# اورنگ آباد

(سترھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے آخری کارفرما شہنشاہ اور مشرق کی سب سے عظیم الشان سلطنت کا صدر مقام)

کچھ بلبلوں کو یاد ہے کچھ قمریوں کو حفظ
عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ جس اجڑے دیار کی سرگزشت میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں وہ سوا دو سو سال پہلے اتنا بڑا شہر تھا جیسا اب کلکتہ ہے اس کی آبادی پندرہ لاکھ بیان کی جاتی تھی۔

اورنگ آباد کی بنیاد اور اس کے عروج و زوال کی داستان کو آپ کے سامنے بیان کرنا دراصل ہندوستان کی اس دور کی تاریخ کو دھرانا ہے۔ میں آپ کو اتنی دور نہیں لے جاؤں گا لیکن مختصراً چند دو آفرین واقعات کا ذکر کروں گا۔

دہلی خلجیوں کے زیر نگیں تھی۔ جلال الدین سریر آرا تھا۔ اس کے بھتیجے کے سر میں بادشاہت کا سودا سمایا لیکن خوب جانتا تھا کہ روپیے کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ اس زمانے میں سلطنت دیوگری (دولت آباد) کی دولت ضرب المثل ہو گئی تھی۔ علاءالدین نے اپنے چچا کی رضامندی حاصل کئے بغیر سپاہیوں کا ایک مختصر سا دستہ لیا۔ اور جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں کے راجہ کو ڈرا دھمکا کے مطیع کیا اور بہت کچھ مال غنیمت حاصل کیا۔

خلجیوں نے اپنے انقطاع سے قبل دیوگری کو فتح کر لیا تھا اور اس کا نام دولت آباد رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں کے راجہ ہرپال کی زندہ کھال اتاری گئی۔ اس میں گھاس بھری گئی اور اس کو قلعے کے دروازہ پر نصب کیا گیا۔

واقعات بدلے۔ خلجیوں کی جگہ تغلق بادشاہ برسر اقتدار ہوئے۔ "شاندار دیوانہ" محمد شاہ تغلق کی خواہش تھی کہ اپنی حکومت کا صدر مقام دلی سے دولت آباد منتقل کیا جائے۔ رعایا کو چالیس روز میں دولت آباد پہنچنے کا حکم دیا۔ رعایا اس سفر پر روانہ ہوئی۔ دولت آباد سلطنت کا صدر مقام تو ہرگز نہ بن سکا بلکہ بادشاہان دہلی کے تلون نے جنوب کے امراء کو اپنے آقا کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا اور اسطرح بہمنی بادشاہوں کے ہاتھوں ایک خود مختار حکومت کی بنیاد پڑی۔

جنوب میں وجیانگر کی طاقتور سلطنت بھی تھی۔ بہمنی بادشاہ اس سلطنت کے ساتھ ناکام جنگ آزمائی کرتے رہے۔ بہمنی سلطنت کا انتزاع عمل میں آیا اور پانچ مختلف ریاستیں قائم ہوگئیں۔ بیجاپور۔ بیدر۔ برار۔ گولکنڈہ اور احمد نگر۔

ادھر بہمنی سلطنت پانچ حصوں پر تقسیم ہوگئی۔ تو ادھر وجیانگر کی سلطنت میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا جس سے فائدہ اٹھا کر ان نو بنیاد ریاستوں نے باہمی اتحاد کیا پانچویں یعنی برار شریک نہ تھی۔ چاروں نے مل کر ۱۵۶۵ء میں تالی کوٹ کی جنگ کی جس نے وجیانگر کی عظیم الشان سلطنت کو ہندوستان کی سیاسیات کے صفحے سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔

شکست خوردہ سلطنت کی تقسیم کے بارے میں نزاع پیدا ہوئی۔ ان کی آپس کی حاسدانہ کارستانیوں نے اکبر اعظم کو جو اس وقت دہلی میں فرماں روائی کر رہا تھا ابھارا۔ اس کی دیرینہ آرزو تھی کہ نربدا کے جنوبی علاقے کو زیر نگیں کیا جائے۔ خاندیس کے صدر مقام اور دکن کے دروازے

برہان پور پر اس نے ۱۶۰۰ء میں قبضہ جمالیا۔ اس کے بعد سلطنت احمد نگر پر اس کے جغرافی محل وقوع پر نظر کر کے حملہ ہوا۔ چاند بی بی پُر زور اور دلیرانہ مدافعت کی روح رواں تھی لیکن اپنے ایک امیر کے ہاتھوں قتل ہو گئی اور میڈوز ٹیلر کے مشہور رومان کی ہیروئن بنی۔

چاند سلطانہ ہمارے ضلع کے بعض دیہات میں اب تک عزت و احترام سے یاد کی جاتی ہے۔ ایک اہم واقعہ کی یادگار چکل تھانے میں ایک موجود ہے جو شہر اورنگ آباد سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے اس موضع میں ہر سال اس شریف ملکہ کے اعزاز میں دسہرے کے موقع پر سب سے پہلے ایک جھنڈا بلند کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسری رسمیں ادا ہوتی ہیں۔ اس کو دلفریب حسن و جمال کی دیوی کہتے ہیں کرامات اس سے منسوب کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ جالنہ سے احمد نگر جا رہی تھی تو اثنائے راہ میں چکل تھانے سے متصل خیمہ زن ہوئی۔ علی الصبح وہ وہاں سے یکایک غائب ہو گئی اور احمد نگر میں پائی گئی۔ اس موضع کے قریب کی جگہ جو اس کی فرودگاہ تھی اب تک "سنگار باڑی" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ نام بھی اس کی دلفریبیوں کی طرف ایک نازک اشارہ ہے۔

چاند بی بی کے قتل کے بعد اکبر نے اپنا اقتدار احمد نگر میں نافذ کر دیا لیکن مدبر اور سخت کوش وزیر ملک عنبر نے شکست نصیب خاندان کو مرتضیٰ کی بادشاہی کا اعلان کر کے از سر نو زندہ کیا اور خود وزیر اور نائب بنا۔

مرتضیٰ کی تاج پوشی کی رسم ملک عنبر نے پرینڈہ (ضلع عثمان آباد) میں ادا کی لیکن وہ دولت آباد واپس آیا اور تقریباً ۱۶۱۰ء میں شہر اورنگ آباد کی بنیاد ڈالی۔ دس سال کے عرصے میں یہ نیا پایہ تخت ایک آباد اور بارونق شہر بن گیا۔ گزیٹر کے بیان کے مطابق اس شہر کی آبادی ملک عنبر کے عروج کے زمانہ میں دو لاکھ کے قریب تھی۔

میں ان اسباب کا ٹھیک کھوج نہ لگا سکا اور نہ کسی تاریخ یا وقایع سے اس پر روشنی پڑتی ہے کہ ملک عنبر نے یہ جگہ کیوں انتخاب کی۔ حالانکہ یہ جگہ دولت آباد کے مقابلے میں کچھ محفوظ نہ تھی۔ دولت آباد اس کے قبضہ میں تھا۔ وہ گزارا ہو رہا تھا۔ اور خود بڑا فوجی صدر مقام تھا۔ موجودہ اورنگ آباد شہر بہت ہی ناہموار جگہ پر آباد ہے اور اس کا بہت بڑا حصہ نشیب میں ہے۔

قرین قیاس یہ ہے کہ ملک عنبر چاہتا تھا کہ وہ بیجاپور کی شان اور وجیانگر کے ویران شہر کی قدیم عظمت کے مقابلہ کا ایک شہر آباد کرے۔ گو وجیانگر ہندوستان کے نقشے سے محو ہو چکا تھا لیکن لوگوں کے دلوں میں اس کی یاد تازہ تھی۔

وافر مقدار میں آب رسانی کیلئے اس جگہ کا جغرافی محل وقوع بہت موزوں تھا اس کے شمال میں لاکن واڑا کا پہاڑی سلسلہ ہے اور جنوب میں ستارا کی پہاڑیاں۔ دونوں کے درمیان دس میل کی وادی ہے جس میں ایک دھارا بہتی ہے جسکو کھام ندی کہتے ہیں۔ یہ جگہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے اس جدت آمیز طریقۂ آب رسانی کے لئے بہت موزوں ثابت ہوئی جس نے اپنے بانی کے نام کو زندہ و دائم کر دیا۔

میں ملک عنبر کے گوناگوں کارناموں سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میں صرف اس کے ان کارناموں کا مختصراً ذکر کروں گا جو اس نے اس شہر میں انجام دیئے ہیں۔ اس نے نوکھنڈہ محل تعمیر کرایا جو اس وقت ویران ہے اس میں پانچ زنانہ عمارتیں ایک دیوانِ عام۔ ایک دیوانِ خاص اور ایک مسجد تھی۔ اور اس کے ساتھ کئی باغ، حوض اور حمام بھی تھے۔

جامع مسجد اس کی زندگی میں مکمل ہو گئی تھی۔ اس کے پچاس کثیر الاضلاع ستون ہیں۔

چیتا خانہ ۔ یہ ایک شاندار عمارت تھی جو ویران ہو چکی تھی ۔ یہ عمارت اس نے شہر کے پنڈتوں اور عالموں کے جلسوں کے لئے تعمیر کرائی تھی ۔ لیکن اس کے بعد اس مقدس عمارت کو روز بد دیکھنا نصیب ہوا ۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں اس کو مسافر خانہ بنا دیا گیا تھا ۔ اور بعد کو اس میں شاہی شکاری چیتے بھریاں رکھی گئی تھیں کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ وہ محبس کے طور پر استعمال ہوتا تھا ۔ یہیں شہر کی صفائی کا دفتر چند سال رہا ۔ اب اس کی ترمیم ہو چکی ہے اور پھر یہ ٹاؤن ہال کے کام میں استعمال ہو رہا ہے ...... شہر کی موجودہ سڑک ایک بڑے سنگین دروازے سے گزرتی ہے جو بھڑکل کہلاتا ہے ۔ جسکے معنی قدیم دکنی زبان میں دروازہ کے ہیں ۔

اس کے کارناموں میں سب سے زیادہ نمایاں کام جسکی بدولت اس کا نام زبان زد خاص و عام ہے اس کا طریقہ آب رسانی ہے جس کو اس نے شہر میں جاری کیا تھا ۔ شہر سے پانچ میل کے فاصلہ پر ایک ندی سے ایک نہر لائی گئی جسمیں نلکیوں کا سلسلہ چلا گیا ہے ۔ ان میں کچھ کے پختہ کھلے دریچے ہیں ۔ قوت جاذبہ کے آسان طریقے سے یہ نہر آج تک شہر کی ضروریات کو پورا کر رہی ہے اس کی تکمیل دس سال کے عرصہ (۱۶۱۶ ۔ ۱۶۲۶) میں ہوئی ۔

ملک عنبر نسلاً حبشی تھا ۔ اس کی پرورش ایک غلام کی حیثیت سے دربار بیجاپور میں ہوئی تھی ۔ بعد کو یہ احمد نگر کے نظام شاہی بادشاہ کی ملازمت میں داخل ہو گیا تھا ۔ وہ دکن کی تاریخ میں اسی طرح مشہور ہے جس طرح کہ شمالی ہند کی تاریخ میں ٹوڈرمل ہے ۔

وہ بہت وسیع المشرب تھا ۔ اس نے اپنے دوستوں کے انتخاب میں کبھی کوئی امتیاز روا نہیں رکھا ۔ اس کے رفیقوں میں شیواجی کا باپ شاہ جی بھی تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک عیسائی گرجا بھی تعمیر کرایا تھا ۔ اسی سال کی طویل و پختہ عمر میں وہ فوت ہوا ۔ اس کا بیٹا فتح خان اس کا جانشین ہوا اس نے وقت کی موزونی کے لحاظ سے کوئی ترقی نہیں کی اور اس کو بھی نہ سنبھال سکا جو کچھ کہ اس کے باپ نے حاصل کیا تھا سنہ ۱۶۳۳ء میں فتح نگر مغلوں کے قبضے میں آگیا ۔

اورنگ زیب نے صوبہ دار دکن کی حیثیت سے اس شہر کو اپنا مستقر بنایا اور سنہ ۱۶۵۳ء میں اورنگ آباد کے نام سے موسوم کیا ۔

' چار سال بعد وہ تخت دہلی پر اس وقت متمکن ہوا جب کہ ٹھیک دو سو سال بعد ایک عصر آفرین انقلاب ہندوستان میں رونما ہونے والا تھا ۔

عہد مغلیہ کی عمارتوں میں سب سے زیادہ اہم مقبرہ ہے جسکو اعظم شہزادہ نے اپنی ماں کی یادگار میں تعمیر کرایا ۔ (۱۶۵۰ ۔ ۱۶۵۷) ۔

اس کے لئے پورے سنگ مرمر آیا ۔ تاورنگ سیاح کا بیان ہے ۔

"ایک مرتبہ سورت سے گولکنڈہ جاتے ہوئے راستے میں تین سو بیڈیاں ملیں جو سنگ مرمر سے لدی ہوئی تھیں ۔ چھوٹی سی چھوٹی گاڑی کے کھینچنے کے لئے بھی بارہ بیل درکار تھے ۔"

معمار کا نام عطاء اللہ تھا ۔ ساڑھے چھ لاکھ روپیے کی لاگت آئی ۔ یہ عمارت مشہور تاج محل کے جواب میں تعمیر ہوئی تھی جو ٹھیک اسی زمانہ میں تکمیل کو پہنچا تھا لیکن مقبرہ سے اس قدر جلد ویرانی اور خرابی کے آثار رونما ہونے لگے کہ باوجود بہت خوبصورت ہونے کے بھی وہ اپنے مد مقابل سے ہر طور کم رتبہ ہے ۔

یہ مقبرہ ۵۰۰ × ۳۰۰ گز کے احاطے میں ایستادہ ہے ۔ درگاہ سرخ تراشیدہ پتھر کے (۲۰) مربع گز چبوترے پر ہے ۔ یہی اُن

چار میناروں کی بلندی بھی ہے جو چبوترے کے چاروں زاویوں پر واقع ہیں۔ قبر مربع ہے اور ایک بلند محرابی محراب رکھتی ہے۔ اوپر چار مینار ہیں۔ ان چاروں میناروں کے متوازی چھوٹے چھوٹے گنبد کونوں پر ہیں۔ مرمریں جالی کے دریچے آگرہ کے دریچوں کی طرح نازک ہیں۔ آخر میں خوشنما سفید ابرقی مسالے کا ہاتھ پھیر دیا گیا ہے۔

سنہ ۱۶۸۲ء میں شہر پر دھاوا کرنے کے لئے مرہٹے ستارا کی پہاڑیوں کے قرب و جوار میں جمع ہوئے لیکن مغلوں کے ایک عظیم الشان لشکر کی آمد سن کر فرار ہو گئے۔ اس کے بعد کے سنین میں شہنشاہ عالمگیر کے حکم سے شہر پناہ تعمیر ہوئی جس کے ہر رخ پر ایک دروازہ تھا۔ شمالی رخ پر دہلی دروازہ تھا۔ اس زمانہ میں جنوب کے تمام مشہور شہروں میں اس نام کا اور اسی رخ پر ایک دروازہ تھا حتیٰ کہ پونہ میں پیشوا کے محل کے دروازہ کا نام بھی دہلی دروازہ تھا۔

سنہ ۱۶۹۲ء میں اورنگ زیب نے قلعہ ارک تعمیر کرایا۔ ارک کے معنی ترکی زبان میں قلعے کے ہیں۔ ارک میں اب مسجد قابل دید ہے۔ ہندوستان میں خوشنما ترین مناظر میں پن چکی ہے جس پر دکن اور اورنگ آباد کو فخر ہو سکتا ہے۔ یہاں شہنشاہ اورنگ زیب کے مرشد بابا شاہ مسافر آسودہ ہیں۔ مسٹر گلیڈسٹن سالن اس کے متعلق کہتے ہیں۔

"میں اس کو ان دلفریب باغوں میں شمار کرتا ہوں جو میں نے مشرق میں دیکھے ہیں۔ مقابلتہً چھوٹی سی جگہ میں وہ اپنے مکمل خاکے کی پوری دلکشی رکھتا ہے۔ اس سے ملحق چند نہایت دلچسپ، تاریخی اور مقدس عمارتیں بھی ہیں۔ اس کے حوض اپنی ترتیب کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ حوض کے قریب جو شاندار ہال ہے وہ میرے دیکھے ہوئے ہندوستانی باغوں میں بے نظیر ہے۔ وہ پھول پتیوں سے ڈھکی ہوئی چھوٹی سی نشست گاہ جو مسجد کی طرف سب سے چھوٹے حوض کے قریب واقع ہے ایک حسن کار کے نقطۂ نظر سے مکمل ہے۔"

روضہ باغ۔ اس میں اورنگ زیب کے ایک استاد اسمٰعیل خان آسودہ ہیں۔ آج کل کوتوالی بنگلہ بنا ہوا ہے۔

اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء میں ہوئی اس کے لڑکوں میں جنگ چھڑ گئی ۱۷۱۳ء میں نظام الملک حیدرآباد کے موجودہ حکمران خاندان کے بانی دکن کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ ۱۷۲۳ء میں وہ آصف جاہ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ دہلی کی سازشوں سے وہ اس قدر بیزار ہو گئے تھے کہ انہوں نے دہلی سے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور ۱۷۲۴ء میں اپنا پایۂ تخت حیدرآباد منتقل کر دیا۔

وہ خاص اور قابل ذکر عمارتیں جو عالمگیر کی وفات کے بعد اور آصف جاہ کے زیر نگرانی تعمیر ہوئیں حسب ذیل ہیں۔

مسجد شاہ گنج جو ۱۷۲۰ء میں تعمیر ہوئی۔

بارہ دری عیوض خاں۔ عیوض خان آصف جاہ کی غیر حاضری میں نیابت کی خدمت انجام دیتے تھے۔ یہ بارہ دری انہوں نے تعمیر کرائی۔ اس سے متصل دمڑی محل تعمیر ہوا۔ یہ عمارتیں مزدوروں کی اجرت سے دمڑی دمڑی بچا کر بنائی گئی تھیں۔ بارہ دری میں آج کل صوبہ داری اور اوّل تعلقداری کے دفاتر ہیں۔

یہ شہر اپنے عروج کے زمانے میں تین میل شمال میں کھام ندی تک اور مشرق میں چھ میل جنگل تھانے تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی آبادی عام طور پر ۵ لاکھ بھی جاتی تھی لیکن اس وقت جب کہ شہنشاہ اکبر کا دربار خاندان اور پورا لشکر اس کے عہدہ دار اور راجگان مع اپنے متعلقین کے یہاں قیام پذیر تھے تو کہا جاتا ہے کہ اس کی آبادی دس لاکھ کے قریب تھی۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ مغلوں کی وسیع و عریض سلطنت کی آمدنی اورنگ آباد پر خرچ ہوتی تھی لیکن آج یہ اپنی عظمت رفتہ کی ایک مٹی ہوئی یادگار ہے۔

جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے اس شہر پر تین شاندار دور گزرے ہیں۔ آصف جاہ نے اپنایا وہ وقت مستقر صوبہ داری پر صرف نہیں کیا بلکہ وہ زیادہ تر دہلی میں رہے۔ عہد عالمگیر میں یہ شہر خاص طور پر فوجی اور سیاسی مرکز بنا رہا۔ اس کی حقیقی عظمت و شان کا دور اس کے بانی ملک عنبر کے عہد میں گزرا ہے اس وقت وہ علوم و فنون کا مرکز تھا۔ مختلف طبقوں کے لوگ بہ امن و اطمینان ایک دوسرے کے دوش بدوش رہتے تھے۔ اس نے رجا تعمیر کیا۔ مسجد بنائی۔ پنڈت محل تعمیر کرایا۔ گاؤ کدہ بنوایا۔ وصاف ظاہر ہے کہ محض ہندوستانی روایات کو برقرار رکھنے کے لئے کیا گیا۔

شہر اورنگ آباد اپنے اندر رواداری مساوات امن اور آزادی کی بہت خوش گوار روایات رکھتا ہے۔ اس مضمون کے اختتام پر میں اس عظیم الشان شہر کے کھنڈروں کی طرف ایک پیغام سنانے کی جرأت کرتا ہوں۔ وہ پیغام کیا ہے۔ ذات پات اور مذہب کے امتیازات کو مٹانا۔ شہر کی بہبودی کی خاطر اور اس کی روایات کے شایان شان ترقی کرنے کی طرف بڑھنے کیلئے ایک دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھانا ہے۔

تمام مذہب کی ایک ہی تعلیم ہے۔ دہریت کی بھی تعلیم ہے کہ اس دنیا میں بنی آدم کے ساتھ کچھ نیکی کی جائے۔ عمر خیام کی ایک معنی خیز رباعی پر اس شہر کے بانی ملک عنبر کے احساسات کے لحاظ سے میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

در صومعہ و مدرسہ و دیر و کنشت ترسندۂ دوزخ است و جویائے بہشت
آں کس کہ ز اسرار خدا باخبر است زین تخم در اندرون دل ہیچ نہ کشت

**غلام احمد خاں**
(صوبہ دار)

---

"اس میں تاریخ اور افسانے اور واقعات اور تخیل کو اس خوبی سے سمویا ہے کہ قطب شاہی دور کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ بڑی بڑی تاریخوں سے وہ معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں جو اس چھوٹی سی کتاب میں ہیں اور نہ وہ کیفیت ہے جو اس میں ہے۔ اس وقت کی معاشرت کا رنگ بھی اس میں نظر آتا ہے اس زمانہ کے بعض بادشاہوں، شعراء اور مشاہیر کی تصویریں بھی ہیں جس سے کتاب کی دلکشی بڑھ گئی ہے۔" سیر گولکنڈہ کے متعلق مولانا عبدالحق صاحب بی۔ اے معتمد انجمن ترقی اردو کی رائے ہے۔ یہ کتاب صرف ۵ روپے میں سب رس کتاب گھر یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے۔

# خواتینِ دکن کی اردو خدمات

مندرجۂ بالا عنوان پر ہماری ایک کتاب زیرِ ترتیب ہے، بڑا حصہ مکمل ہو گیا ہے، اس کے ابتدائی اوراق " سب رس " کے ناظرین اور ناظرات کے ضیافتِ طبع کے لئے پیش ہیں۔ امید ہے کہ موجبِ دلچسپی ہونگے

ہاشمی

دکن میں اردو زبان کی ترویج ساتویں صدی ہجری (بارہویں صدی عیسوی) میں ہو چکی تھی، اس کے بعد وہ بہت جلد بول چال کے درجہ سے گزر کر تحریری صورت میں بھی آگئی، پھر اس نے ترقی کے مدارج مسلسل طے کئے، تا آنکہ آج جامعۂ عثمانیہ کے ذریعہ اس کا معراج ہو رہا ہے۔

دکن میں اردو کی ابتدائی اور اس کی ترقی کا مفصل تذکرہ " دکن میں اردو " کی تیسری اشاعت اور مدراس میں اردو، میں قلمبند کر دیا گیا ہے، اگرچہ دکن میں اردو " کے چند صفحات پر خواتین کا تذکرہ بھی آیا ہے، لیکن اردو کی ترقی میں خواتینِ دکن نے جو حصہ لیا ہے، اس کا کوئی مفصل تذکرہ ابھی قلمبند نہیں ہوا ہے، اس مختصر سی کتاب کا مقصد یہ ہے کہ بعض ان خواتینِ دکن کے کارناموں کی وضاحت کیجائے، جنہوں نے " ہندوستانی " کی ترقی میں حصہ لیا ہے۔

" ہندوستانی " کی ترقی کے لئے دکنی خواتین نے جو خدمت گزاری کی ہے، اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں :-

(۱) موٴلفین اور شعرائے اردو کی سرپرستی وغیرہ

(۲) شعر گوئی (۳) نثر نگاری و انشا پردازی (۴) خطابت (۵) صحافت اور انجمنوں کے ذریعہ اردو کی خدمت گزاری۔

ان ہی عنوانوں کے تحت صفحاتِ آیندہ میں خواتینِ دکن کی خدمات کا تذکرہ کیا جائیگا۔

**موٴلفین و شعرائے اردو کی سرپرستی وغیرہ**

خواتین کا موٴلفین اور شعرا کی سرپرستی کرنا، اور ان کے خدمات کا صلہ دیکر قدر دانی، ہمت افزائی کرنا، درحقیقت زبان کی خدمت گزاری میں داخل ہے، دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے، اور علما، شعرا فکرِ معاش سے مستغنی ہو کر علمی خدمت میں منہمک اور مصروف ہو جاتے ہیں۔

خواتینِ دکن نے بھی اردو مصنفین اور شعرا کی قدر دانی کی ہے، اور اپنی سرپرستی سے نظم اور نثر میں کتابیں مرتب کرائی ہیں، اس خصوص میں ہم سب سے پہلے عادل شاہی ملکہ خدیجہ سلطان شہر بانو کا نام پیش کرتے ہیں، جو سلطان قلی قطب شاہ کی پوتی، سلطان محمد کی برادر زادی، سلطان عبداللہ کی بہن تھی، اور سلطان محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۹ھ) سے بیاہی گئی تھی اس کے دربار میں کئی نامور شعرا کو بار حاصل تھا، ان میں ملک خوشنود اور رستمی جیسے استادانِ سخن بھی شامل تھے، ملکہ کی سرپرستی سے ملک خوشنود نے کئی مثنویاں لکھیں، جن میں ہشت بہشت اور یوسف زلیخا قابلِ تذکرہ ہیں، رستمی کے دکنی رزمیہ مثنوی کاشنہ کا خاور نامہ

قلمبند کیا، اسی کی وجہ سے ملکہ کا نام اس وقت تک باقی رہیگا جب تک کہ یہ مثنوی باقی ہے، سلطانہ شہربانو کی علمی فیاضی کا تذکرہ خیابانِ نسواں[1] میں تفصیل سے کیا جاچکا ہے، اس لئے یہی پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔

اس سلسلے میں دوسرا نام ماہ لقا بائی چندا کا پیش ہوسکتا ہے' اس کی علمی قدر دانی شعرا مصنفین اور مورخین کے لئے بہت بڑی ہمت افزائی کا باعث تھی' چندا کا مفصل تذکرہ آگے آتا ہے ۔

نور النساء بیگم مرحومہ بنت نواب مختار الملک اول کا نام نامی اس سلسلہ میں لانا ضروری ہے جن کی تعلیمی دلچسپی اور نسوانی ہمدردی کے باعث تذکرۂ جمیل ان کے اسم گرامی پر معنون ہوا ہے، اور ان کی سرپرستی میں اس کی اشاعت ہوئی ہے ۔

موجودہ دور میں ۔ اس ذیل میں شہزادی ہر ہائینس دُرِّ شہوار، دردانہ بیگم صاحبہ اور شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کا اسم گرامی پیش کیا جاسکتا ہے جن کے اسمائے گرامی پر کئی کتابیں معنون ہوئی ہیں، مثلاً ہر ہائینس کے اسم گرامی پر راقم کی کتاب " خواتین عہد عثمانی "، اور جہاں بانو بیگم نقوی کی پروازِ خیال، اور شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کے اسم گرامی پر بسمل صاحب کی تصنیف صنفِ نازک اور راقم کی خیابانِ نسواں کو معنون ہونے کا امتیاز حاصل ہے'

اس عنوان میں صغرا بیگم ہمایوں مرزا کا نام بھی پیش ہوسکتا ہے' جو عموماً اپنی علمی ہمدردی اور خصوصاً اردو کی دلچسپی کے باعث ادارۂ ادبیات اردو کے معاونین کے زمرہ میں شامل کی گئی ہیں ۔

## شعرگوئی اور نثر نگاری

اب ہم خواتین دکن کی شاعری اور نثر نگاری کی تفصیل بیان کرتے ہیں، مورخ اردو کے لئے یہ دشوار ہے کہ وہ ہر صدی کی خواتین کی ادبی خدمتوں کا تذکرہ کرسکے' اول تو اس لئے کہ پردہ کے باعث خواتین کے علمی کارنامے بھی پردۂ خفا میں رکھے گئے، اور آج بھی بعض گھرانوں میں اسی پر عمل ہے'

دوسرے یہ کہ زمانہ گزشتہ میں عام طور سے تعلیم نسواں کا رواج نہیں تھا، اور تعلیمی سہولتیں حاصل نہیں تھیں' اس لئے خواتین نے کچھ کام بھی کیا تو وہ پوشیدہ رہا ۔

گو یہ صحیح ہے کہ بعض خاندانوں میں عورتوں کی تعلیم کا رواج تھا، مگر ان میں بھی زیادہ تر ابتدائی اور معمولی مذہبی تعلیم کا رواج تھا، اعلیٰ عربی اور فارسی تعلیم حاصل کرنا سب کا کام نہیں تھا ۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہم کو گزشتہ صدیوں کے " اردو " خدمات کی تفصیل بیان کرنی دشوار ہے، جو کچھ صراحت اس موضوع کے تحت کی جاسکتی ہے وہ زیادہ تر چودھویں صدی ہجری سے متعلق ہوگی ۔

چودھویں صدی ہجری کے قبل ہم جن شاعر خواتین کا تذکرہ کرسکتے ہیں وہ صرف چندا، شرف النساء اور فاطمہ ہیں ۔

## چندا ۔

ماہ لقا بائی چندا' ایک ماہر فن موسیقی اور شاہی طوائف تھی' گو آج کل کے پیشہ ور طوائفین سے اس کی حالت

---

[1] مولف کی دوسری تالیف جو عصمت بک ڈپو دہلی سے شائع ہوئی ہے ۔

جداگانہ تھی، اس کی علمی قابلیت اور شعرا و مصنفین کی قدر دانی کے باعث آج تک اس کا نام زندہ ہے۔

۱۱۸۰ھ میں تولد ہوئی اور ۱۲۴۰ھ میں اس کا انتقال ہوا، حیدرآباد میں کوہ مولا کے قریب مدفون ہے۔

وہ صاحب منصب و جاگیر تھی، اس لحاظ سے بلند پایہ اور اعلیٰ حیثیت رکھتی تھی، اس کے موسیقی کے جلسوں میں ارسطو جاہ، اور میر عالم (وزرا حیدرآباد) جیسی شخصیت کے اصحاب شریک ہوتے تھے، اور میر عالم نے تو ایک مثنوی اس کی مدح میں لکھی ہے، چندا کے پاس صرف پہرہ کے لئے پانچ سو سپاہی ملازم تھے، اس سے اس کی دولت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

چندا ایک باکمال ماہر موسیقی ہونے کے علاوہ وہ ایک نازک خیال اور بلند پرواز شاعرہ بھی تھی، اس کا دیوان ۱۲۱۳ھ میں ارسطو جاہ کے حکم سے مرتب ہوا ہے جس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، جو سر جان ملکم کو بطور تحفہ دیا گیا تھا۔

وہ شاعری کے ساتھ شعرا کی قدر دان بھی تھی، اس کے پاس ہمیشہ شعر و شاعری کی گرم بازاری رہا کرتی، شعرا کی ہمت افزائی بڑھانا اور حوصلہ افزائی بھی اس کا معمول تھا۔

چندا کو موسیقی، شاعری کے ساتھ تاریخ سے بھی شغف تھا، اسکی سرپرستی سے ایک تاریخ "دل افروز" کے نام سے لکھی گئی ہے، جو دکن کی معتبر تاریخوں میں شمار ہو سکتی ہے۔

بہر حال چندا نے نہ صرف اپنی شاعری کے ذریعہ بلکہ شعرا و مصنفین کی سرپرستی کر کے بھی اردو زبان کی خدمت گزاری میں حصہ لیا ہے چندا کو شیر محمد خان ایمان سے تلمذ تھا۔

موضع "اڈیکمٹ" اسی کی جاگیر میں تھا، جہاں آج جامعۂ عثمانیہ کی پرشوکت اور شاندار عمارت تیار ہو رہی ہے،

چندا کا دیوان کوئی ضخیم دیوان نہیں ہے، اسکے کلام میں پاکیزگی اور لطافت کے ساتھ شعریت اور موسیقی بھی ہے جسکی وجہ سے دلآویزی پیدا ہو گئی ہے۔ مبتذل جذبات اور عامیانہ خیالات سے بھی اسکی شاعری پاک ہے، اس سے بھی اس کے بہترین اخلاق کا پتہ چلتا ہے،

"حیات ماہ لقا بائی" کے نام سے اس کی ایک سوانح عمری بھی غلام صمدانی خاں گوہر نے شائع کی ہے، یورپ میں دکنی مخطوطات "دکن میں اردو" اور "مرقع سخن" جلد اول میں اس کے حالات موجود ہیں،

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ جسطرح اس کی جاگیر "اڈیکمٹ" تعلیمی مرکز بن رہا ہے اسی طرح اسکی پروردہ لڑکی "حسن لقا بائی" کا باغ بھی زنانی مدرسہ کے لئے منتخب ہوا ہے[1]۔

چندا کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

قتل پر کس کے آج ہوتی ہے ۔۔۔ توسن حسن پہ سوار شہراب

کب تک رہوں حجاب میں محروم وصل سے ۔۔۔ جی میں ہے کیجے پیار سے بوس و کنار خوب

---

[1] نامپلی ہائی اسکول۔

رخصت بوسہ دیا پان چھپا کر ظالم — دینی قسمت میں گر تھا یہ حجاب یاقوت
ساقی دے مجھ کو جام مے ارغوان بھر — افسردہ دل میں آتش جو تھا بھی جاتی بجھ
بنایا یار کی صورت کو وہ نقاش قدرت نے — کھنچے نقشہ نہ ایسا مانی و بہزاد سے ہرگز
مری نازک مزاجی کی خبر رکھتا نہیں ہرگز — وہ سنگیں دل ہیں کہ کن ستی کا ہو کبھی واقف
عمر بھر یوں ہی رہے حسن کا چندا جلوہ — آرزو رکھتے ہیں یہ حید رکرار سے ہم
وفا کے ہاتھ سے اپنے کمال عاجز ہیں — جتاؤ اسکی نہی سے معلوم پیشتر ہم کو
چشم کا فر بھی مے اور غمزہ خونخوار بھی تیر — قتل کرنے کس پیاہی کے یہ تلوار بھی ہے
سو جان سے ہوئی وہ تصدق مرمولا — چنداں کی جو کوئین میں امداد کروگے
کیا ہے ضبط اس پردہ نشیں کے عشق میں تیرے — صدائے آہ ناگن ہی دل ستی ناگوش آئے

## شرف النساء

شرف النساء کے متعلق ہمیں کوئی معلومات حاصل نہیں ہیں۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ اسی زمانہ (تیرھویں صدی ہجری) کی شاعرہ تھی۔ اس کا ایک مرثیہ ہمیں دستیاب ہوا ہے جس کے بعض شعر ملاحظہ ہوں :-

جیسا چاند غم کا گگن میں حسین — پڑیا زلزلہ سب زمین میں حسین :
رسالت کے گلشن کا سنوبر چمن در — چھپا کربلا کے بے رن میں حسین !
کیا گلشن نے نیلی قبا تن اوپر — دیکھیا جب کھیلا کفن میں حسین[1]

## فاطمہ

فاطمہ بھی اسی زمانہ کی مرثیہ گو ہے، اس کا ایک مرثیہ ہمیں ملا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے متعلق بھی کوئی تفصیلی صراحت نہیں کی جاسکتی۔ مرثیہ کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں :-

کیوں کربلا میں آج حسین علی گئے — مظلوم کربلا حرم کو علی کے زن گئے
خنجر جفا کا حلق پیاسے پہ کئے — طفلاں کو کر یتیم نبی کے جوان گئے
کن کے گلے پہ ظالم سوں خنجر پھرا دریغ — حسرت سے ہاتھ مارتے خیر الامم گئے
نادے کو تیر تیغ کو کیا ظلم بے رحم — زہرا در تیغ سوں مارکر خیر النساء گئے
کہتے عرض رسول سوں گریاں ہو فاطمہ — پیاسا ہو آج جگ سوں شہ دین حسین گئے
قاسم سجن پہ ظلم ہوا کربلا منے ، — کرتے ہیں یاد تجھ کو دولہن کربلا منے
کیوں رن میں تجھ کو تنہا وان تن کربلا منے — افسوس آہ مارکو قاسم سجن سے گئے

---

[1] خیابان نسواں مولفہ راقم میں پورا مرثیہ نقل کیا گیا ہے۔

محشر میں فاطمہ کہے والی ہے فاطمہ پھر جام ہاتھ کو پلادیں گے فاطمہ
کر فضل سوں اس کو چھڑاویں گے فاطمہ مظلوم فاطمہ کے حسین علی گئے

(از بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین صاحب)

افسوس ہے کہ تیرھویں صدی ہجری کے دیگر کسی شاعر خاتون کا تعارف کرانے سے ہم سر دست معذور ہیں۔ ممکن ہے کبھی اس میں اضافہ ہو سکے۔ اس کے بعد چودھویں صدی کے شعرا و نثر نگار خواتین کا تذکرہ کیا جائے گا سہولت کے مدنظر ان کی تقسیم کی گئی ہے، دور محبوبی، دور عثمانی کے تحت ان کو متعارف کیا گیا ہے فقط

نصیر الدین ہاشمی

# اورنگ زیب اور تانا شاہ

"اچھا تو نماز ہو رہی ہے!"

تانا شاہ نے کہا اور ساتھ ہی اس کا چہرہ غصے سے تمتما گیا۔

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ مغل ہمارے نشانہ بازوں کی اتنی تحقیر کریں گے! قلعہ کے اس قدر قریب اور ہمارے تیر و تفنگ کی زد میں کھڑے ہو کر نماز جماعت ادا کرنا مصلحت اور دور اندیشی سے یقیناً بعید ہے! کیا اورنگ زیب جیسا دور اندیش اور ہوشیار بادشاہ بھی غلطی کر سکتا ہے! نہیں ہرگز نہیں یہ ایک طرح کی تحقیر ہے دیکھنا ہے کوئی ہمارا اچھا نشانہ باز؟"

اورنگ زیب کئی مہینوں سے گولکنڈہ کا محاصرہ کئے ہوئے ہے مغل فوجیں چاروں طرف سے ایک مہیب سمندر کی پرجوش موجوں کی طرح قلعہ کی فصیلوں سے آ کر ٹکراتی ہیں۔ اور ہر مرتبہ دکنی سپاہی پہاڑوں کی چٹانیں بن کر انہیں پیچھے ہٹا دیتے ہیں۔ اس وقت آفتاب کی تمازت میں خاصی کمی ہو گئی ہے اور مغلیہ لشکر اپنی پوری قوت کے ساتھ حملوں پر حملے کئے جا رہا ہے۔ ان صفوں کے ذرا پیچھے دو تین ہزار فوجی قطاریں نظر آتی ہیں کیونکہ اورنگ زیب اور اس کے کئی ایک مصاحب ابھی ابھی نماز کیلئے صف بستہ کھڑے ہیں۔ چند لمحے گزرنے نہیں پاتے ہیں کہ امام یکایک تڑپ کر آگے کی طرف گر پڑتا ہے۔

"خوب: شاباش!! امام رکھ لیا۔ دیکھنا صف میں سے ایک دوسرا شخص امامت کیلئے آگے بڑھ رہا ہے۔ ... ہاں چھوڑنا نہیں۔ کوئی امام نہ بچے ... اس کو کہتے ہیں انتقام تحقیر!!"

شاہی حکم بجا لا کر دوسرے امام پر گرتا ہے اور وہ بھی دکنی گلندازوں کا نشانہ ہو جاتا ہے

دو تین پیش اماموں کے یکے بعد دیگرے اس طرح نذر اجل ہو جانے کے بعد امامت کیلئے صف میں سے آگے بڑھنا کسی معمولی دل و دماغ والے کا کام نہیں! اس سرے سے اس سرے تک پس و پیش کا ایک عجیب عالم چھا جاتا ہے۔ لیکن ابھی چند لمحے بھی گزرنے نہیں پاتے ہیں کہ خود اورنگ زیب امامت کے لئے بڑھتا نظر آتا ہے اور ادھر گولکنڈہ کا شاہی نشانہ باز بندوق خالی کرنے ہی کو ہے کہ تانا شاہ لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

"ظالم! کیا ایک بادشاہ کو بھی نشانہ بنائے گا؟ دکھائی نہیں دیتا کہ خود اورنگ زیب اس وقت امام ہے!!"

سید محی الدین قادری زور

# حیدرآباد اور دیہی تنظیم

ہر ملک اپنی آب و ہوا، موسمی خصوصیات، قدرتی حالات اور جغرافی ماحول کے مطابق اپنی آبادی کی گذراوقات کے لئے آمدنی حاصل کرنے کے چند شعبوں کا انتخاب کر لیتا ہے۔ ان مختلف شعبوں میں زراعت سب سے اہم ہے کیونکہ اس میں نہ صرف پودے لگا کر زرعی پیداوار ہی حاصل کرنا شامل ہے بلکہ فصلوں کو بیماریوں اور وباؤں سے بچانے کی تدبیریں، زرعی پیداواروں کی نکاسی کا انتظام، مویشیوں کی خورد و پرداخت، اچھی نسلیں پیدا کرنا، زمین کے مختصر ٹکڑوں سے زائد پیداوار حاصل کرنے کی کوشش بھی اسی کے دائرہ میں داخل ہے۔ اور دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ اسی شعبہ سے آمدنی حاصل کر رہا ہے۔

۱۷۶۰ء کے صنعتی انقلاب سے پہلے ہر ملک میں زراعت کی بڑی اہمیت تھی، مگر انقلاب کے بعد حالات بدل گئے۔ بھاپ پر انسانی اقتدار اور نئی نئی کلوں کی ایجاد نے پیدائش دولت کو آسان کر دیا۔ دولت کی کثیر تعداد قلیل وقت میں انسان کی معمولی کوشش سے پیدا ہونے لگی۔ اس نئے طریقہ نے کس طرح قدیم مذہبی رجحانات، انفرادی آزادی، خانگی زندگی، گھریلو مسرت کو مٹایا، چھوٹے دستکاروں اور غریب صناعوں کا خاتمہ کیا گیا، مفلس کو مفلس ترین اور دولت مند کو دولت مند ترین بنانے میں مدد دی، یا میکانی قوت جس کی ابتدا انسان کے ایک تابع غلام کی حیثیت سے ہوئی اس نے کس طرح انسان کو اپنا غلام بنا لیا ہمارے موضوع سے خارج از بحث ہیں، مگر انقلاب کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوا کہ زراعت کو غیر اہم اور صنعت و حرفت کو اہم سمجھا جانے لگا، ہر ملک یہ سمجھنے لگا کہ ہمارا کام صنعتی اشیا پیدا کرنا ہے، اور زرعی پیداوار ہمارے لئے دوسرے مہیا کرتے ہیں۔ اگر صرف چند ممالک اس اصول کو اختیار کرتے تو کچھ بے جا نہ تھا بلکہ تجارت خارجہ کے نظریہ کے مطابق کہ ہر ملک وہی چیزیں پیدا کرے جس کے لئے وہ موزون ترین ہو، اور آپس میں مبادلہ کر کے اپنی ضروریات پوری کر لے بہت اچھا تھا کیونکہ اس کی بدولت ہر قوم دوسری قوموں کے قدرتی عطیات اور کسبی کمالات سے پوری پوری طرح مستفید ہو سکتی تھی۔ اور مجموعی حیثیت سے دنیا میں کثیر دولت پیدا ہو سکتی اور دنیا کی خوشحالی میں اضافہ ہو سکتا تھا، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا، بلکہ ہر ملک نے اس اصول کو اختیار کرنے کی کوشش کی، حالانکہ یہ ان ملکوں کا رجحان تھا جن کے یہاں قدرتی حالات، موسمی خصوصیات اور زمین کی ساخت کے اعتبار سے زراعت کے کچھ اچھے امکانات نہ تھے، مگر دنیا کے ہر ملک نے اس رجحان کو ایک کلیہ بنا لیا اور صنعتی دوڑ میں ایک عالمی مسابقت شروع ہو گئی۔

زرعی معاشیات میں جنگ عظیم سے پہلے جو ادب کی قلت نظر آتی ہے اس کی وجہ یہی عالمی رجحان تھا، مگر جنگ عظیم کے تلخ تجربوں نے فاتحین اور مفتوحین پر اس امر کا انکشاف کر دیا کہ اگر جنگ طویل ہو جائے، ملک کا محاصرہ کر لیا جائے، وسائل آمد و رفت کو مسدود کر دیا جائے تو ملک میں زہریلے بموں، مشین گنوں، خطرناک توپوں، ہوائی جہازوں، غوطہ خور کشتیوں اور جنگی جہازوں کی کثرت کے باوجود لڑائی جاری رکھنے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں کیونکہ جنگ کا انحصار آلات حرب سے زیادہ اشیائے خوراک پر ہے اور جب ان ہی کی قلت ہو جائے تو نہ لڑنے والے لڑ سکتے ہیں نہ آلات حرب کام آ سکتے ہیں۔ چنانچہ جنگ کے بعد یہ اصول تسلیم کر لیا گیا تھا کہ قوم کی مدافعت اور ملک کی حفاظت کے لئے زراعت ایک ناگزیر شئے ہے، اب دنیا نے زراعت کی طرف توجہ شروع کی، زرعی پروگرام بنائے گئے، زراعت کو ترقی دینے، اور زرعی آبادی کو بڑھانے کی کوشش شروع ہوئی اور حکومتوں نے اس سلسلے میں بے دریغ روپیہ خرچ کرنا شروع کیا اور زراعت کی ہر طریقے سے مدد کی جانے لگی۔

ہندوستان، اسکے صوبے، اور ریاستوں میں زراعت کا حال بالکل ہی مختلف ہے، اگر دوسرے ممالک میں زرعی آبادی کی قلت ہے تو ہمارے یہاں زرعی آبادی کی کثرت ہی نے زراعت کی حالت کو خراب کر رکھا ہے، اگر ان کے یہاں دیہی آبادی کم ہے تو ہمارے یہاں شہری آبادی کی کمی ہے۔ دراصل ہندوستان کلکتہ، بمبئی، دہلی یا حیدرآباد جیسے عظیم الشان شہروں، ان کی سربفلک عمارتوں خوشنما اور وضع دار بنگلوں، چوڑی سمنٹ دار سڑکوں، جگمگاتی ہوئی دوکانوں کا نام نہیں ہے۔ ہندوستان نام ہے اس کثیر آبادی کا جو کچے جھونپڑوں یا پھوس کے ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں رہتی ہے۔ محنت مشقت سے جنکے چہرے زرد ہیں، گال پچکے ہوئے آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں، بدن پر جھریاں ہیں، جنکی اکثر غذائیں ایسی ہیں جن میں غذائیت کا جز نہیں، جنکے بدن کا اکثر حصہ شرمندہ لباس نہیں، جنکا ماحول ملیریا، انفلوئنزا، ہیضہ، چیچک، طاعون، دق، سل اور اسی طرح کے دیگر متعدی امراض کے جراثیم سے پُر ہے۔ جو دنیا کے لئے غذا مہیا کرتا ہے مگر اپنی غذا کے لئے دوسروں کا محتاج ہے، جو ہمارے شہروں اور گھروں کی رونق کا باعث ہے مگر خود اس کے گھر اجڑے ہوئے اور بے چراغ ہیں، وہ محنت کرتا ہے تو اس کی محنت کے پھل دوسرے کھاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ زراعت کی ان خرابیوں کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا ہر جگہ زراعت میں وہی خرابیاں ہیں جو ہمارے یہاں ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملکی حالات نے مجموعی حیثیت سے زراعت کی حالت کو خراب کر رکھا ہے، اور قدرت، سماج، کاشتکار اور حکومت ہر ایک اپنی جگہ پر اس کی تباہی کا ذمہ دار ہے۔

قدرتی اسباب میں سیلاب، خشک سالی، بارش کی غیر مساوی تقسیم، موسموں کی غیر یقینی حالت، کہر، اولا، پالا، اور ٹڈی دل شامل ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ان میں سے بعض اسباب کو دور کیا جا سکتا ہے۔ گویا انسان اگر قدرت کے قابو سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا تو کم از کم اسکا اتنا مطیع اور فرمانبردار بھی نہیں رہ سکتا جتنا کہ وہ آج نظر آرہا ہے۔

مجموعی حیثیت سے سماج پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس نے زراعت کو معزز پیشہ نہ سمجھا، دیہاتیوں کے متعلق اچھی رائے قائم نہ کی، مصلحین قوم اور محبان وطن کا فرض تھا کہ وہ اس طرف توجہ کرتے مگر انھوں نے کثیر آبادی کو چھوڑ کر شہری آبادی کو جسکی ہمارے ملک میں قلت ہے اپنی اصلاح کا مرکز بنایا۔ انھوں نے کارخانے کے مزدوروں کیلئے جنکی تعداد ۲۰ سے ۴۰ لاکھ کے درمیان ہے قوانین بنانے اور ان کیلئے سہولتیں بہم پہونچانے کی جانب اپنی توجہ مبذول کی اور ۲۸ کروڑ آبادی سے تغافل برتا۔ اس خصوص میں سب سے زیادہ مورد الزام وہ تعلیم یافتہ اور صاحب حیثیت افراد ہیں جنھوں نے دیہات میں جنم لینے اور پرورش پانے کے بعد دیہات سے لاپروائی اختیار کی۔ یہ اپنی واقفیت اور قدیم اقتدار کی بنا پر بہت کچھ کر سکتے تھے، مگر انھوں نے بھی اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے کیلئے شہروں کو ہی انتخاب کیا ایسی صورت میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ان میں صداقت اور خلوص کا نام نہ تھا بلکہ وہ شہرت اور تشہیر کے خواہاں تھے وہ خدمت خلق کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ دنیا پر اپنی قابلیت و عظمت کا سکہ بٹھانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ دور افتادہ گاؤں میں یہ ذرائع کہاں، ان کے لئے تو بڑے بڑے شہری مرکزوں میں جہاں جذبۂ شہرت کو تسکین دینے کیلئے مختلف قسم کے ذرائع موجود ہیں۔ ذات پات کے طریق کی ذمہ داری بھی سماج ہی کے سر ہے، اس نے کسی کو ادنیٰ اور کسی کو اعلیٰ بنایا۔ سماج نے مذہب کی آڑ لیکر چھوت چھات کی بنا ڈالی، اور ان کو وہ اہمیت دی کہ گویا ان ہی کی ادائی مذہب ہے۔

زرعی مذہب کی سب سے پیچیدہ کڑی خود کاشتکار ہے کیونکہ زراعت کی بہتری اور بدتری کا انحصار اسی پر ہے۔ وہ دنیا کے حالات سے بے خبر، ان پڑھ، مفلس، قرض دار، فضول خرچ، قدامت پرست اور قسمت پرست ہے۔ کسان کے لئے منظم تعلیم کی بڑی ضرورت ہے۔ اکثر و بیشتر کاشتکاروں کو پیداوار کی کمی سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا ان کی خراب تنظیم سے ہوتا ہے۔ وہ مفلس اور قرضدار ہے مگر تقاریب شادی اور رسومات پر خوب خرچ کرتا ہے۔ اس کے پاس آمدنی و خرچ کا کوئی حساب نہیں۔ اس کو نہیں معلوم کہ اس کو کیا آمدنی ہو رہی ہے اور کس مد پر اخراجات کیا ہیں۔ ناواقفیت کی بنا پر وہ اچھی قسم کی فصلیں پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ کم سمجھی کی بنا پر عارضی نفع کی خاطر وہ اچھی فصلوں میں خراب فصلوں کی آمیزش کر دیتا ہے۔ قدرت پرستی اور قسمت پرستی اس کو نئے طریقوں کے اختیار کرنے سے روکتی ہے۔

حکومت جس کا کام رعایا کی فلاح و بہبود کے ہر ممکنہ ذریعہ اختیار کرنا ہے، اس نے بھی اس عالمی رجحان کے تحت جس کا ذکر کیا جا چکا ہے اس طرف سے لاپروائی برتی، اور مقامی حالات کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ خود اہل ملک نے بھی حکومت کو اس جانب متوجہ کرنے کی کوشش نہ کی۔ اس وقت ہندوستان کے قائدین اس بات پر زور دیتے تھے کہ چونکہ ہندوستان کی قدیم صنعتوں کو ختم کر دیا گیا ہے اس لئے دوبارہ ان کو زندہ کیا جائے۔ انڈین نیشنل کانگریس جیسے قومی ادارے نے ۱۹۰۵ء میں صنعت و حرفت کی ترقی و احیا کے لئے ایک الگ شاخ قائم کی، مگر زراعت کی جانب ۱۹۳۲ء سے پہلے توجہ نہ کر سکی۔

جنگ میں حکومت برطانیہ کے تلخ تجربات سے حکومت ہند نے بھی فائدہ اٹھایا۔ اور ۱۹۱۹ء کی اصلاحات میں وزیر زراعت کا عہدہ قائم ہوا، ۱۹۲۶ء میں زرعی کمیشن مقرر ہوا، جس کی رپورٹ پر غور کرنے کیلئے شملہ میں صوبوں کے وزرا اور ناظمان زراعت، اور امداد باہمی کے رجسٹراروں کی کانفرنس منعقد ہوئی، ۱۹۲۹ء میں شاہی زرعی تحقیقاتی کونسل مستقل ارکین کیساتھ وجود میں آئی۔

دیہی تنظیم یا دیہات سدھار بالکل حالیہ اصطلاح ہے، ملک میں ۱۹۳۱ء سے پہلے اسکی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا۔ جب کہ ایک جانب کانگریس نے دیہات سدھار کو اپنے نظام نامے میں شامل کیا تھا، دوسری جانب عالمی کساد بازاری نے زرعی پیداواروں کی قیمتیں سطح سے بہت نیچے قرار دی تھیں، موازنوں میں خسارہ آ رہا تھا اور زرعی آبادی کو سخت معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ۱۹۳۵-۳۶ء کے موازنہ میں ایک کروڑ کی رقم مرکزی حکومت نے دیہات سدھار کیلئے منظور کی۔

ممالک محروسہ میں زراعت کے کم و بیش وہی حالات ہیں جو برطانوی ہندیا ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں ہیں، یہاں ۲۱۲۲۳ دیہات ہیں، آبادی کا ۱۱ فیصد شہروں میں اور ۸۹ فیصد دیہات میں رہتا ہے گو یہاں زراعت کے تحفظ کیلئے مختلف تدابیر پہلے بھی اختیار کی جاتی تھیں مثلاً قحط کے زمانہ میں کاشتکاروں کی امداد، یا خشک ہنگاموں میں مالگزاری میں معافیاں، یا زرعی آبادی کی بہبودی کیلئے ۱۹۱۲ء میں قانون امداد باہمی کا نفاذ وغیرہ، مگر اسی عالمی رجحان کے تحت زراعت کی جانب کوئی خاص توجہ نہ تھی۔ مگر حالات کے بدلتے ہی یہاں بھی تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ گو زراعت کا محکمہ ۱۹۱۲ء سے قائم ہے مگر ابتدا میں اس کا خاص مقصد "گرانی" روئی کو تباہی سے بچانا تھا۔ مگر ۱۹۲۹ء میں اس کا مقصد ملک کی عام زراعت کی ترقی قرار پایا۔ اس نے تحقیق، تجربے اور تشہیر سے اپنے مقاصد کو پورا کرنا شروع کیا۔ تحقیق کا مقصد یہ تھا کہ معلوم ہو سکے کہ کونسی فصلیں اچھی ہیں یا ان کو کس طرح اچھا بنایا جا سکتا ہے، چنانچہ اس وقت تک متعدد مقامی اعلیٰ قسم

کی قسمیں دریافت ہوچکی ہیں۔ تحقیقاتی نتائج جانچے' اور نئے آلات یا نئے طریقوں سے زمین کی پیداوار بڑھانے کے لئے مزرعے قائم کئے گئے تاکہ علمی اور معاشی حیثیت سے نتائج کا امتحان ہو سکے۔ کامیاب تجربوں کو کاشتکاروں کے سامنے پیش کرنے لئے تشہیر کی ضرورت پیش آئی تاکہ کاشتکار جن کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا ہے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اسوقت محکمۂ زراعت کے تحت دس مزرعے ہیں' جہاں یہ کام ہو رہے ہیں' فصلوں کی بیماریوں کا علاج' مویشیوں کی بیماریوں' اور ان کی غور و پرداخت کی جانب بھی توجہ ہو رہی ہے۔ مرغیوں کے سلسلہ میں بھی کافی تجربات ہوچکے ہیں۔ دیہی تنظیم کے سلسلے میں ممالک محروسہ میں دیہی تنظیم کا ایک مرکزی بورڈ قائم ہے' جن میں باب حکومت کے چار اراکین' مالگذاری' اور صنعت و حرفت کے معتمدین' ناظم معتمد مالگزاری' چاروں صوبیدار' محکمہ ہائے تعلیمات' صحت عامہ و طبابت' زراعت' صنعت و حرفت' معلومات عامہ کے نظماء امداد باہمی کے رجسٹرار' مارکٹنگ آفیسر اور سنٹرل کو آپریٹیو یونین کے نمایندے شامل ہیں۔ مرکزی بورڈ ایک عام خاکہ تیار کرتی ہے اور اسکو عملی جامہ پہنانے کے لئے اضلاع اور تعلقوں میں مقامی بورڈ قائم ہیں۔ جن میں سرکاری اراکین بھی شامل ہوتے ہیں۔ غرض دیہی تنظیم کا سب سے اہم مرکز ہے' زراعت کی ترقی و اصلاح' مویشیوں کی اصلاح' اور معاشری اصلاح نظام العمل کے اہم جز ہیں۔ زراعت کی ترقی میں دوسرا قدم جو اٹھایا گیا وہ مختلف قوانین کا سلسلہ تھا۔ ۱۹۱۳ء کے قانون امداد باہمی جسکی رو سے زرعی اور غیر زرعی انجمن قائم ہوئیں' تعلقہ داری اور مرکزی بنک' اور صدر جمعیت اتحاد کا قیام عمل میں آیا اسکا ذکر کیا جاچکا ہے۔ ۱۹۲۳ء سے موازنہ میں امداد قحط اور محفوظہ قحط کی مدات داخل ہوئیں اور تقریباً ۲۰' ۲۲ لاکھ سالانہ کی رقم قحطوں یا امدادی اور تعمیری کاموں کیلئے مخصوص کی جانے لگی۔ ۱۹۳۱ء میں قانون زرعی بازارات کا نفاذ ہوا۔ اسکا مقصد باضابطہ منڈیوں کا قیام تھا تاکہ کاشتکاروں کو غیر منظم منڈیوں کے نقصانات سے محفوظ رکھا جائے' باضابطہ منڈیوں میں مذہبی یا خیراتی نام سے پیداوار وصول کرنے کی ممانعت کی گئی۔ صحیح اوزان کو رائج کیا گیا' تولنے والوں کے لئے اجازت نامہ ضروری قرار پایا' خریداروں کو کاروبار کی جملہ کارروائی درج کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس قانون کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ برطانوی ہند کے قانون کی طرح صرف روئی کیلئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اسکا اطلاق تمام زرعی پیداوار پر ہوتا ہے۔

زراعت کی پستی کا ایک بڑا سبب قرضداری ہے' کاشتکار مفلس ہے اور اسکو اپنے روزمرہ کی ضروریات مویشی' آلات' تخم' خریدنے یا کھدائی اور کٹائی کی اجرت ادا کرنے کیلئے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے' یہ رقم وہ ساہوکار سے لیتا ہے' ساہوکار نہ صرف گراں شرح سود اور سود مرکب وصول کرتا ہے بلکہ دوسری مختلف ترکیبوں سے بھی کاشتکار کو لوٹنے کی فکر کرتا ہے' اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کاشتکار کو قرضہ کا بار ابھرنے نہیں دیتا۔ مسٹر ایس ایم بھروچہ جنہوں نے ممالک محروسہ میں زرعی قرضداری کی تحقیقات کی تھی ممالک محروسہ کے زرعی قرضہ کا اندازہ ۶۴½ کروڑ سے کچھ زائد بتایا ہے۔ آپ نے ۲۲۱ مواضعات کی تحقیقات کے بعد زرعی آبادی کے قرضہ کا اوسط ۶۰ روپیہ فی کس بتایا ہے۔ مجھے حال میں ایک موضع کی تحقیق کے سلسلہ میں معلوم ہوا کہ اسکے زرعی قرضہ کی تعداد ایک لاکھ ۵۴ ہزار ہے جبکہ اسکی آبادی ۲۵۶۲ ہے۔ ۵۰ روپیہ فی کس کل آبادی پر اور ۱۰۰ روپیہ فی کس زرعی آبادی پر قرضہ کا اوسط آتا ہے۔ مسٹر بھروچہ نے بتایا ہے کہ دس لاکھ ایکڑ مزروعہ زمین میں سے ۳ لاکھ ایکڑ مکفول ہوچکی ہے اور ایک لاکھ ۹۰ ہزار ایکڑ کاشتکاروں کی ملکیت سے نکل کر قرض خواہوں کے قبضہ میں جاچکی ہے۔ تصویر کا یہی ایک بھیانک اور تاریک رخ تھا جس نے ان مختلف خرابیوں کے انسداد کیلئے حکومت کو فوری اقدام پر مجبور کیا اور

مصالحت قرضہ، قرض دہندگان، اور انتقال اراضی کے تین دستور العمل نافذ ہوئے، اگرچہ ان میں بعض خامیاں ہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان سے کاشتکاروں کو بڑا فائدہ پہونچنے کی امید ہے۔ یہ ڈوبتے ہوؤں کیلئے سہارا، اور جو ڈوبے نہیں ہیں ان کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں۔

دیہی تنظیم کا کام جو ریاستوں یا صوبہ واری حکومتوں کے یہاں بہت ہی شاندار نظر آتا ہے فی الحقیقت اس قدر شاندار نہیں ہے۔ ہندوستان جہاں تقریباً ۷ لاکھ گاؤں ہوں وہاں چند سو دیہی مرکزوں کی وہی مثال ہے جیسے سمندر میں چند قطرے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آخر یہ کام کس طرح ہو؟ کیا مروجہ طریقہ کو جاری رکھا جائے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ڈیڑھ سو دو سو برس بعد ہم وہاں پہونچیں گے جہاں دنیا آج ہے گویا دنیا سے دو صدی پیچھے رہنا ہماری قسمت میں لکھا ہے۔ نہ کسی حکومت سے یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ ہر گاؤں کو دیہی تنظیم کا مرکز بنا دے، اور دس پانچ سال میں ملک کی حالت بدل دے، اس طرح یہ سانپ کے منہ کی چھچھوندر ہوگی جس کو نہ نگلا جا سکتا ہے اور نہ اگلا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسا پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے جس کا کوئی حل ہی موجود نہ ہو، حل موجود ہے مگر اس میں مشکلات ہیں، اور ان پر غالب آنا ہمارا کام ہے، میرا خیال ہے کہ یہ مسئلہ حکومت، سماج، مصلحین معاشرت، محبانِ وطن اور سب سے زیادہ اور سب سے اہم تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اشتراک سے طے ہو سکتا ہے۔

یہ سمجھنا کہ اصلاح دیہات کیلئے کثیر رقم کی ضرورت ہے ایک گمراہ کن خیال ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر نئے کام کیلئے روپیہ کی سخت ضرورت ہوتی ہے اسی طرح دیہات سدھار کیلئے بھی کچھ روپیہ کی ضرورت ہے، مگر روپیہ سے زیادہ ایسی چیزوں کی ضرورت ہے حکومت مہیا نہیں کر سکتا، ان چیزوں کو خلوص، ہمدردی، ایثار، قربانی اور انسانیت کہا جاتا ہے ہمارے سامنے ایسے کامیاب ادارے موجود ہیں جن کے پاس ابتدا میں سرمایہ بہت قلیل تھا مگر کام کرنے والوں میں مندرجۂ بالا خصوصیات موجود تھیں، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس سرعت، تیزی اور استحکام سے کام کیا کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ دیہات سدھار کے سلسلہ میں متعدد کام ایسے ہیں جن میں روپیہ کی قطعی ضرورت نہیں، اور متعدد کام ایسے ہیں جن میں روپیہ کی بچت ہوتی ہے۔

ہم اپنے کسان کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں اچھائی اور برائی سمجھنے کی تمیز نہیں، یا وہ نفع و نقصان میں امتیاز نہیں کر سکتا، لیکن اس کے باوجود وہ پرانی لکیر کا فقیر نظر آتا ہے اس کی وجہ قسمت پرستی ہے۔ اس میں آگے بڑھنے کا شوق اور اونچا ابھرنے کی امنگ مفقود ہو چکی ہے۔ اس قنوطیت کا اصلی سبب وہ حادثات ہیں جو برسوں سے اس کو اپنا شکار بنا رہے ہیں۔ انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں تک ملک میں امن و امان نہ تھا، حملہ آور آتے اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے اسکے کھیتوں کو روندتے، اسکی فصلیں کاٹ لیتے یا ان کو جلا دیتے تھے، جب ملک میں امن و امان قائم ہوا تو حملہ آوروں کا خوف کم ہو گیا مگر سیلاب، خشک سالی، اولا، پالا، اور ٹڈی دل سے اس کی فصلوں کو نقصان پہونچتا رہا۔ مختلف بیماریاں اسکو اپنا لقمہ بناتی رہیں۔ رفتہ رفتہ اس کو یہ یقین ہو گیا کہ ارضی و سماوی مصیبتیں انسان کی بدکرداریوں کا نتیجہ ہیں۔ اس نے قدرت کو غیر منصف تصور کر لیا۔ مگر یہ سوال اس کے ذہن میں پیدا ہوتا تھا کہ قدرت خصوصیت سے اس پر ظالم کیوں ہے۔ اس بات کا کھوج نہ لگانے کی وجہ سے اس کے ذہن میں یہ احساس قوی تر ہو گیا کہ اپنی بھلائی اور برائی کا کوئی کام وہ خود نہیں کر سکتا، اس کی قسمت کو بگاڑنے یا بنانے والی ایک ایسی ہستی ہے جس پر اس کا قابو نہیں، اس لئے اس نے اپنے تمام کام اسی کے حوالہ کر دئے نتیجہ

قسمت پرست یا قناعت پسند اور بالفاظ دیگر وسعت، کاہل اور نکما ہوگیا۔

آج سے چند سال پہلے اس میں سے اکثر چیزوں کو برداشت کیا جاسکتا تھا، مگر اب سائنس، فن انجینیری، فن زراعت، اور علم طب کی ترقی نے انسان کا قابو قدرت پر بڑھا دیا ہے۔ گویا قسمت پرستی کا دور ختم ہوگیا مگر دیہاتی تو قسمت پرست ہے، اس میں یہ احساس پیدا نہو سکا کہ ماضی ختم ہوچکا ہے اور خوشگوار مستقبل سامنے ہے وہ ماضی کا دلدادہ ہے اور حال و مستقبل کی فکر سے بےنیاز ہے۔ ماضی خواہ کتنا ہی شاندار کیوں نہو اس کو یاد کرنا بیکار ہے، گزرا ہوا زمانہ واپس نہیں آتا، آنے والے زمانہ کی فکر کرنا اور اسکو خوشگوار بنانا سب سے اہم فریضہ ہے۔

دیہی زندگی جمود و سکون کا نام ہے۔ وہاں بےحسی، غفلت اور ناواقفیت کے دیوتاؤں کا راج ہے، ان کے دل مردہ اور امیدیں پژمردہ ہیں، ضرورت ہے کہ ان کے جمود و سکون کو توڑا جائے، بےحسی اور غفلت کے پردوں کو چاک کیا جائے، مردہ دلوں میں اور پژمردہ امیدوں میں شوق اور امنگ پیدا کی جائے، ان کو بیدار کرکے متحرک اور جاندار بنادیا جائے، ان کے رگ و ریشہ میں برقی رو دوڑادی جائے، ان کو خوداعتمادی کا سبق پڑھایا جائے، یہ کام ملک کے نوجوان ہی انجام دے سکتے ہیں۔ یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ ان کی یہ صلاحیتیں مٹ چکی ہیں۔ کانگریس نے برسر اقتدار آنے سے پہلے چھوٹے چھوٹے دیہات میں زندگی کی روح پیدا کی تھی، اور خوابیدہ قوتوں کو بیدار کردیا تھا۔ وہ اس قوت کو حکومت سے ٹکرانا چاہتی تھی جس میں اس کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی، مگر اس طرح سادہ لوح کسان بھٹک گئے، اور جب کانگریس نے عہدے قبول کرلئے تو وہ اس نئی حکومت سے ٹکرانے لگے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسانوں میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے جراثیم ضرور موجود ہیں، اب اس کا انحصار کام لینے والوں پر ہے کہ وہ ان کا رخ کس طرف پھیرتے ہیں۔

میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان یا ممالک محروسہ سرکار عالی جیسے زرعی خطوں کے دیہات کی اصلاح حکومت کے بس کی بات نہیں ہے، حکومت بزور قانون اصلاح نہیں کرسکتی، اصلاح کا احساس خود پسماندہ لوگوں میں پیدا ہونا چاہئے۔ جبری اصلاح کا ہمیشہ یہ نتیجہ رہا ہے کہ جب جبر اٹھایا گیا اصلاح ختم ہوگئی، ضرورت ہے کہ ملک کے سنجیدہ، مخلص اور ٹھوس کام کرنے والے تعلیم یافتہ نوجوان دیہات میں مستقل سکونت اختیار کریں اور اپنا ایک نصب العین بنا کر اس کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔ کام کرنے والوں کو اپنے آپکو حاکم یا مخدوم نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ وہ کاشتکاروں کے دوست، مشیر کار اور خادم بننے کی کوشش کریں، مخدوم بننا آسان ہے اور خادم بننا مشکل، ان کو اسکا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ گاؤں ہماری تہذیب کا قدیم ترین مرکز ہے، کسی قدیم عمارت کو مٹا کر اس کی جگہ اسی مسالہ سے نئی عمارت تعمیر کرنا آسان نہیں، ان کو ابتدا میں مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا ان کو قدم قدم پر ناکامیوں کا منہ دیکھنا ہوگا، ان کو دلی اذیت اور روحانی تکلیف بھی ہوگی کہ جو چیزیں جنکی بھلائی کے لئے پیش کیجارہی ہیں وہی اس کو ٹھکرا رہے ہیں، مگر ان کو ناامید نہونا چاہئے اور غم و غصہ سے الگ رہ کر خلوص سے کام کرتے رہنا چاہئے۔ خلوص اور قربانیوں کا درخت پھل ضرور لائیگا اور بار آور ہونے میں جتنا زیادہ وقت لگے گا اتنے ہی اسکے پھل عمدہ اور شیریں ہوں گے۔

محمد احمد سبزواری

# بیڑ کی چھاگل اور کپتی کی صنعت

ہندوستان کی صنعتی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں قدیم زمانہ میں مختلف گھریلو صنعتیں تھیں صرف ان کا وجود ہی نہ تھا بلکہ یہ نہایت ترقی پر تھیں اور دیگر ممالک میں بھی وہ شہرت حاصل کر چکی تھیں لیکن صنعتی انقلاب کے بعد جب مشین کا بنا ہوا دکھاؤ اور سستا مال یہاں کے بازار میں آنے لگا تو یہاں کی صنعتوں کو زوال ہوا۔ اس کے علاوہ چند معاشرتی اور سیاسی اثرات بھی تھے جن کی بدولت یہاں کی بہت سی دستی صنعتیں فنا ہوئیں اور کئی صناعوں نے زراعت کا پیشہ اختیار کیا۔

اس کی مثال ہماری ریاست حیدرآباد کے ضلع بیڑ کی چھاگل کی صنعت ہے۔ یہ صنعت آج سے کچھ کم دو سو سال قبل یہاں مروج تھی۔ اس صنعت کے ذریعہ بہت سے لوگ روزی حاصل کرتے تھے، لیکن آج اس کی حالت بالکل ناگفتہ بہ ہے۔ اب خاص بیڑ میں اس صنعت کے واقف کار صرف دو افراد ہیں، ایک کا نام وٹھوبا اور دوسرے کا نام راما ہے۔ ان کا یہ پیشہ اب ضمنی ہے اور یہ لوگ زراعت میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ ان کے پاس ایک یا دو چھاگلیں تیار رہتی ہیں۔ وہ بھی اس خیال سے کہ یہاں کی یہ صنعت مشہور ہے اور ممکن ہے کہ کوئی خواہشمند خرید لے۔

ان صناعوں میں سے ایک کو اولاد ہے دوسرا لاولد ہے۔ ان کے چند رشتہ دار ہیں جو بیڑ کے نزدیک کے دیہات میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی بیڑ کے ہفتہ واری بازار میں معمولی قسم کی چھاگلیں لاتے ہیں۔

مگر خاص طور پر چھاگلیں بنوائی جائیں تو اعلیٰ قسم کی بنائی جاتی ہیں۔ خوبی کے لحاظ سے ان کی قیمتیں ۴ روپیہ سے ۱۵ روپیہ تک ہوتی ہیں۔ چمڑا نہایت ہی ملائم کیا جاتا ہے۔ پھر اس چمڑے کی چھاگل بنائی جاتی ہے۔ چھاگل پر مختلف قسم کے عجیب و غریب نقش اتارے جاتے ہیں۔ اور ان نقشوں میں رنگین کاغذات لگائے جاتے ہیں۔ چمڑا گائے اور بیل کا لیا جاتا ہے۔ ایک جانور کی کھال مقامی بازار میں ۵ روپیہ سے ۱۰ روپیہ تک ملتی ہے اور اس میں غالباً دو یا تین چھاگلیں تیار کی جاتی ہیں۔ عموماً ایک چھاگل کا پانی موسم گرما میں دو آدمیوں کو ایک دن کے لئے کافی ہوتا ہے چھاگلوں کی زیادہ قیمت کی ایک وجہ ان کی قلت بھی ہونی چاہئے۔ کیونکہ ان لوگوں کو کبھی کبھی چھاگلیں بنانی پڑتی ہیں ظاہر ہے کہ اس میں وہ ذرا زیادہ قیمت وصول کر لیتے ہوں۔ ایک چھاگل تیار کرنے کے لئے دو دن درکار ہوتے ہیں ان کے پاس ملازمین نہیں ہوتے بلکہ یہ اپنی بیوی بچوں کی مدد سے چھاگلیں تیار کرتے ہیں۔

ان کی عمرانی زندگی سے ہمیں یہاں بحث نہیں لیکن وہ بھی غور طلب ہے۔ ان کی رہائش اچھوت ہونے کی وجہ سے آبادی کے باہر ڈھورواڑہ نامی محلہ میں ہے۔ یہ محلہ ان کی ذات کے نام سے ہی مشہور ہے۔ ان کے مکان کے سامنے سے ایک کچی سڑک گزرتی ہے لیکن وہاں نالیوں یا موریوں کا انتظام نہیں ہے سڑک کے کنارے جو موریاں ہیں ان میں غلاظت ہمیشہ جمع رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہاں سے کوئی شہری ناک بھوں چڑھائے بغیر نہیں گزرتا۔ یہ پڑھنا جانتے ہیں نہ لکھنا۔ ان کا لباس اس قدر پھٹا ہوا ہوتا ہے کہ اس میں سے ان کا آدھا جسم دکھائی دیتا ہے۔ جب ہم صنعت کے زوال پر غور کرتے ہیں تو ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی طلب آبادی کے صرف ایک محدود حصہ سے ہے۔

یعنی یہ چمڑے کی بنی ہوئی ہونے سے ہندو لوگ مذہبی نقطۂ نظر سے اس کا پانی پینا جائز نہیں سمجھتے ۔ اس وجہ سے اس کی طلب کم ہوئی ۔ لیکن یہ بھی اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ پہلے بھی ہندو مسلمان یہ دو فرقے تھے ۔ پہلے یہ صنعت انہیں معاشرتی حالات میں عروج پر تھی ۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زوال کی محض یہی ایک وجہ نہیں ہے ۔ بلکہ بڑی وجہ یہ ہے کہ آج کل جدید قسم کے گاگلٹ ملتے ہیں جو بڑے چھوٹے ہوتے ہیں اس وجہ سے ایک سے دوسری جگہ لے جانے میں آسانی ہوتی ہے اور وہ سستے بھی ہوتے ہیں ۔ اس وجہ سے ان کی طلب بڑھی اور چھاگلیں پیچھے رہ گئیں ۔ اس کے باوجود بھی صنعت باقی رہتی اگر عہدہ داران مقامی اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاتے بالخصوص پولیس کے ملازمین سے ان لوگوں کو اس بارے میں خوب نقصان پہنچا ۔ پہلے ہی ان کی صنعت کمزور اور کچھ مقامی بازاروں میں بکتی تھیں لیکن اس حالت میں ان ملازمین نے ہر سال موسم گرما میں کئی چھاگلیں مفت لینی شروع کیں ۔ اس وجہ سے انہیں نقصان ہوا اور انھوں نے اس میں اپنی خیریت دیکھی کہ اس پیشہ ہی کو چھوڑ دیا جائے ۔

انہیں وجوہات کی بنا پر وہ لوگ زراعت میں منتقل ہوگئے اور ملک کی ایک صنعت مٹ گئی ۔ اب اس کو ترقی دیجا سکتی ہے لیکن وہ بہت گراں بار ثابت ہوگی ۔ اگر ان لوگوں کو حکومت بغیر سود کے قرضہ دے یا انہیں مزدوروں کی حیثیت سے چھاگلیں بنانے کے لئے نوکر رکھے ' اور اس کی نکاسی اپنے ذمہ لے تو یہ صنعت پھر زندہ ہوسکتی ہے ۔ اب چونکہ اس صنعت کی زیادہ طلب نہیں ہے اور اس میں کام کرنا نفع بخش نہیں ہے اس لئے اس پیشہ میں زیادہ لوگ نہیں ہیں ۔ لیکن اگر اس میں فائدہ کی امید ہو تو اب بھی کم از کم ۳۰ ، ۴۰ لوگ اس پیشہ میں شریک ہوں گے اس کی نکاسی شہروں کے بجائے بڑے بڑے دیہاتوں میں ہوگی ۔ اس صنعت کی تحقیق سے مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اب اس میں تازہ روح پھونکنا مشکل ہے لیکن پھر یہ خیال آیا کہ اس صنعت کے زوال کے اسباب پر نظر ڈالنے سے اور اس کی طرف آپ لوگوں کی توجہ مبذول کرنے سے ممکن ہے ملک کی دوسری صنعتیں جو اسی راہ پر لگی ہیں فنا ہونے سے بچ جائیں کیونکہ اب بھی میں بعض سرکاری ملازمین کو دیکھتا ہوں کہ وہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو اپنی ہی ذاتی ملک سمجھتے ہیں ۔ اور کسی چپراسی یا دفعہ دار کو صناعوں کے مکان پر بھیج کر ایک دو چیزیں بے تکلفی سے منگوا لیتے ہیں ۔ یہ بات ایک شخص کے لئے ایک وقت کیلئے معمولی ہے لیکن بعض اوقات یہی معمولی بات مہلک ثابت ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے لوگ بیروزگار ہوجاتے ہیں ۔

اب ہم بیڑ کی دوسری صنعت پر غور کرینگے ۔ اس صنعت کا نام گپتی کی صنعت ہے ۔ اس کو وجود میں آئے ہوئے کوئی پچاس سال ہوتے ہیں ۔ آپ میں سے اگر کسی نے بیڑ کی بنی ہوئی گپتی دیکھی ہوگی تو اس پر ضرور آپ نے جان محمد کا نام انگریزی میں یا اردو میں لکھا ہوا پڑھا ہوگا ۔ یہ شخص شروع میں تلواریں بناتا تھا لیکن نہ معلوم اسے کیا سمجھائی دیا کہ اس نے تلوار بنانا چھوڑ کر گپتیاں بنانی شروع کیں ۔ اب یہ شخص زندہ نہیں ہے اس کا بیٹا شیخ احمد نامی موجود ہے جس کی عمر اب (۶۰) سال کی ہے اور جس کا ایک بیٹا اور دو نواسے ہیں جو اس کے ہاں یہی کام کرتے ہیں عموماً ان کے ہاں تین چار نوکر رکھے جاتے ہیں ۔ اور ضرورت کے لحاظ سے ان نوکروں میں اضافہ بھی کیا جاتا ہے ۔ اس طرح اس صنعت میں کوئی (۸) اشخاص ہمیشہ لگے ہوتے ہیں ۔

گپتی بنانے کے لئے بیر اور ساگوان کی لکڑی استعمال کی جاتی ہے ۔ اس میں سے بیر کی لکڑی تو بیڑ ہی میں ملتی ہے لیکن ساگوان کی لکڑی احمد نگر اور بمبئی سے منگاتے ہیں یا وہاں بھی کسی دوکان سے خریدتے ہیں ۔ گپتی کے لئے فولاد کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی بمبئی

سے منگایا جاتا ہے۔ گپتیاں اس قدر بہترین بنائی جاتی ہیں کہ اس کی جلد شناخت نہیں ہوتی کہ آیا یہ لکڑی ہے یا تلوار۔ جیبی بھی بنائے جاتے ہیں۔ لکھنے کے قلم میں فولاد کا تیتہ بٹھایا جاتا ہے گویا لکھنے کا قلم ہی گپتی ہے۔ اسی طرح یہ چاقو بھی بناتے ہیں۔ گپتیوں پر بارہ سنگھے، چاندی، لکڑی اور جرمن سلور کے دستے بنائے جاتے ہیں۔ ان دستوں پر مختلف نقش و نگار اور تصاویر کھینچی جاتی ہیں۔ اور خریدار کا نام بھی خواہش کرنے پر کھودا جاتا ہے۔ گپتی کی اصیل تلواری اور فولادی اس طرح دو قسمیں ہیں۔ اصیل تلواری درجۂ اول ۲۵ روپیوں میں اور درجۂ دوم ۲۰ روپیوں میں بکتی ہیں۔ فولادی گپتی درجۂ اول (۱۵) روپیہ میں اور درجۂ دوم (۱۲) روپیہ میں فروخت ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ معمولی گپتیاں ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، روپیوں میں خوبی کے لحاظ سے بیچی جاتی ہیں۔ ایک شخص ایک گپتی دو دن میں مکمل تیار کر سکتا ہے۔

ان لوگوں کو مختلف نمائشوں میں تمغے ملے ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد میں جو نمائشیں ہوئیں ان میں ان کو تمغے ملے ہیں۔ نواب نعمت یار جنگ بہادر، صوبہ دار اورنگ آباد اور بعض تعلقداروں نے بھی تمغے دیئے ہیں۔ اور اصل میں پہلے ایسے ہی عہدہ دار ہمت افزائی کر کے صنعتوں کو باقی رکھتے تھے۔ ان لوگوں کا پیشہ محض گپتی سازی ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اپنی صنعت کی تشہیر نہیں کرتے۔ جو لوگ بیڑ کے رہنے والے ہیں یا جو ملازمین بیڑ سے تبادلہ ہو کر دوسرے اضلاع میں جاتے ہیں ان کے ذریعہ سے اس صنعت کی تشہیر ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی طرح یہ صنعت کسی قدر مشہور ہوئی اور اب ان کے پاس اورنگ آباد، ناندیڑ، پربھنی، ورنگل، نظام آباد، گلبرگہ سے گپتیوں کے لئے آرڈر آتے ہیں۔ موجودہ کساد بازاری کا اثر ان پر بھی پڑا ہے۔ پانچ سات سال پہلے ان کی خالص آمدنی ۱۵۰، ۲۰۰ روپیہ تھی لیکن اب ۱۰۰، ۱۲۵ روپیہ ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ پانچ سات سال پہلے ان کے دو نواسے کام نہیں کرتے تھے۔ ان لڑکوں کو مڈل تک تعلیم دی گئی ہے۔ انہوں نے برٹش انڈیا میں اس صنعت کی تجارت کرنے کی اجازت حاصل کی تھی لیکن پھر انہیں منع کیا گیا۔ آجکل فیشن کے لحاظ سے لوگ لکڑی ہاتھ میں پکڑتے نہیں اس وجہ سے گپتی کی خرید بھی کم ہوئی ہے۔

اگر حکومت ان صناعوں میں سے ایک کو صنعت و حرفت کے مدرسہ میں ملازم رکھے تو کئی لوگ اس فن سے واقف ہو جائینگے شیخ احمد ۱۰۰ روپیہ ماہانہ کی تنخواہ پر آنے کے لئے راضی ہے۔ یہ مطالبہ میرے خیال میں ضرورت سے زیادہ ہے۔ میں نے اس سے اپنا شبہ ظاہر کیا تو اس نے جواب دیا کہ لوگ ملتے بھی نہیں ہیں۔ اگر حکومت رکھے تو ہیں کو رکھے ان کے پاس سرمایہ نہ ہونے سے یہ ترقی نہیں کر سکتے اگر انہیں سرمایہ بہم پہنچایا جائے تو یہ مشین کا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک مشکل یہ پیش آتی ہے کہ مذہبی خیالات کے لحاظ سے یہ لوگ بغیر سود کے قرضہ چاہتے ہیں۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لئے حکومت یہ کر سکتی ہے کہ محکمۂ پولیس میں کرچ اور بائونٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر محکمۂ پولیس کرچ اور بائونٹ انہیں کے پاس سے خریدے اور انہیں کچھ مراعات دے یا پہلے کچھ قیمت ادا کرے تو ان کو سرمایہ ملیگا اور مشین استعمال کر سکیں گے۔ اب وہ اپنے ہاتھ سے روغن تیار کرتے ہیں۔ اگر گپتیاں کثیر مقدار میں بنائی جائیں اور انکی کھپت بھی ہو تو یہاں روغن کی صنعت بھی ترقی کر سکتی ہے۔ اس صنعت کی عمر ابھی چھوٹی ہے۔ اس لحاظ سے ابھی اس میں ترقی کی گنجایش ہے۔ اس کے لئے انہیں اصل مہیا کرنا چاہئے اور صنعت کی تشہیر اور نکاسی کا بندوبست کرنا

چاہئے۔ آج کل تشہیر نہ ہونے پر بھی ان کو ۱۵۰' ۲۰۰ روپیہ ماہانہ ملتے ہیں اگر ان کا اشتہار کیا جائے تو اس کساد بازاری کے زمانہ میں بھی زیادہ آمدنی ہوگی اور ساتھ ہی ملک کی ایک صنعت ترقی کرے گی جس میں ابھی بہت سے مزدوروں کی کھپت ہو سکتی ہے۔ (ایک عثمانیہ)

# حسین ساگر

## ایک غمگین صبح

اپنے عالی حوصلہ شاہوں کے گن گاتی ہوئی
اٹھ رہی ہے سطح سے ہر موج لہراتی ہوئی

ہر ادا میں شان ہے "شاہوں کے استقبال" کی
ساحل ماضی سے ٹکراتی ہیں موجیں حال کی

بس گئی دنیا، اجڑتی تھی ابھی اجڑی نہ تھی
بات یوں اس کی بنی جیسے کبھی بگڑی نہ تھی

اس کے سینے میں تمنا کی تپش باقی رہی
مادی رونق میں روحانی کشش باقی رہی

اس کی موجوں کو نظر سے چومتا تھا آسماں
اب بھی خاموشی سناتی ہے وہ خونیں داستاں

قافلہ گذرا تھا جب اس پر سے تاناشاہ کا
اس نے گذرانا تھا تحفہ نالۂ جاں کاہ کا

بے کسی میں اپنے شہ کی دے دیا جو بھی تھا پاس
اس کے پانی نے بجھائی تھی خدا بندے[ع] کی پیاس

داغ دل بن کر قطب شاہوں کے ہیں نقش قدم
سوکھنے پاتا نہیں اس کا کبھی دامان نم

سیر کرنے والے ان رنگینیوں میں کھو نہ جا
حال کے جلووں میں یوں ماضی سے غافل ہو نہ جا

قہقہوں کی گونج میں پوشیدہ آہوں کو نہ بھول
ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے قطب شاہوں کو نہ بھول

رو رہا ہے آسماں یہ شبنم افشانی نہیں
اشک کا سیل رواں ہے دیکھ یہ پانی نہیں

میکش

ع تاناشاہ کا اکلوتا فرزند

# دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا

اردو مثنوی، اور اصناف کی طرح اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے اس کی مقبولیت، اس کی خصوصیات اور اس کے لوازم مختلف زمانوں میں کچھ نہ کچھ بدلتی رہیں۔ اس کا پورا سرمایہ کم و بیش سو سال کی پیداوار پر حاوی ہے۔

مثنوی کو دوسرے اصناف کے مقابلہ میں ممیز دیکھنے کی بعض وقت ضرورت اور خواہش اس وجہ سے داعی ہوتی ہے کہ یہ صنف چند معین خیالات کے اظہار کا آلہ رہی ہے چنانچہ اس کی اصطلاحی آسانیوں کی وجہ سے ابتدا میں صوفیائے کرام نے اس کو ذریعہ بنایا تھا۔ بعد میں جب یہ زیادہ ادبی بن گئی تو قصے کے ساتھ اس کا پیوند لگا۔ اس کے بعد ایک زمانہ اس پر ایسا بھی آیا کہ یہ کسی قدر کم طویل قصوں یا مرقع کی نظموں کی صورت میں فروغ پاتی رہی۔ موجودہ زمانہ میں یہ صنف، ظاہری شکل و صورت اور معنوی ہر اعتبار سے بہت کچھ بدل گئی ہے۔

اس طرح اردو مثنوی کی پوری ارتقائی رفتار کو ہم چند منازل میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ مثلاً (۱) ابتدائی عہد کے مثنوی پارے، جو زیادہ تر صوفیائے کرام کے رشحات پر مشتمل ہیں۔ یہ موجودہ رسم الخط میں لکھی ہوئی ایسی بھاشا کے نمونے ہیں جن میں عربی اور فارسی کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ ان کی بحریں عموماً برج کی ہیں اور یہ منتشر رہا۔ یہ ساتویں صدی ہجری کے نصف آخر سے لے کر دسویں صدی ہجری کے زمانہ پر حاوی ہیں۔ دوسرا دور، ابتدائی مکمل اور طویل مثنویوں کا ہے اس میں پنجاب، گجرات اور بیجاپور کے ابتدائی دور کے چند کارنامے شامل ہیں۔ اور یہ تقریباً سب کے سب ارشاد و ہدایت اور تصوف و عرفان کے حامل ہیں ان میں قابل ذکر گجرات کے حضرت خوب محمد چشتی کی مثنوی "خوب ترنگ" اور بیجاپور کے ایک نہایت مقدس بزرگ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق اور ان کے خاندان کے ملفوظات ہیں، جو نظم اور نثر دونوں پر مشتمل ہیں۔ اسی دور میں اردو مثنوی کا حقیقی ڈول ڈالا گیا۔ اور اس کے آخری زمانے کا تعلق دکن اور خاص طور پر بیجاپور سے ہے۔

دکن میں مثنوی کا ارتقا ڈھائی سو سال سے زیادہ مدت پر حاوی ہے۔ حضرت شاہ میراں جی کی وفات ٩٠٢ھ میں ہوئی آپ کے زمانہ سے لیکر ١١٦٠ھ، یعنے حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کی مثنوی "بوستان خیال" کی تحریر تک، مثنوی کو مسلسل اور خاطر خواہ ترقی ہوتی رہی۔

اس ڈھائی سو سال کے طویل عرصہ کی پیداوار کو ہم کم سے کم تین عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا عنوان عہد زرین کی مثنویاں۔ دوسرا عنوان عہد مغلیہ کی مثنویاں اور تیسرا عنوان، آصفجاہی عہد کی دکنی مثنویاں ہو سکتی ہے۔ اس طرح پہلا عنوان، اردو مثنوی کے ارتقا کا گویا تیسرا باب ہوگا۔ اور دوسرا اور تیسرا عنوان، بہ ترتیب، چوتھا اور پانچواں باب۔

حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق، کی ولادت مکہ معظمہ میں ہوئی تھی۔ آپ اوائل عمر میں ہندوستان تشریف لائے اور بیجاپور کو اپنا مستقر بنایا۔ آپ کے علم و فضل، تقدس اور سیرت کے اثرات نے، ارادت مندوں کا ایک بڑا گروہ آپ کے اطراف جمع کر دیا تھا۔ چونکہ ان میں سے اکثر عربی زبان سے ناواقف اور فارسی سے بھی کچھ زیادہ مانوس نہیں تھے اس لئے، آپ نے خود ان کی زبان سیکھی اور اسی میں ارشاد و ہدایت فرمائی۔ یہ ملفوظات آپ کے مریدین اور معتقدین نے عوام کے فائدے کی خاطر لکھ لئے۔ اس وقت اسی طرح

کے کئی مخطوطے دستیاب ہوتے ہیں، جو اسی قریبی زمانے کے لکھے ہوئے ہیں ۔ اور نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہیں۔

نظموں میں آپ کی مثنویاں "خوش نامہ" اور "خوش نغز" کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں شامل ہیں۔ ان کے اقتباسات، موجودہ زمانے کی اکثر ایسی کتابوں میں شایع ہو چکے ہیں، جو اس دور سے متعلق ہیں۔

حضرت شاہ میراں جی کے فرزند، حضرت شاہ برہان الدین جانم بھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ آپ کے ملفوظات میں "سکھ سہیلا" "منفعت الایمان" اور "ارشاد نامہ" وغیرہ اب منظر عام پر آچکے ہیں۔ اسی طرح حضرت شاہ برہان الدین جانم کے فرزند حضرت شاہ امین الدین اعلےٰ کے ملفوظات میں بھی کئی نظمیں اور کسی قدر طویل مثنویاں شامل ہیں۔ ان میں "رموز السالکین" "نظم وجودیہ" "نظم قربیہ" "محب نامہ" قابل ذکر ہیں۔ اس خاندان کے ارشادات تمامتر مذہبی اور صوفیانہ خیالات پر مشتمل ہیں۔

اسی طرح کے اور بھی نظم و نثر کے رسالے موجود ہیں، جو صوفیائے کرام کے ملفوظات پر مشتمل ہیں۔ یہ رسالے زیادہ تر بیجاپور کے ابتدائی چار حکمرانوں کے عہد سے متعلق ہیں۔

دکن کی ادبی تاریخ بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ) اور گولکنڈے کے محمد قلی قطب شاہ (۹۸۹ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے عہد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان دونوں سلاطین کی سرپرستی میں، ادبی ذوق کی ترقی شروع ہوئی اور بلند پایہ شعرا نشو و نما پانے لگے۔ ان میں محمد قلی کے درباری شاعر، وجہی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جس کی مثنوی "قطب مشتری" (۱۰۱۹ھ) عمدہ شاعری کا نامہ ہے۔ وجہی کے بعد اس فن کو سب سے زیادہ ترقی، عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد کے مشہور ملک الشعرا شاعر غواصی نے دی۔ غواصی کی دو مثنویاں "سیف الملوک و بدیع الجمال" (۱۰۳۵ھ) اور "طوطی نامہ" (۱۰۴۹ھ) قدیم اردو کے ترقی یافتہ اور بسیط شعری کارنامے ہیں۔ اس نے اردو مثنوی کو جس معیار تک پہنچا دیا تھا، وہ بعد کے شعرا کے لئے نمونہ بن گیا۔

مقیمی جو اسی عہد کا شاعر ہے اور بیجاپور کے ابتدائی ادبی مثنوی نگاروں میں سے ہے، اپنے آپ کو غواصی کا خوشہ چین بتلاتا ہے۔ اس کی مثنوی "چندر بدن و مہیار" جو ۱۰۵۰ھ سے قبل لکھی گئی ہے، ادبی اعتبار سے زیادہ اہمیت تو نہیں رکھتی، لیکن اس کا قصہ عرب کے، لیلےٰ مجنوں کے قصے کی طرح بے حد مشہور رہے۔

مقیمی کے زمانے سے مثنوی لکھنے کا طریقہ بیجاپور میں عام ہوگیا۔ اب مذہبی مثنویوں کے بجائے ادبی مثنویاں لکھی جانے لگیں۔ چنانچہ امین جو مقیمی ہی کا معاصر اور ہم وطن تھا، اس نے اشترے فارسی کے ایک قصے کا ترجمہ "بہرام و حسن بانو" کے نام سے کیا۔ لیکن اس کی تکمیل وہ نہ کر سکا۔ اور بعد کے ایک بیجاپوری شاعر دولت نے ۱۰۸۰ھ میں اس کی تکمیل کی۔

مقیمی تک زیادہ تر اردو مثنویوں کا مواد یا تو طبعزاد ہوتا تھا یا برج بھاشا سے ماخوذ صرف محمد قلی کے زمانے کے ایک شاعر، احمد نے فارسی سے استفادہ کر کے "لیلیٰ مجنوں" لکھی تھی۔ لیکن "بہرام و حسن بانو" کے بعد سے جو مثنویاں اردو میں لکھی جانے لگیں ان میں زیادہ تر فارسی مثنویوں سے استفادہ کیا گیا۔ چنانچہ اس زمانے میں محمد عادل شاہ کے دربار کے ایک شاعر صنعتی نے ۱۰۵۵ھ میں حضرت تمیم انصاری صحابی رسول کی حیات کے ایک قصے "قصۂ بے نظیر" کا ترجمہ کیا۔ اور اس کے دوسرے سال اسی کے ہم وطن شاعر، ملک خوشنود نے "ہشت بہشت" کو

اُردو نظم کا جامہ پہنایا۔ [illegible] میں بیجاپور ہی کے ایک اور شاعر کمال خان رستمی نے ابن حسام کے مشہور فارسی رزمیہ "خاور نامہ" کو نظم کیا۔ یہ اُردو کی پہلی قابلِ ذکر رزمیہ مثنوی ہے۔ نہ صرف اس لحاظ سے، بلکہ بیان اور زورِ قلم کے اعتبار سے بھی یہ کارنامہ قابلِ قدر ہے۔

"خاور نامہ" کے بعد، جو مثنوی لکھی گئی وہ گولکنڈے کے شاعر، جنیدی کی "ماہ پیکر" ([illegible]) ہے لیکن اس کا مخطوطہ نایاب ہے۔ اس کا ذکر مختلف حوالوں کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس کے دو سال بعد گولکنڈے کا ایک اور شہ کار لکھا گیا یہ ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" ہے جو اس میں شک نہیں کہ ایک فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے لیکن آزاد ترجمہ چنانچہ اس میں جگہ جگہ، ماحول اور عہد کے اثرات نمایاں ہیں۔ غواصی کے بعد یہ دوسرا بڑا اور اسی کی ٹکر کا شاعر تھا جس نے مثنوی کے معیار کو، اسلوب اور تخیل کی حد تک بلند کیا۔ بعد کے شاعروں نے، غواصی کی طرح اس کے کارنامے کو نمونہ بنایا چنانچہ ہنر قرینہ مشرقی، کی مثنوی "تنبیہ دہن" ([illegible]) میں اس کے ثبوت ملتے ہیں۔

بیجاپور میں علی عادل شاہ ثانی کے عہد تک اردو شاعری کا ذوق خاطر خواہ ترقی کر چکا تھا۔ چنانچہ خود اس کے دربار نے ملک الشعرا نصرتی جیسے زبردست سخن پردازوں کی پرورش کی۔ نصرتی بیجاپور کے لازوال شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی دو مثنویوں میں ایک "گلشنِ عشق" جو [illegible] میں لکھی گئی، ہندوستان کے مشہور قصے "منوہر و مدمالتی" کی عشقیہ داستان ہے۔ اس کی دوسری مثنوی "علی نامہ" رزمیہ اور تاریخی مثنوی ہے۔ اس میں علی عادل شاہ اور مرہٹوں کی جنگوں کے حالات نہایت تفصیل سے پیش کئے گئے ہیں۔ لفظیات کے اعتبار سے "علی نامہ" کی وسعت کو اردو کے بہت کم کارنامے پہنچ سکتے ہیں۔ نصرتی کے اسلوب میں ادبیت اور لطف بھی موجود ہے۔ وہ جنگوں کے نقشے نہایت عمدگی سے اور حقیقی پیش کر سکتا تھا۔ "علی نامہ" کی تکمیل [illegible] میں ہوئی۔

اس عہد کی آخری، مثنویوں کے ذکر سے پہلے گولکنڈے کی ایک مثنوی "بہرام و گل اندام" کا تذکرہ ضروری ہے جو [illegible] میں لکھی گئی۔ یہ بہت زیادہ اہم کارنامہ نہیں ہے تاہم غواصی اور ابن نشاطی کے دبستان کی تمام خوبیوں اور خصوصیات کا حامل ہے۔

دوسری مثنوی "ظفر نامہ نظام شاہ" ایک رزمیہ ہے جو تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں رام راجہ سے دکن کی دوسری سلطنتوں کی جو جنگ ہوئی تھی، اس کا شاعرانہ حال درج ہے۔ اس کا مصنف حسن شوقی، بلند پایہ شاعر تھا۔ جس کو پہلے، نظام شاہی دربار ( احمد نگر ) سے توسل رہا۔ پھر وہ بیجاپور آیا۔ آخر میں محمد قطب شاہ کے زمانے میں گولکنڈہ آگیا تھا۔ اس کی ایک اور مثنوی "میزبانی نامہ" بھی ہے۔

نصرتی کے بعد، سوائے ہاشمی کے بیجاپور میں ایسے بلند پایہ شاعر کم پیدا ہوئے، جن کے کارنامے دیرپا دلچسپی کے حامل ہوں۔ صرف شاہ ملک کا ذکر اس کی ضخیم مذہبی مثنوی "شریعت نامہ" کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ یہ مثنوی [illegible] میں لکھی گئی تھی۔ ہاشمی، وسیع دلچسپیوں کا انسان تھا۔ عادل شاہی سلطنت کے زوال کی وجہ سے زمانہ بھی بدل چکا تھا اس لئے اس نے اپنی شاعری میں، عام راستے سے تجاوز کیا اور اس دور میں دکن کی آخری مثنویاں زیادہ تر گولکنڈے میں لکھی گئیں۔ چنانچہ امین، غلام علی، فائز اور لطیف، جن کی تصنیفات [illegible] سے لے کر [illegible] کے زمانہ پر حاوی ہیں، اسی گولکنڈے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

امین، حضرت عمر کے فرزند ابو شحمہ کے متعلق ایک فرضی قصے کا مصنف ہے، جو [illegible] میں لکھا گیا ہے۔ اس کے ایک سال بعد

غلام علی نے "پدماوت" کے حصے کو منظوم کیا۔ اس کا ماخذ فارسی سے زیادہ ہندی قصہ تھا۔ فائز "رضوان شاہ روح افزا" (سنہ ۱۰۹۴ھ) کا مصنف ہے۔۔۔۔۔ طیف نے ایک رزمیہ مثنوی لکھی ہے جو "ظفر نامہ" کے نام سے موسوم ہے اس میں "خاور نامہ" کا زور بیان اور "علی نامہ" کا لطف موجود نہیں ہے۔

سنہ ۱۱۰۰ھ کے قریب دو ڈھائی سال کے اندر اندر بیجاپور اور گولکنڈے کے ادبی اور علمی مرکزوں کا خاتمہ ہوگیا۔ وہ علما اور خاص طور پر اردو زبان کے شاعر جو عادل شاہی او قطب شاہی سلاطین کی سرپرستی میں اپنے ذوق کی تکمیل میں منہمک تھے منتشر ہونے لگے۔ کیونکہ ان سلاطین کے جانشین یعنی مغلیہ امرا کو اردو شاعری کا چسکا ابھی نہیں لگا تھا۔ شہنشاہی احساس کے ساتھ فطرتاً وہ شہنشاہی دربار کی ادبی روایات اپنے ساتھ لائے تھے۔ تاہم اردو شاعروں کے قدم اکھڑنے تو اس سرزمین میں فارسی شعرا کے قدم بھی نہ جم سکے۔ اور شعرا ہی نے دکن کے اگلے ادبی ذوق کو جاری رکھا۔ لیکن یہ خود منتشر ہوگئے، ان کی شعری پیداوار کی یکسانیت منتشر ہوگئی۔

چنانچہ دکن میں مغلوں کے تسلط کے بعد، جو کارنامے ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ بڑی حد تک ان کے پیدا کرنے والوں کی ذہنی حالت کا عکس پیش کرتے ہیں۔ اس زمانے کی شعری پیداوار کو ہم اس طرح تقسیم کرسکتے ہیں۔ (۱) مرثیے (۲) مذہبی نظمیں (۳) متصوفانہ نظمیں، (۴) نیم مذہبی نظمیں۔

دکن کے شعرا نے مرثیہ کے لئے متنوع شعری صنفوں کا استعمال کیا ہے۔ لیکن اس طرز کا زیادہ کلام قافیہ کی ترتیب میں قصیدے کی شکل رکھتا ہے، اس لئے یہ ہمارے دائرہ سے باہر ہے۔ دوسری قسم کی نظموں میں، ولی ویلوری کی "روضۃ الشہدا" ( ) ضعیفی کی "ہدایت ہندی" ذوقی کی "وصال العاشقین" جیسی طویل مذہبی نظمیں شامل ہیں۔ اس دور میں تیسری قسم کی نظمیں بہت زیادہ مقبول ہوئیں۔ ان میں سب سے پہلے قاضی محمود بحری کی "من لگن" کا ذکر ضروری ہے۔ بحری اصل میں بیجاپور کے رہنے والے تھے۔ بیجاپور کی تباہی کے بعد بہ حال تباہ گولکنڈہ پہنچے۔ دو سال بعد گولکنڈے کی سلطنت کا سایہ بھی سر سے جاتا رہا۔ "من لگن" تصوف کی قدیم نظموں میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ اور وجدی کی "پنچھی باچھا" جو "منطق الطیر" کا ترجمہ ہے، بہت پڑھی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ عشرتی کی متصوفانہ نظمیں "چت لگن" اور "دیپک پتنگ" بھی کافی مقبول تھیں۔

نیم مذہبی نظموں میں محمد علی عاجز کے قصے قابل ذکر ہیں۔ ان میں فقہ عقائد وغیرہ کے مسائل کو قصے کے پیرایہ میں بیان کیا جاتا تھا۔ ان قصوں کو بھی اپنے زمانہ میں کافی مقبولیت حاصل رہی۔

دکن میں مثنوی کی ترقی کا آخری زمانہ آصفجاہی سلطنت کے قیام کا ابتدائی دور ہے۔ یہ ایک عبوری زمانہ ہے، جس میں قدیم خیالات اور قدیم روایات کی کچھ تو شکست و ریخت ہوئی، اور کچھ نئی تعمیر شروع ہوئی۔ زبان اور اظہار خیال کے سانچوں کے لحاظ سے، اس دور سے بڑا انقلاب رونما ہونے لگا۔

اس دور کا سب سے بڑا شاعر، ولی ہے۔ جس نے اپنی شاعری میں نئے ماحول اور بدلے ہوئے مذاق کو سب سے زیادہ جگہ دی اس کے بعد، شعرا کو ان کے نقش قدم پر چلنا آسان ہوگیا۔ مثنوی کی حد تک ولی کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ انھوں نے صرف دو تین

چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں۔ ان میں سے دو بزرگوں کی تعریف میں ہیں۔ مگر ایک مثنوی جو تین سو بتیس شعر کی ہے، نہایت اہم ہے۔ اس مثنوی کا عنوان "مثنوی در تعریف سورت" ہے۔ یہ اگلی تمام مثنویوں کے مقابلہ میں جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔ اس وقت تک اردو میں مثنوی مرقع نگاری کے لئے استعمال نہیں ہوئی تھی۔ ابتدائی چھوٹی چھوٹی مثنویاں متصوفانہ تھیں۔ بعد میں وجہی کے زمانہ سے اس میں قصے لکھے گئے۔ کچھ رزمیہ مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ عربی شعرا اس نوع کے خیالات کے لئے "قصیدہ" کا استعمال کرتے تھے۔ فارسی شعرا نے بھی انہیں کی پیروی کی۔

ولی کے اثر سے، جب دہلی میں اردو شاعری کو فروغ ہوا تو ابتدائی زمانہ کے شعرا جیسے شاہ حاتم اور آبرو نے ولی کی اسی مثنوی کی پیروی کی۔ میر تقی میر کے سامنے یہ نمونے تھے۔ اس لئے ان کی وہ مثنویاں، جو فارسی کی تقلید میں نہیں لکھی گئی ہیں، اسی طرز کی ہیں۔ فارسی کی قصہ وار مثنویوں کے نمونے پر میر نے جو مثنویاں لکھیں وہ، ابتدائی نوعیت کی ہیں۔

ولی کے بعد دکن میں دونوں طرح کی مثنویاں رائج ہوگئیں۔ خود ان کے جانشین، حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی نے ایک طویل مثنوی "بوستان خیال" کے ساتھ ساتھ کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی لکھیں، جو متصوفانہ خیالات سے مملو ہیں۔ سراج کی طویل اور قصہ وار مثنوی "بوستان خیال" اس دبستان کی دکنی مثنویوں کا سب سے بہتر کارنامہ ہے، اور اردو کی تمام مثنویوں میں اس کا درجہ "سحر البیان" کے بعد ہے۔ انداز بیان، صداقت جذبات، تکمیل اور شعری خوبیوں کی بدولت "بوستان خیال" ہر زمانہ میں قدر کی نظر سے دیکھی جائیگی۔

"بوستان خیال" کے بعد، دکن میں مثنوی نگاری کے ذوق پر، تنزل طاری ہونے لگا تاہم اس آخری دور میں بھی دو تین مثنویاں ایسی لکھی گئیں، جن کی ادبی اہمیت کبھی کم نہیں ہو سکتی۔ ان میں سب سے پہلے قابل ذکر، لالہ لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی کی "تصویر جاناں" ہے۔ جو قصے کی ندرت اصلیت اور ادبی معیار کی بلندی کے باعث اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ دوسری "لعل و گوہر" ہے۔ جس کے مصنف عارف الدین خاں عاجز اورنگ آباد کے شعرا میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ مثنوی قدیم طرز کے فوق فطری قصوں سے کچھ زیادہ امتیاز نہیں رکھتی، لیکن عاجز کا انداز بیان صاف ستھرا اور موجودہ روزمرہ سے بہت قریب ہے چونکہ اس زمانے میں اورنگ آباد کو سیاسی مرکزیت حاصل تھی، اس لئے، یہاں اچھے اچھے شاعر جمع ہوگئے تھے۔ اور دکن کے دارالخلافہ کے حیدرآباد میں منتقل ہونے تک، اورنگ آباد ہی کو ادبی مرکزیت حاصل رہی۔ چنانچہ کئی سخن پرداز اکناف ہند سے آکر یہیں فروکش ہوگئے تھے۔ ان میں شاہ غلام قادر ساقی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ برہان پور سے آکر یہاں فروکش ہوئے تھے۔ یہ اچھے شاعر تھے اور ان کے اطراف شاگردوں کا ایک خاصہ مجمع تھا۔ یہ شفیق کے ہم عصر اور دوست تھے۔ شفیق نے اپنے تذکرے، "چمنستان شعرا" میں ان کی ایک مثنوی "شمشاد و صنوبر" کے اقتباسات دئے ہیں۔ یہ مثنوی خاصی ضخیم بتلائی جاتی ہے۔ لیکن اب تک اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مثنوی اچھی ہوگی۔

اس مضمون کے ختم کرنے سے پہلے ایک اور سخن سنج کا ذکر ضروری ہے، جو اپنے زمانے کے استاد شمار کئے جاتے تھے۔ یہ شیر محمد خاں ایمان، شاگرد حضرت شاہ تجلی ہیں۔ ایمان کا نشو و نما نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کے آخر عہد میں ہوا۔ یہ پرگو شاعر تھے۔ انہوں نے

کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی لکھی ہیں، جو پڑھنے اور لطف اندوز ہونے کے قابل ہیں۔

یہ آخری سخن سنج دراصل قدیم دبستان کے آخری شاعر تھے۔ اس کے بعد نئے عہد کے نئے تخیلات اور نئے روزمرہ کے اثرات نے قدیم دبستان کو متاثر کرنا شروع کیا۔ اور قدیم تخیلات پر بڑی شکست و ریخت طاری ہوئی اس دوران میں، دکن کی اردو شاعری پر پژمردگی سی چھائی رہی۔ یہاں تک موجودہ عہد سے پہلے، جب یہ شکست و ریخت مکمل ہو گئی، تعمیر جدید اردو شاعروں میں ایک نئی روح پھونک دی گئی۔

عبدالقادر سروری

# گوداوری گھاٹ کی ایک حسین صبح

شب تاریک چلی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی
صبح کے خوف سے ڈرتی ہوئی گھبراتی ہوئی

چور کی طرح دبے پاؤں چلی بادِ صبا
ہر قبائے گل نوخیز کو مسکاتی ہوئی

آئی گردوں سے دھندلکے میں عروسِ شبنم
موتیوں کو در و دیوار پہ بکھراتی ہوئی

جل بجھی شمع، ہوئی رات کی محفل خاموش
بزم تاروں کی چلی آنکھوں کو جھپکاتی ہوئی

اڑ چلی نکہتِ گل چھوڑ کے دامن گل کا
بادِ سبکسار چلی جھومتی اتراتی ہوئی

جلوہ گر صبح کی دیوی ہوئی رفتہ رفتہ
شب کا آنچل رخ پرنور سے سرکاتی ہوئی

دور تاریکی ہوئی گھاٹ کی تقدیر کھلی
ٹکڑیاں آئیں حسینوں کی ستم ڈھاتی ہوئی

نقرئی شانوں پہ بکھرائے ہوئے بال کوئی
قلزمِ حسن کی ہر لہر میں لہراتی ہوئی

ذرے ذرے کو تبسم سے بناتی رنگیں
بجلیاں چشم فسوں ساز سے برساتی ہوئی

کوئی انگڑائیاں لیتی ہوئی بدمستی میں
ساغرِ عشق سے مے حسن کی چھلکاتی ہوئی

اپنی گستاخ اداؤں سے الجھتی ہر دم
خود بہکتی ہوئی دنیا کو بھی بہکاتی ہوئی

کرنے اشنان کوئی کھول کے جوڑا آئی
کوئی ساحل پہ کھڑی رہ گئی شرماتی ہوئی

بھیگے کپڑوں میں جو عریاں ہوئے جسم حسین
بجلیاں جیسے چھپیں ابر میں گھبراتی ہوئی

کوئی کھولے ہوئے بالوں کو چلی ندی میں
نکلی پانی سے کوئی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی

چلی ہر ایک نہا دھو کے خراماں آخر
موتی اُن بھیگے ہوئے بالوں سے برساتی ہوئی

ہو گیا جلد ہی روپوش یہ رنگیں منظر
آنکھوں آنکھوں میں نظر رہ گئی للچاتی ہوئی

علی احمد

# اورنگ آباد کا سنہری محل

سنہری محل دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا جو بحمداللہ پورا ہوا۔ یہ عمارت اورنگ آباد کی قدیم عمارت سے ہے جو مقبرۂ رابعہ دورانی سے تقریباً ۲ فرلانگ کے فاصلے پر جانب غرب پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ اس عمارت کا محل وقوع نہایت ہی بلند اور مرتفع ہے اس کے اطراف کھلے میدان اور مشرق وشمال کی جانب پر فضا پہاڑی ہے مقبرہ اس عمارت کے بالکل مقابل میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہ عمارت آباد تھی اس کی دیواروں پر سونے کا ملمع کیا ہوا تھا یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ فی زمانہ اگر عمارت صحیح وسالم ہے لیکن دیواروں کے ملمع کا کہیں پتہ نہیں ہاں نقش ونگار کے کہیں کہیں نشان پائے جاتے ہیں۔ یہ محل دو منزلہ ہے۔ نیچے کے حصہ کی تفصیل یہ ہے۔ بیچ میں ایک ہال اس کے دونوں جانب دو دو کمرے ان کمروں کے بازو ایک ایک وسیع ہال۔ اوپر کی منزل نہایت شاندار ہے۔ بیچ میں ایک بہت بڑا ہال اس کے آگے پیش جس میں نہایت کشادہ اور خوشنما کنگرہ دار کمانیں نکلی ہوئیں پیش کے مقابل میں وسیع صحن بڑے ہال کے ہر دو جانب دو دو کمرے اور ہر ایک کمرے کے بازو کھلا ہوا صحن اور صحن کے کنارے پر حد کی دیوار سے لگا ہوا ایک ایک پختہ مسقف بیت الخلا۔ بالاخانہ کے عقبی حصہ میں بھی کشادہ صحن واقع ہے بالاخانے کے اوپر چاندنی ہے جس کے اطراف دیوار کھنچی ہوئی ہے۔ چاندنی پر چڑھنے کے بعد تمام شہر ہتھیلی میں نظر آتا ہے اور نظر ریلوے اسٹیشن سے پرے جنوبی پہاڑی سلسلے تک بلا روک ٹوک کام کرتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت کوسوں تک گرد و پیش کے وسیع رقبہ پر حکومت کر رہی ہے اس عمارت کے اطراف پختہ دیوار بنی ہوئی ہے جس میں کمانیں نکلی ہوئی ہیں اور دیوار کے اندر عمارت کے عقب و پیش نہایت وسیع مسطح وہموار صحن ہے علامات و آثار سے پایا جاتا ہے کہ اس صحن میں چمن بندی کی گئی ہوگی کیونکہ اس وسیع چبوترے پر جس پر عمارت قائم کی گئی ہے۔ ایک حوض بنا ہوا ہے جس میں سے پانی ایک چھوٹی سی نہر میں جاتا تھا اور پھر نہر میں سے پشت ماہی آبشار پر سے ڈھلکتا ہوا صحن کی روشوں میں پہنچتا تھا۔ حوض اور نہروں میں اب خاک اڑ رہی ہے اور چبوترے پر لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی ہے عمارت کے نیچے کا حصہ آج کل نہایت خراب حالت میں ہے اس کی اکثر کمانیں پتھروں سے چن دی گئی ہیں جس کی وجہ اندرونی حصہ کسی قدر تاریک ہے فرش پر کوڑے کرکٹ کی کوئی حد نہیں اس کے علاوہ جابجا مویشیوں کے گوبر کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں غالباً عدم نگرانی کی وجہ سے مویشی اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ بالاخانہ اب بھی ایسا ہے کہ وہاں کوئی بیٹھ جائے تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا لیکن افسوس متعدی ملیریا کی علامات سے سفید دیواریں سیاہ ہو گئی ہیں۔ آہ! بالاخانہ کچھ نہ پوچھیے کیا چیز ہے شاید ہی ایسا ہوا دار مقام کہیں ہو اطراف کا کشادہ منظر کوسوں تک نظر کے روبرو بازو میں پہاڑی کا سلسلہ گوناگوں دلفریبیوں سے معمور اپنے حسن کی آب و تاب کے ساتھ بے نقاب نظر آتی ہے انواع و اقسام کے مناظر کے اجتماع سے ایک عجیب و غریب منظر پیدا ہو گیا ہے غرضکہ منظر کی لطافتیں حد بیان سے باہر ہیں صرف وہی لوگ بخوبی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں جو بذاتہ اس کا لطف اٹھا چکے ہوں۔ اس عمارت کے استحکام کی یہ حالت ہے کہ اس کی گچ سیسہ کے اور اینٹ فولاد کے مماثل ہے یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے باد و باراں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر رہی ہے۔

اس عمارت کی ویرانی کو دیکھ کر اور بانیانِ عمارت کی عظمت گزشتہ کا خیال کر کے دل پر کچھ ایسا عالم طاری ہو گیا کہ یہ چند اشعار

بے اختیار قلم سے نکل پڑے۔

(۱)

ہے بہت خوشنما سنہری محل　　دلکشا پرفضا سنہری محل
مرتفع اور بلند ہے یہ قصر　　روبروئے نظر ہے سارا شہر
محلِ وقوع فرحت زا　　گرد حلقہ ہے اک پہاڑی کا
دی کوہِ قاف میں گویا　　یہ سنہری محل ہے پریوں کا

(۲)

خوبصورت وہ دامن کہسار　　اور اس میں وہ سایہ دار اشجار
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائے جاں پرور　　چاروں جانب کھلا ہوا منظر
ہر طرف اس کی حکم رانی ہے　　جو جگہ ہے یہاں سہانی ہے

(۳)

ہے مقابل میں مقبرہ[1] ایسا　　تعزیہ اک دھرا ہوا گویا
دیکھ کر مقبرے کی زیبائی　　ایک تشبیہ خوب یاد آئی
کیا ہی دلکش ہے خوش قرینہ ہے　　سبز زاروں میں اک نگینہ ہے
قصر زریں تیرا کیا کہنا　　عہد رفتہ کا ہے تو افسانا
قصر کیا ہے سرائے عبرت ہے　　دیکھو جس سمت جوش حسرت ہے
اب ہے ویران تھا کبھی آباد　　شان رفتہ ہے شوکت برباد
تازیانہ پئے تخیل ہے　　نقش بربادی تجمل ہے

(۵)

ہوگئی ہے یہ تیری حالت زار　　جا بجا سے جگر ہے تیرا فگار
اب کہاں وہ طلائی رنگ ترا　　اب نہ وہ آب و تاب ہے نہ ضیا
تھیں کبھی جو نگار دیواریں　　ہوگئیں دل فگار دیواریں
فرش جو مثل آئینہ تھا صاف　　جا بجا اس میں پڑ گئے ہیں شگاف

---

[1] مقبرۂ رابعہ درانی

کس مپرسی کی تیری حالت ہے — تیرا ویرانہ جائے عبرت ہے
حوض ہیں خشک صحن میں تیرے — خاک اڑتی ہے تجھ جہاں ایٹھے
روشیں ہیں وہ اب کہاں باقی — ہیں کہیں کچھ ابھی نشاں باقی

(۶)

کہہ رہے ہیں ترے در و دیوار — تھا کبھی تو بھی غیرت گلزار
کیا ہی ذی شان ہوں گے تیرے مکیں — صاحب اقتدار ذی تمکیں
پیش خدمت تھے جن کے جاہ و حشم — نصرتیں چومتی تھیں جن کے قدم
اب کہاں ہیں وہ مالک دولت — کیا ہوئی ان کی حشمت و ثروت
قصر جن کے تھے مثل قصر جناں — گھونسلے زاغ و بوم کے ہیں وہاں
گردش دہر نے کیا پامال! — وہ رہے اور نہ ان کا مال و منال
نہ رہا ان کا کر و فر باقی — یادگار ان کے ہیں کھنڈر باقی

(۷)

اے محل اے وہ یادگار کہن — اے وہ تصویر انقلاب زمن
جو تجھے دیکھنے کو آتا ہے — نقش عبرت وہ لے کے جاتا ہے

سید اللہ بخش توحید

---

مدراس میں اردو زبان اور ادب کی ترقی و اشاعت کا مسئلہ ہندوستان میں ہمہ گیر توجہ حاصل کر رہا ہے۔ کانگریس نے ہندوستانی کو وہاں کی سرکاری زبان بنانے کا تہیہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں ہندی کے رواج کے لئے بڑی کوشش کی جا رہی ہے ایسی صورت میں اردو کے بہی خواہوں کو اردو کی بھی فکر دامنگیر ہوگئی ہے اور ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح مدراس میں اردو زبان کی حالت اور اردو ادب کے نشو و نما کے بارے میں عام معلومات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے ادارۂ ادبیات اردو نے مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی سے یہ مبسوط کتاب لکھوائی ہے۔
اس میں گزشتہ ڈھائی صدیوں سے مدراس میں اردو کا جو کام کیا گیا ہے اس کا تفصیلی ذکر درج کیا ہے قیمت ۲ عـــہ
سب رس کتاب گھر یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے۔

# قاضی جی کی کارگزاری

سنہ ۱۳۹۹ء میں دیول رائے والئی بیجانگر فیروز شاہ بہمنی پر حملہ کرنے کی غرض سے ایک ٹڈی لشکر لے کر طوفان کی طرح اٹھا تاکہ مدگل اور رائچور وغیرہ کے قلعوں کو مسمار کرتا ہوا پائے تخت تک پہنچے اور تخت سلطنت کو الٹ کر شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔

دیول رائے شمالی سرحد کی طرف سے بڑھتا ہوا دریا کرشنا کے ساحل پر پہنچا اور وہیں ڈیرے ڈال دیئے فوراً راوٹیاں اور خیمے نصب کر دئے گئے، وہ کاہیں گاڑی گئیں اور یار لوگ جنگل میں منگل منانے لگے۔ یہ کیمپ تقریباً بارہ تیرہ میل تک پھیلا ہوا تھا، جس میں تیس ہزار سوار اور نوے ہزار پیادوں کا لشکر جرار بحر ناپیدا کنار کی طرح موجیں مار رہا تھا، ہر پیشہ کے لوگ اس میں موجود تھے، خرید و فروخت ہو رہی تھی، بازاروں میں چہل پہل تھی، شراب خانے کھلے ہوئے تھے، دور پر دور چل رہے تھے، ارباب نشاط طوائفیں اور کسبیاں نغمہ سرائی میں مصروف تھیں اور رقص و سرود سے محفلوں کو گرما رہی تھیں۔

اُدھر سلطان کو خبر پہنچی تو وہ فوراً بارہ ہزار سرفروش اور جاں نثار سپاہیوں کا لشکر اپنے ساتھ لے کر آندھی کی طرح اٹھا اور گلبرگہ سے کوچ کر کے کرشنا کے دوسرے ساحل پر جا پہنچا۔ برسات کا زمانہ تھا، سیلاب کے طوفان نے دریا کا پاٹ اس قدر چوڑا کر دیا تھا کہ پار اترنا مشکل نظر آیا۔ اس لئے حسب ایما شاہی وہیں سراپردہ نصب کر دیا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد سلطان نے اپنے ارکان دولت اور سپہ سالاروں کو مشورہ کرنے کی غرض سے طلب کیا، دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ہر شخص نے اپنی اپنی سمجھ کے موافق تدبیریں بتائیں لیکن سلطان کو تشفی نہیں ہوئی اور کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔ بہرحال نشست ختم و گفتگو برخاست کے بعد سلطان کو بہت زیادہ فکر دامنگیر ہو گئی۔

ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، اندھیری رات میں سنسان جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا اور گھوڑے سے لے کر سوار تک سانس نہیں لے رہا تھا، لیکن سلطان بدستور اسی غور و فکر میں غرق تھا کہ دریا کس طرح عبور کیا جائے اور غنیم کی فوج پر کس پہلو سے حملہ کیا جائے ــ ـــ ـــ

یکایک نظر اٹھائی تو دیکھا کہ سامنے کوئی بزرگ کھڑے ہوئے ہیں، چمکدار روشن آنکھیں، نورانی چہرہ، لانبی ستواں ناک، لمبی ڈاڑھی، دراز قد جسم پر سفید براق کپڑے، ادھر سلطان نے ذرا غور سے دیکھا، ادھر وہ بزرگ بھی سلام کرتے ہوئے آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ قاضی سراج[1] ہیں۔ سلطان نے تعجب سے پوچھا کہ اس وقت تم کدھر؟ دست بستہ عرض کی کہ پیر و مرشد، اس وقت لوگ خاموشی کے ساتھ جنگ کی تیاری میں مصروف ہیں مگر حضور کے چہرہ سے غور و فکر کے آثار نمایاں ہیں۔ اب حضور زیادہ تردد نہ فرمائیں، اس بہی خواہ دولت کو ایک تدبیر سوجھی ہے، اگر جان کی امان پاؤں تو حرف بمدعا زبان پر لاؤں اور ایک تدبیر بتاؤں۔ سلطان فیروز عام طور پر علما، فضلا اور اپنے ارکانِ دولت سے نہایت بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ باتیں کرتا تھا، قاضی جی کی گفتگو سن کر مسکرایا اور کہا کہ قاضی صاحب! اللہ اللہ کرو، بھلا تم کو جنگ سے کیا واسطہ، کیوں خواہ مخواہ اس جھگڑے میں پڑتے ہو، تم تو اپنے خیمہ میں بیٹھے ہوئے اللہ اللہ کرو اور فتح فیروزی کی دعائیں مانگتے رہو۔

---

[1] قاضی سراج بادشاہی امیروں میں سے ایک نامی عہدہ دار اور امیران صدہ کا ایک نامی فرد تھا (فرشتہ)

قاضی جی بھلا کہاں چوکنے والے تھے، دست بستہ عرض کی کہ خداوند نعمت، فتح و فیروزی کی دعا تو ہر وقت زبان پر رہے گی خواہ میں خیمہ میں رہوں یا میدان جنگ میں مگر عرض یہ ہے کہ قاضی سمجھ کر میرا نام بہادروں کی صف سے خارج نہ فرمائیے۔ باپ دادا سے فن سپہ گری ورثہ میں چلا آرہا ہے اس لئے میں اہل قلم سے ہی نہیں ہوں بلکہ اہل سیف بھی ہوں۔

سلطان نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو اپنی تدبیر بھی کہہ ڈالو۔ قاضی جی نے کہا کہ حضور تدبیر یہ ہے کہ میں نے دریا پار اترنے کے لئے چند چمڑے کے ٹوکرے اور لکڑی کی کشتیاں تیار کر لی ہیں۔ اس وقت غنیم کی فوج غافل ہے۔ اگر حکم ہو تو تھوڑی سی فوج لے کر جاؤں اور شب خون ماروں۔ سلطان نے کہا کہ قاضی صاحب آپ نے ٹوکروں اور کشتیوں کی تدبیر تو بہت ہی اچھی بتائی مگر شب خون مارنے کی تدبیر مجھے پسند نہیں آئی، اس لئے کہ میں فتح کو حیلہ سے حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ پھر غنیم کی فوج ایک لاکھ تیس ہزار ہے اور ہماری صرف بارہ ہزار۔ اگر یہاں سے آپ چار سو یا پانچ سو آدمی لے کر بھی نکل گئے تو کیا فائدہ ہے۔ غنیم کی فوج تو دس بارہ میل تک پھیلی پڑی ہے، شب خون کسی طرح پورا نہیں پڑیگا۔

قاضی جی کی طبیعت ان معاملات میں بلا کی رسا واقع ہوئی تھی۔ فرمایا مثل مشہور ہے کہ "الحرب خدعۃ" بس ہمیں بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ چار پانچ سو آدمی تو ان کے لئے کافی سے زیادہ ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو یہی لوگ ان کو خرگوشوں کی طرح جھاڑیوں میں بھگا بھگا کر مار ڈالیں گے۔ ہاں اگر کسی مصلحت کی بنا پر پیر و مرشد اس کے خلاف ہیں تو اتنی اجازت مرحمت فرمائی جائے کہ میں اپنے ساتھ چند بھروسے کے آدمی لے کر دریا کو عبور کروں اور خفیہ طور پر غنیم کے لشکر میں پہنچ کر راجہ یا اس کے بیٹے کا کام تمام کر دوں۔ اس عرصہ میں ہماری فوج بھی ٹوکروں اور کشتیوں سے دریا کے اس پار اتر آئے۔ جب شور بلند ہو تو فوراً ہمارے لشکری دشمن پر گریں اور اس کے پرخچے اڑا دیں۔

بادشاہ قاضی جی کی یہ تدبیر سن کر مسکرایا اور خاموش ہو گیا مگر قاضی جی پارے کی طرح بے قرار تھے، بادشاہ کے سکوت کو "السکوت کالرضا" سمجھے فوراً سلطان سے رخصت ہو کر کیمپ پہنچے اور سات جوان مرد اپنے ساتھ لئے، جو آٹھوں گانٹھ کمیت تھے، اور فقیروں کا بھیس کر کے چل کھڑے ہوئے۔ صبح ہوتے ہوتے غنیم کے کیمپ میں جا پہنچے، تھوڑی دیر تک ادھر ادھر ٹامک ٹوئیے مارتے رہے، جب کہیں دال گلتی نظر نہ آئی تو ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر آپس میں کھچڑی پکانی شروع کر دی۔ قاضی جی نے ذرا مراقبہ کیا۔ ہزاروں عیاریاں اور چالاکیاں ہاتھ باندھے ہوئے سامنے حاضر ہو گئیں، پھر کیا تھا، فوراً ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور ساتھیوں کو بشارت دی کہ ایک ترکیب سوجھی ہے اب انشاء اللہ فتح ہی فتح ہے۔ ساتھیوں نے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ تو فرمایا کہ راجہ کی فوج کے ساتھ، ارباب نشاط، طوائفیں اور کسبیوں کے طائفے بھی موجود ہیں، بس ہمیں وہیں چلنا چاہئے، روپیہ میں سولہ آنہ امید ہے کہ وہاں پہنچ کر ضرور کامیابی کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ ساتھیوں نے پھر پوچھا کہ آخر وہاں جا کر کیا کیجئے گا؟ تو قاضی جی نے فرمایا کہ تمہیں کیا معلوم کہ فقیر جھولی میں کیا ڈالتا ہے اور کیا نکالتا ہے۔ بس تم لوگ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور جو کچھ میں کہوں اس پر بے چون و چرا عمل کئے جاؤ۔ القصہ سب نے مل کر کسبیوں اور طوائفوں کے کیمپ کی طرف دھاوا بول دیا۔ قاضی صاحب شاہ صاحب کا بھیس بدلے خضر راہ بنے ہوئے آگے آگے تھے اور ان کے چیلے اور مرید اپنے مرشد کے پیچھے قدم بقدم چل رہے تھے، اول خرابات میں جا پہنچے اور وہیں دھونی رما دی، دو چار روز کے بعد یہ درویشوں کی ٹولی کسبیوں کے کیمپ میں پہنچی اور ان کا نہایت تفصیل کے ساتھ بھید لینا شروع کر دیا۔ ایک مقام پر دیکھا کہ ایک طوائف، نہایت طرحدار، حسین، مہ جبین، نوکیلی چھبیلی، کنگھی چوٹی سے درست، [illegible]

سے آراستہ و پیراستہ، شمع محفل بنی بیٹھی ہے۔

اس وقت قاضی جی کو سات خون معاف تھے، اسے دیکھتے ہی رال ٹپک پڑی، کانوں تک باچھیں کھل گئیں، دل سینہ میں بانسوں اچھلنے لگا، ڈورے ڈالنے کے لئے پروانہ وار آگے بڑھے اور اس کے سامنے بیٹھ کر وہ وہ باتیں بنائیں کہ رہے نام سائیں کا۔

اس موقع پر قاضی جی نے اپنے آپ کو پرلے نمبر کا عاشق مزاج، دل پھینک اور رنگیلا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ سو جان سے قربان ہو رہے تھے، جو کچھ روپیہ پیسہ اپنے ساتھ لائے تھے بے دریغ اس پر سے نثار کرنا شروع کر دیا، وہ وہ باتیں بنائیں، وہ وہ رنگ جمائے کہ طوائف بھی ان پر ریجھ گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ مجھ پر لٹو ہے۔ رات بھر خوش مذاقی اور ظرافت کی آتشبازی چھوٹتی رہی۔ تمام رنڈیاں اور ڈوم ڈھاڑی قاضی جی سے چپٹے ہوئے تھے اور قاضی جی اپنی مضحکہ خیز حرکتوں اور پرلطف باتوں سے اس محفل کو خوب گرما رہے تھے۔ اس وقت بقول انشاء اللہ خاں، قاضی جی کی یہ کیفیت تھی کہ۔

شب محفل میں جو ماہ وش آزاد ۔ بزدوں نے لپٹ کر
ڈاڑھی کو دیا اس کی لگا بند تھلونا ۔ اور بیٹھنے لگی گت
تب ہنس کے کہنے لگے تک پر بولنا چھو ۔ رکھ ناک پہ انگلی
اور آنے جی آنے سے برا مانے سو بھڑوا ۔ ہے موسم عشرت

دو چار روز اسی طرح گزرے، اتفاقاً ایک روز رات کے وقت قاضی جی کی معشوقہ راج کنور کے دربار میں مجرے کے لئے طلب کی گئی اور وہ جانے کیلئے تیاری کرنے لگی، قاضی جی کو جیسے ہی یہ پتہ لگا، بس مچل گئے، فوراً آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور لگے تم سے جانے پھر یہ جی نہیں بے تاب ہو کر پروانہ وار اس کے گرد پھرنے لگے اور قدموں پر گر کر عرض کرنے لگے کہ جدائی کی گھڑیاں مجھ سے نہیں کٹ سکیں گی، خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو یا تو تم وہاں نہ جاؤ یا مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ طوائف نے کہا کہ قاضی جی کیا عقل ماری گئی ہے، اپنے ہوش کے ناخن لو۔ ہم تو راجہ کے نوکر ٹھیرے، پھر بڑی بات یہ کہ خود کنور جی نے طلب فرما کر ہماری عزت افزائی فرمائی ہے ایسی صورت میں، بھلا میں حکم عدولی کیسے کر سکتی ہوں اور اپنے ساتھ راج سبھا میں تمہیں کیسے لے جا سکتی ہوں۔ اس لئے کہ وہاں تو صرف وہی شخص جا سکتا ہے جو گانے بجانے اور ناچ رنگ میں مشاق ہو۔

قاضی جی نے جواب دیا کہ اے جانِ جہاں! کیا تم نے اوروں کی طرح مجھ کو بھی نرا کٹھ ملا سمجھ لیا ہے، رام کی دیا سے میں بھی گانے بجانے سے اچھی طرح واقف ہوں، اس کے علاوہ وہ وہ کمالات جانتا ہوں کہ راجہ صاحب بھی دیکھ لیں تو بھونچکا ہو کر رہ جائیں۔ طوائف نے خیال کیا شاید وہ ان کی لے رہا ہے، مسکرائی، اور اپنا ستار ان کی طرف کھسکا کر کہا کہ لیجئے ذرا اس کو تو چھیڑ لیجئے۔ قاضی جی نے فوراً ستار ہاتھ میں لے، پردوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا، پھر جوڑ اور باج کے تاروں کو ٹٹولا اور طربوں کے سُر ملا کر وہ استادی سے بجایا، وہ وہ گت سازی اور مینڈ کاری کے کمالات دکھلائے کہ طوائفیں اور کسبیاں تو رہیں ایک طرف ان کے سازندے بھی اس کو دنگ رہ گئے۔ اب تو ان کی معشوقہ کا ماتھا ٹھنکا، سوچی کہ اس کا ساتھ رکھنا تو باعث فخر و عزت ہے، ناچ گانے سے بھی خوب واقف ہے، باتیں بھی خوب بنا لیتا ہے

بہت ممکن ہے کہ اس کے طفیل سے ہم پر بھی ہن برسنے لگے، نورا سب کو طائفہ میں شریک کر لیا اور انہیں اپنے ساتھ لئے راج کنور کے دربار میں جا پہنچی۔

محفل کیا کچھ بھری ہوئی تھی، دیول رائے کا سپوت اور اس کے احباب آپس میں ہنس بول رہے تھے، شراب کا دور چل رہا تھا۔ اس طائفہ کے پہنچتے ہی گانا شروع ہو گیا، طبلہ پر تھاپ پڑی، سارنگی ریں گئی، منجیرے بجنے لگے۔ طائفہ کی سریلی آواز اور گھنگرو کی چھم چھم سے محفل کا رنگ ہی بدل گیا، دیر تک محفل رقص و سرود گرم ہو رہی۔ گانا ختم ہوا تو نقالوں کی باری آئی۔ قاضی جی فوراً ایک ساتھی کو لئے کر اکھاڑے میں کود پڑے۔ یہ دونوں زنانہ لباس پہنے، سرمہ، مسّی اور زیور سے سہاگن بنے، ناز و غمزے کرتے، مٹکتے تھرکتے، تھالیاں بجاتے اور کمر مٹکاتے ہوئے بس مضحکہ خیز انداز میں راج کنور کے سامنے آئے کہ اہل محفل ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ پھر ان بہروپیے نقالوں نے، تمسخر، طرب سازی، اور گت بازی میں، وہ وہ کمالات بتائے کہ راج کنور اور پوری محفل عش عش کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد قاضی جی نے اپنی غیر معمولی چلت پھرت اور دلفریب ترت کے ساتھ رقص شروع کر دیا۔ لے میں ڈوبا ہوا ساز، سروں میں ڈوبی ہوئی آواز اور وقتیہ راگ راگنی کے سوز و گداز نے محفل پر جادو سا کر دیا۔ ہر شخص بت بنا ہوا ان کو ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہا تھا، اسی اثنا میں دونوں نے کمر سے خنجر کھینچ، بھاؤ بتانے شروع کر دئے اور نہایت سبک روی کے ساتھ وہ وہ جوڑ توڑ دکھائے اور وہ وہ ہاتھ اور پینترے نکالے کہ بھری محفل وجد کرنے لگی۔

آخرکار پاؤں کے کاٹتے اور پینترے بدلتے ہوئے دونوں کے دونوں راج کنور کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے، پھر لپک کر اس کے سینے و شکم میں دونوں نے بیک وقت ایسے کاری خنجر بھونکے کہ وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ اور تماشائی نشہ میں چور اور مست و مخمور تھے۔ جو لڑکھڑاتے ہوئے باہر بھاگے انہیں قاضی جی کے ان ساتھیوں نے سنبھالا جو باہر کھڑے ہوئے تال دے رہے تھے جو بھاگ نہ سکے وہ وہیں کے ہو کے رہ گئے۔

اب قاضی جی اور ان کے ساتھیوں نے کیمپ کے چراغ گل کرنے شروع کر دئے۔ پھر کیا تھا۔ چراغ گل، پگڑی غائب، لشکری حیران و پریشان، اصل واقعہ سے بے خبر، سمجھے کہ سلطان کے لشکر نے شب خون مارا ہے۔ شراب کا نشہ، کچی نیند اور رات کی تاریکی میں ایک دوسرے پر پل پڑے، ہر طرف صدائے دار و گیر بلند ہو گئی۔ ادھر قاضی جی نے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دینے کی غرض سے سلطان کی طرف روانہ کر دیا اور خود کسی گوشۂ عافیت میں سر چھپا کر بیٹھ گئے۔

دیو رائے نے یہ کیفیت دیکھی تو ہوش پراں ہو گئے، بس اندھیرے منہ اپنے لڑکے کی لاش لے کر بغیر لڑے بھڑے بیجانگر روانہ ہو گیا۔ دوسرے روز جب مشرق کا شہسوار ستاروں کی فوج کو شکست دے کر شعاع کا نیزہ ہاتھ میں لئے نکلا، فیروز شاہ سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق، جسم پر زرہ بکتر اور چار آئینہ، سر پر خود فولادی، کمر میں شمشیر اصفہانی، پشت پر سپر، کندھے پر کمان، کمند ابریشمی شکار بند میں آویزاں، عربی گھوڑے پر سوار اپنی فوج ظفر موج کو لئے ہوئے آ پہنچا۔ نقارے پر چوٹ پڑی کہ دل سینوں میں دہل گئے، "اللہ اکبر"، "اللہ اکبر" کے نعروں سے دشت و ہامون گونج اٹھا۔ بہادروں نے بڑھ کر حملہ کیا، پھر کیا تھا، تلوار روح

تلواریں اور نیزوں سے نیزے اژدہوں کی طرح زبانیں نکالے ہوئے ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ تیروں کی دھواں دھار بارش سے آسمان پر ایک ابر سا چھا گیا۔ جس میں برچھیوں کی شانیں اور بھالوں کی انیاں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر بجلیاں گرا رہی تھیں۔ بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی، ستم کا رن پڑا۔ جدھر دیکھو کشتوں کے پشتے لگے تھے، خون کا سیلاب بہہ رہا تھا، کوئی سسک رہا تھا کوئی ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور کوئی رقصِ بسمل کر رہا تھا۔ غرض یہ کہ قاضی جی کے ناچ نے سب کو ننگی کا ناچ نچا دیا تھا۔

بارہ ہزار بہادروں نے وہ جی توڑ کر حملہ کیا کہ ایک دھاوے میں پینسٹھ ہزار سے زیادہ کا کھیت کر دیا جو باقی رہے ان کے پاؤں اکھڑے اور ایسے اکھڑے کہ پھر نہ جمے۔ یار لوگ عجیب عجیب طرح بھاگ رہے تھے، کوئی بے تحاشا بھاگا، کوئی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا، کوئی نوک دم بھاگا اور کوئی دم دبائے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ پیادوں کو ہوش نہ تھا کہ ہاتھ میں تلوار ہے یا میان کا ٹکڑا، سوار کو خبر نہ تھی کہ وہ گھوڑے پر سیدھا سوار ہے یا الٹا۔ فتحیابوں نے کئی کوس تک ان کا پیچھا کیا بلکہ ان کے گھر تک پہنچا کر واپس آئے۔ راستہ میں زخمیوں کی کمریں اور مردوں کی ہمیانیاں کھول کھول کر اپنے کیسے خوب ٹھونس ٹھونس کر بھرے اور اس قدر زر، جواہر، مال و دولت ہاتھ آیا کہ جس کا حد و حساب نہیں۔

گھوڑوں کی ٹاپوں سے میدانِ جنگ میں جو غبار اٹھا، قضا نے ہاتھ بڑھا کر نیزے کی انی سے اس پر فیروز شاہ کا نام لکھ دیا۔

الغرض راجہ کو ایسی شکست فاش ہوئی کہ اس کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ سلطان فیروز شاہ اپنے لشکر کے ساتھ کامیابی کے جھنڈے اڑاتا ہوا اور فتح و فیروزی کے نقارے بجاتا ہوا اپنے دارالسلطنت واپس ہوا۔ اس خدمت کے صلہ میں قاضی سراج خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوئے اور گروہ امراء میں داخل ہو کر چین کی بنسی بجاتے رہے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

---

# باغِ دکن

یہیں بہار کا پہلے پہل بنا ہے چمن — عجیب خطۂ دلکش ہے خاکِ پاکِ دکن
نگاہِ شوق کو کیا کیا سماں دکھاتا ہے — انوکھی شان زمانہ کو یہ بتاتا ہے
نمونۂ کرم و لطف کردگار ہے یہ — یہ باغِ علم ہے گہوارۂ بہار ہے یہ
گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب — لطیف و سرد ہوا پاک صاف چشمۂ آب
کمی نہیں ہے کسی شئے کی اس گلستاں میں — عجب بہار ہے کچھ اس کے سرو و ریحاں میں
طلسمِ حسن کا خاکِ دکن ہے گلدستہ — بہم کھڑے ہیں شجر اور کوہ صف بستہ
مسافر آکے جو اس جا قیام کرتے ہیں — مناظر اس کے انہیں جلد رام کرتے ہیں
بلندیوں سے جو ہو مائل نشیب نظر — فریب دیتا ہے تالاب کا حسین منظر
وہ دیکھو دور سے پانی ہے یوں نظر آتا — سفید سانپ چلا جائے جیسے بل کھاتا

اقبال الدین احمد
سابق ایڈیٹر کامریڈ و ادبی دنیا

# دکن کے نسوانی ادارے

عہدِ عثمانی میں جہاں ملک اور ابنائے ملک کی ہر جہتی فلاح و بہبود کی خاطر سیکڑوں اصلاحیں عمل میں آئی ہیں وہاں طبقۂ نسواں کی تعلیم و تربیت اور اصلاحِ حال کے لئے بھی ہمارے بیدار مغز سلطان العلوم کی علم پرور حکومت نے اپنی امکانی کوشش کی ہیں اور مسلسل کئے جا رہی ہے۔

تعلیم نسواں کے سلسلہ میں جو تجاویز عمل میں آئی ہیں اور جو اقدامات کئے گئے ہیں ان کی اہمیت اور وقعت دوسری تجاویز سے کہیں زیادہ ہے! تعلیم نسواں کی اہمیت مردوں کی تعلیم سے بہت زیادہ ہے، اسی پر قوم کے ارتقا کا دارومدار ہے، ہماری آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت ان کی اخلاقی اصلاح اور ان کی بہتری کے لئے عورت کا صحیح تعلیم و تربیت یافتہ ہونا ازبس ضروری ہے، عورت نہ صرف مرد کا بلکہ ہماری قوم کا "نصف بہتر" ہے، اس کو جاہل اور تعلیم و تربیت سے محروم رکھکر ہم کبھی اشاہراہِ ترقی پر گامزن نہیں ہو سکتے۔

عہدِ عثمانی میں تعلیم نسواں نے ترقی کے جو مدارج طے کئے ہیں اور خواتین دکن نے اصلاح معاشرت و تمدن کی جو کوشش کی ہے ان کا اجمالاً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۳۲۰ف میں جبکہ موجودہ فرمان روائے دکن نے زمام سلطنت اپنے دست مبارک میں لی صرف (۹۱) مدارس نسواں ممالک محروسہ سرکار عالی میں قائم تھے جن میں (۶۴۴۹) لڑکیاں زیر تعلیم تھیں ۱۳۵۱ف کے اعداد و شمار سے تعلیم نسواں کی ترقی کی رفتار اس طرح واضح ہوتی ہے کہ نسوانی درس گاہوں کی تعداد (۷۴۰) ہو گئی جن میں ساڑھے چوبیس ہزار لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں، ان مدارس میں ۶۹۹ تحتانیہ ہیں جن میں (۲۶۱۰۶) طالبات شریک ہیں، مدارس وسطانیہ سولہ ہیں جنکی طالبات کی تعداد ۲۴۰۰ ہے۔ مدارس فوقانیہ نو ہیں ان میں ۲۹۲۳ لڑکیاں ہیں۔ تعلیم نسواں پر معتدبہ رقم جو ہر سال صرف ہو رہی ہے اس کا ایک معمولی سا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف ۱۳۴۲ف میں ہماری علم دوست اور فیاض حکومت نے کوئی ساڑھے نو لاکھ روپے اس طبقہ کی تعلیم پر صرف کئے ہیں۔

ذیل میں چند سرکاری، امدادی و خانگی نسوانی مدارس اور خواتین کے اصلاحی و معاشرتی اداروں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ہم یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ عہدِ عثمانی میں تعلیم و تمدنِ نسواں نے ترقی کی منزلیں کس حسن و خوبی سے طے کی ہیں اور خواتینِ دکن میں تحصیل علم اور اصلاح معاشرت کے جذبات کس حد تک کارفرما ہیں۔

## نامپلی زنانہ اسکول

مدرسۂ فوقانیہ نسواں نامپلی کا قیام ۱۳۰۸ف میں عمل میں آیا، اس وقت اسکول میں صرف سولہ لڑکیاں شریک تھیں رفتارِ ترقی تقریباً ناپید تھی مگر سلطان العلوم کے تحت دکن پر متمکن ہوتے ہی ایک عظیم تغیر رونما ہوا، طالبات کی تعداد بتدریج بڑھنا شروع ہوئی چنانچہ اس وقت اس میں ۶۹۱ لڑکیاں ہیں تعلیم کے علاوہ لڑکیوں کو امورِ خانہ داری، دستکاری، معذوری، سلائی، اور پکوان کی بھی باضابطہ صحیح اصول پر عملی تعلیم دیجاتی ہے۔

## کلیۂ اناث

تعلیم نسواں کا معیار بلند کرنے اور طبقۂ نسواں کو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور کرنیکے لئے ۱۳۳۳ف میں کلیہ اناث کا قیام عمل میں آیا اس کالج کے ابتدائی اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم پانیوالی طالبات کی تعداد

نصف درجن سے زیادہ نہیں تھی، اسٹاف صرف ایک پرنسپل اور ایک پروفیسر پر مشتمل تھا اور اب کوئی ایک درجن خاتون پروفیسر ساٹھ ستر لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے زینے طے کرا رہی ہیں۔

## وظایف تعلیمی

کلیۂ اناث کی کامیاب طالبات کو انکی مخصوص اور امتیازی کامیابیوں کے مدنظر ہماری علم پرور حکومت سے ممالک غیر میں تکمیل تعلیم کے لئے وظائف عطا کئے جاتے ہیں اور اکثر خواتین باہر جاکر امتیازی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ خدمات پر اسی کالج میں مامور ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس وقت ایسی کئی خواتین کالج کی خدمات پروفیسری کو انجام دیتی ہیں۔

## محبوبیہ زنانہ اسکول

یہ اسکول ۱۳۱۶ف سے قائم ہے، اس میں سینیر کیمبرج تک تعلیم دیجاتی ہے۔ یہاں زیادہ تر امراء اور معزز طبقہ کی لڑکیاں شریک ہیں یہاں کی اکثر طالبات سینیر کیمبرج کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے کلیہ اناث میں داخل ہوجاتی ہیں، اسمیں طالبات کی تعداد ۱۳۴۶ف کے آخر میں (۴۰۹) تھی۔ اس اسکول میں کمسن لڑکے بھی داخل ہوسکتے ہیں، علاوہ تعلیم کے دستکاری، مصوری، موسیقی، خانہ داری، سلائی اور پکوان کی بھی عملی تعلیم دیجاتی ہے، سادہ معاشرت کا عادی بنانے کیلئے ان میں سادگی پیدا کرانے اور لڑکیوں کو کفایت شعار بنانے کے لئے اس اسکول کی دوراندیش اور تجربہ کار پرنسپل طالبات کو سادہ لباس استعمال کرنے اور زیورات کو ترک کرنیکی ترغیب و ہدایت دیتی رہتی ہیں، اسکول کی عمارت میں چند سال پہلے کافی توسیع کی گئی ہے۔ اس اسکول میں بھی ہر قسم کے میدانی کھیل ڈرل اور جمناسٹک کا اچھا انتظام ہے۔

## مدارس تعلیم المعلمات

یہ مدارس خصوصیاً معلمات کو طرز تعلیم سے واقف کرانے کے لئے قائم کئے گئے ہیں ان میں علاوہ (۱۰۴) طالبات کے (۹۰) معلمات بھی مصروف طرز تعلیم و تدریس ہیں، ان کو طرز تعلیم کے جدید طریقوں سے واقف کرایا جاتا ہے۔

## ماڈل پرائمری اسکول

یہ اسکول ۱۳۴۴ف میں قائم کیا گیا ہے اس میں مخلوط اشاف چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم کے لئے تیار کرتا ہے یہاں باغبانی بھی سکھائی جاتی ہے۔

## گرل گائیڈ

کوئی آٹھ سال سے "گرل گائیڈ" کی تحریک جاری ہے، اس تحریک کے بنیادی اصول انسانوں اور جانوروں کے ساتھ ہمدردی ایک دوسرے کی تائید، زخمیوں کی فوری امداد، تیمارداری اور خود اعتمادی ہیں۔ اس تحریک میں کلیۂ اناث، مدرسۂ نسواں نامپلی، محبوبیہ زنانہ اسکول اور تعلیم نسوان کے بعض دوسرے ادارے بھی شریک ہیں کھلی فضا میں سیر و تفریح کے مواقع اور معاشرتی پارٹیاں لڑکیوں کے لئے ترقی و دلچسپیوں کا باعث ہوئے ہیں۔

## انجمن ترقی تعلیم و تمدن نسواں

تعلیم نسواں کی ترقی اور اعلیٰ تعلیم کی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ خواتین دکن کی معاشرت، تمدن اور ذہنیت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور صحیح تربیت یافتہ خواتین علم کی خوبیوں سے واقف ہونیکے بعد اپنی ان بہنوں کو جنہیں حصول تعلیم کے ذرایع میسر نہیں علم کی برکات سے واقف کرانے اور روشن خیال بنانیکی پوری کوشش کر رہی ہیں۔ اسی خیال کے تحت یہ انجمن ۱۹۲۲ء میں قائم کیگئی ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ سماجی اور معاشرتی اصلاحات کا تبلیغی کام بھی یہ انجمن بہ احسن وجوہ انجام دے رہی ہے۔ اس انجمن کی صدر محترمہ بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ اور نائب صدر مشہور پارسی خاتون مسز رستم جی فریدون جی ہیں، ان دونوں روشن خیال اور ملک و قوم کا درد رکھنے والی معزز خواتین کی سرپرستی میں یہ انجمن خوب پروان چڑھ رہی ہے، اشاعت تعلیم، اصلاح معاشرت و رسم و رواج کے مختلف اصول اور طریقے اس انجمن کے پیش نظر ہیں، یہ انجمن متعدد

زنانہ مدارس کی امداد اور نگرانی کرتی ہے، غریب اور شوقین لڑکیوں کو وظائف تعلیمی بھی اس انجمن سے دئے جاتے ہیں۔ اس انجمن کے تحت پانچ مدارس قائم ہیں، ان میں تقریباً چار سو بچوں کو مفت ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔

**دارالاقامہ** | اس انجمن کی سرپرستی میں ایک دارالاقامہ شہر کے وسط میں قائم کیا گیا ہے، اس میں باہر سے آئی ہوئی خواتین بلالحاظ مذہب و ملت قیام کر سکتی ہیں، یہ اقامت خانہ خاص طور پر ان غریب خواتین کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے جو دایہ گری اور تیمارداری کی عملی تعلیم شفاخانوں میں حاصل کرتی ہیں اور ختم تعلیم پر مختلف دواخانوں اور ہسپتالوں میں ملازم ہوتی ہیں۔

**دارالمباحثہ** | اس انجمن کے زیر سایہ ایک دارالمباحثہ بھی قائم ہے۔ اس میں تعلیم یافتہ خواتین تقریری مقابلے کرتی ہیں۔ اس قسم کے تقریری مقابلوں سے خواتین میں علمی ذوق پیدا کرنے کے علاوہ تقریر کرنے کی قابلیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس سال دارالمباحثہ کی جانب سے ایک پرجوش مناظرہ اردو میں ہوا۔ اس جلسہ میں باتفاق آراء یہ طے ہوا کہ ہندوستان میں بچوں کی پرورش کا موجودہ طریقہ ناقابل اطمینان ہے۔

**ذیلی کمیٹیاں** | اس انجمن کی کئی ذیلی کمیٹیاں ہیں جو خواتین کے حقوق کی حفاظت، کمسنی کے ازدواج کی مخالفت، عورتوں اور بچوں کی جسمانی اور اخلاقی بہتری کے لئے مناسب تجاویز عمل میں لاتی ہیں۔ تقریروں کے ذریعہ اس انجمن کی اراکین اپنی بہنوں کو ان کے حقوق اور فرائض سے آگاہ کرتی ہیں اور ان کو اپنی صحت و تندرستی کی جانب بطور خاص متوجہ کرتی ہیں۔ ایک کمیٹی عورتوں کی قانونی دشواریوں پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ اس سال ہر کمیٹی کا ایک عام جلسہ ہوا جس میں کئی اداروں کی مسلم خواتین شریک ہوئیں۔ اس جلسہ میں وہ "نکاح نامہ" پیش کیا گیا جسکو مسز حامد علی خاں نائب صدر کل ہند خواتین کی کانفرنس نے مرتب کیا ہے۔ یہ نکاح نامہ ایک اقرارنامہ کی شکل میں ہے جس میں مسلم خواتین کو تحت قانون شرع طلاق کا حق دیا گیا ہے۔ بجملہ شریک جلسہ خواتین نے باتفاق آراء اس نکاح نامہ کو منظور کیا۔

اس انجمن کو کل ہند خواتین کی کانفرنس کی مستقل کمیٹی نے حیدرآباد کی خواتین کی نمایندہ انجمن تسلیم کر لیا ہے۔ اس انجمن سے دس نمایندے سالانہ کل ہند کانفرنس کے جلسوں میں بھیجے جاتے ہیں اور کانفرنس کی مستقل کمیٹی میں اس انجمن کی ایک رکن حیدرآباد کے نمایندے کی حیثیت سے شریک رہتی ہے۔

**دی گرلز اسکول کوآپریٹیو بلڈنگ سوسائٹی لمیٹڈ** | مسز رستم جی کی صدارت میں محدود ذمہ داریوں کی ایک سوسائٹی زنانہ مدارس کی عمارتوں کی تعمیر کے لئے [illegible] ف میں قائم کی گئی ہے۔ اس سوسائٹی کا مقصد عمدہ ہوادار عمارتیں غریب لڑکیوں کے مدارس کیلئے مختلف مقامات پر تعمیر کرانا ہے۔ چنانچہ ایک ایسی ہی عمارت خیریت آباد میں تعمیر کی گئی ہے اس میں ایک اسکول قائم ہے۔

**زنانہ کلب** | گزشتہ چند سال کے اندر حیدرآباد اور سکندرآباد میں خواتین کے کئی کلب قائم ہوگئے ہیں۔ ان کے لئے نہایت کشادہ اور شاندار عمارتیں تیار کی گئی ہیں۔ پردہ کے پورے انتظام کے ساتھ کلب کی اراکین مختلف قسم کے کھیل و تفریحات سے مستفید ہو رہی ہیں۔ کھیل اور تفریح کے علاوہ تقاریر کے ذریعہ دماغی اور اخلاقی ترقی بھی ہو رہی ہے۔

**لیڈیز اسوسی ایشن کلب** | اس کلب کی بنا کسی زمانہ میں مسز حیدر جنگ مرحومہ نے ڈالی تھی۔ اس وقت یہ کلب نہایت اعلیٰ پیمانہ پر قائم ہے، اس کی صدر لیڈی حیدری ہیں، جن کی نگرانی میں اس کی شاندار اور خوبصورت عمارت تیار ہوئی۔ اس کلب کے اراکین کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ ہے۔ اس کلب کی جانب سے ہر سال دو طلائی میڈل ان طالبات کو عطا کئے جاتے ہیں جو انگریزی اور اردو کے مضامین میں امتیازی کامیابیاں حاصل کرتی ہیں۔ غریب لڑکیوں کو تعلیمی وظائف بھی دئے جاتے ہیں۔ اس کلب کی اراکین مختلف تفریحات اور میدانی کھیلوں کے علاوہ تقریری مقابلوں میں بھی شریک ہوتی ہیں۔

**لیڈیز ریکریشن کلب** | گزشتہ چند سال سے یہ کلب قائم ہے، اس کی صدر رانی شام راج راجونت بہادر ہیں۔ اس کے اراکین کی تعداد تقریباً دو سو ہے۔ میدانی

کھیلوں اور دوسری تفریحات کے علاوہ اس میں ایک تیرنے کا تالاب بھی ہے۔ جس میں خواتین تیراکی کا شوق بھی پورا کرتی ہیں۔

متذکرہ صدر اداروں کے علاوہ خواتین کی اور کئی انجمنیں بھی ہیں مثلاً انجمن خواتین دکن، انجمن خواتین اسلام، انجمن خواتین کی انجمن، گجراتی خواتین کی انجمن، عیسائی خواتین کی انجمن، بہبودیٔ اطفال کے متعدد مراکز وغیرہ۔

**انجمن خواتین دکن** | خواتین کی انجمنوں میں اس انجمن کو امتیاز حاصل ہے۔ یہ انجمن ۱۳۳۳ھ ہجری میں مسز صغرا ہمایون مرزا کی صدارت میں قائم ہوئی۔ اس انجمن کی سرپرست رانی شام راج راجونت بہادر ہیں۔ اس انجمن کے مقاصد میں ہر مذہب و ملت کی غریب و شریف خواتین کی مدد کرنا، غریب لڑکیوں کی شادی میں امداد دینا، بیوہ عورتوں اور نادار لڑکیوں کو دستکاری سکھانا، معذور عورتوں کو ماہانہ امداد وظائف کی شکل میں دینا، ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینا، فضول رسم و رواج کو ترک کرانا ہے۔

اس انجمن کی کامیابیاں زیادہ تر محترمہ صغرا ہمایون مرزا کی عالی ہمتی و ایثار کی مرہون منت ہیں۔ اس انجمن نے اب تک کئی کارنامے نمایاں کئے ہیں۔ تقریباً بیس معذور، بیوہ اور دکھیا عورتوں کو ماہانہ امداد دی جاتی ہے۔ اس انجمن کی زیر نگرانی زنانہ صنعت و حرفت کا ایک مدرسہ قائم ہونے والا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہوگا جس میں ادبی تعلیم کے ساتھ دستکاری، امور خانہ داری اور مختلف فنون کی عملی تعلیم کا خاص انتظام کیا جائے گا۔ محترمہ صدر انجمن نے بڑی فیاضی سے اپنی جائیداد کا بڑا حصہ اس ادارہ کے لئے وقف کر دیا ہے۔ ہر سال انجمن کی سرپرستی میں ہر سال دستکاری اور پکوان کی نمائش کی جاتی ہے۔ اس نمائش میں تعلیم نسواں کے مختلف ادار حصہ لیتے ہیں۔ اس انجمن کی نگرانی میں اس وقت تین زنانہ اسکول قائم ہیں۔ غرضکہ اس انجمن کی کارگزاریاں دیکھنے کے بعد مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں بھی چند ایسی حساس خواتین موجود ہیں جو اپنی صنف کی تن من دھن سے خدمت کر رہی ہیں۔

**بستان طالبات** | یہ ادارہ کوئی دس سال سے قائم ہے۔ اس میں یتیم بے یار و مددگار لڑکیوں کے قیام و طعام کا انتظام کیا جاتا ہے اور ان کو تعلیم و تربیت کے ساتھ امور خانہ داری۔ سوزن کاری اور پکوان وغیرہ کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس وقت اس میں کوئی چالیس یتیم لڑکیاں زیر پرورش ہیں۔ اس ادارہ کی معتمد محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ بانو نظامی ہیں۔ علاوہ یتیم لڑکیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے پردہ کرنے والی مفلس بیوہ عورتوں کی امداد بھی کی جاتی ہے۔ سلائی کا کام ان کے لئے فراہم کیا جاتا ہے اور اجرت پر ان سے کام لیا جاتا ہے اور ان کو کشیدہ کاری اور سلائی کی تعلیم بھی مفت دی جاتی ہے۔

**چند خانگی ادارے** | چند خانگی مدارس بعض حساس اور ہمدرد ملک و قوم خواتین کی سرپرستی اور نگرانی میں قائم ہیں۔ بیگم سید رحمت اللہ صاحب پروفیسر جاگیردار کالج نے ایک خانگی اسکول اپنے مکان پر ملازمین کی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے قائم کیا ہے جس میں سلائی کی تعلیم وہ خود دیتی ہیں۔ مسز امیر حسن صاحب نے ایک ایسا ادارہ اپنی قیام گاہ جوبلی ہل پر قائم کیا ہے جس میں صرف بیچاری عورتوں کو سلائی اور کشیدہ کاری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مسز نندی نے اپنے مکان پر ایک مختصر سا اسکول ادنیٰ نوکروں کی اولاد کے لئے قائم کیا ہے جس کو وہ خود تعلیم دیتی ہیں۔

متذکرہ صدر اعداد و شمار سے واضح ہوگا کہ خواتین دکن میں بیداری کے احساسات کس حد تک پیدا ہو گئے ہیں اور اس طبقہ نے ہمارے آقائے ولی نعمت کے عہد میمنت مہد میں اپنی ہمہ جہتی فلاح و بہبود کے لئے کیسے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ تعلیمی، ذہنی و معاشرتی ترقی کے زینے کس حسن و خوبی سے طے کئے جا رہے ہیں۔ ترقی کی اس رفتار کو دیکھ کر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ طبقہ مستقبل قریب میں ذیلی مدارج طے کر کے بہت جلد بام ترقی پر پہنچ جائیگا۔ تعلیم نسواں کی یہ رفتار پیش خیمہ ہے اس طبقہ کے درخشاں مستقبل کا۔ وہ دن دور نہیں کہ ہماری ملکی بہنیں دوسرے ممالک متمدنہ کی خواتین کی طرح زیور علم سے آراستہ اور صحیح تربیت یافتہ ہو کر علم عمل کی روشنی سے جہالت کی تاریکی کو ملک سے دور کریں گی۔

مرزا سیف علیخاں

# الماسِ نظام

## دنیا کا سب سے بڑا ہیرا

میں نے اپنے ملک کے ایک بجوّے لیے ہوئے تابناک مگر شہرۂ آفاق و گراں قدر موضوع کو جو کبھی کسی دور میں دکن کی دولت مندی میں بے پناہ اضافہ کرچکا تھا، اور فی زمانہ ایک پارینہ افسانوی داستان کے درجہ تک پہنچ چکا ہے، زندہ کرلیے، اور پھر گذشتہ ثروت و دولت کا پتہ لگانے کے لیے، وطن کی مادی دولت میں اضافہ کرنے والے متجسسین کے آگے "دکن کے ہیرے اور ان کی کانوں" کے عنوان سے قریباً ایک کتاب مرتب کی ہے، جو شاید سعی بے حاصل سمجھی جائے یا سعی مشکور۔ انشاءاللہ "عنقریب" میں ارباب ہوش کے نذر ہوگی۔ وہ کیسی ہوگی اور کیا ہوگی، اس کا اندازہ قارئین کرام ہی کر سکیں گے۔

محترم حضرت "نور" (مدظلہ) کے ارشاد پر اس کتاب سے صرف ایک ہیرے کا حال آپ کے سامنے ہے۔ جو اس کے مفصل حالات، اور مزید تحقیقی معلومات، اصل کتاب میں شامل ہوں گے، صرف اس وقت جو کچھ موجود ہیں، وہی "سب رس" کے لیے لکھ لیے ہیں۔

اسی موضوع سے متعلق اس سے پہلے ایک اور ہیرے کا حال "کوہِ نور ہیرے کی خونچکاں داستان" کے نام سے ۱۹۴۳ء کے سالنامہ "نیرنگِ خیال" میں نکل چکا ہے۔ ۱۲

یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ دنیا کے معلومہ ہیروں میں صرف "الماسِ برگنزا"[1] ہی ایک ایسا ہیرا ہے، جو سب سے زیادہ وزن رکھتا ہے، مگر نقادوں نے استدلال، شواہد اور تحقیقات کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ اس کا وزن اتنا زیادہ ہے کہ انھیں اس کی اصلیت پر شک و شبہ ہونے لگتا ہے، قطع نظر اس کے اور امور کے لحاظ سے وہ اس کو حقیقی الماس تصور نہیں کرتے۔

حال ہی میں شہنشاہ جارج ششم کی تاج پوشی کے موقع پر "ٹائمز آف انڈیا" کے نامہ نگار نے، بادشاہ کے تاج کے متعلق جو تفصیلات لکھی تھیں، اس میں اس نے ان کے دوسرے تاج کی نسبت یہ لکھا ہے کہ، اور جواہر کے سوا، اس تاج میں وہ ہیرا بھی منسلک ہے جسے "آفریقہ کا ستارۂ ثانی" کہا جاتا ہے، اور جس کا وزن (۳۰۹) کیرٹ ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس وقت صرف یہی ایک ہیرا دنیا کا سب سے بڑا ہیرا تصور ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جدید ترین اطلاعات کی بموجب، یہ ماننا پڑے گا کہ بلحاظ وزن و اصلیت "الماسِ نظام" ہی

---

[1] یہ الماس چند جلا وطن مجرموں کو ۱۷۹۱ء میں دریائے ایبٹ سے ہاتھ لگا تھا جو راہو یلانا سے شمال کی جانب واقع ہے۔ یہ ہیرا پرنس ریجنٹ (Prince Regent) جو بعد میں ڈان جان ششم (Don Jean VI) کے نام سے مشہور ہوا، اور حاکم پرتگال تھا، اس کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ یہ اب تک جواہر خانہ پرتگال میں موجود ہے، ناتراشیدہ حالت میں اس کا وزن ۱۶۸۰ قیراط یعنی پاؤ سیر ہے اور بظاہر ایک بط کے بیضہ کی مقدار کا نظر آتا ہے، اگر یہ خالص ہو تو موجودہ حساب اس کی قیمت (۵۰) کروڑ ہوتی ہے، اور لکھا ہے کہ سرکار پرتگال اس کو خالص الماس سمجھنے کے لیے پروپگنڈہ کرتی ہے۔

(سب رس)
دنیا کا سب سے بڑا ہیرا ہے، کیونکہ اس کا وزن (۵۳۹) قیراط[۱] ہے۔
"الماس نظام" کے ابتدائی تاریخی واقعات کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ ہیرا نواب میر فرخندہ علی خاں بہادر آصفجاہ رابع کے عہدِ حکومت میں، دستیاب ہوا تھا۔ صاحبِ گلزارِ آصفیہ نے (جو اس دور کے معتبر ترین مورخ سمجھے جاتے ہیں، اور جنھیں ایک عرصہ تک دربارِ شاہی کے تقرب کا بھی اختصاص حاصل رہا) اس کے حالات کی تحقیق میں، جو غالباً ان کے چشم دید ہیں، یہ بیان کیا ہے کہ قصبۂ جٹ پول میں ایک بقال رہتا تھا، معلوم نہیں کہ یہ الماس اُسے کہاں سے ہاتھ لگا، مگر اُس نے اس کی حفاظت کا نے کے سنگ میں چھپا کر اپنے ہی گھر میں، زمین میں دفن کر کے رکھی تھی، اور اس کے ساتھ اُس کی فردِ کیفیت بھی اُسی سنگ میں لکھ چھوڑی۔ چند دنوں بعد وہ مر گیا، اور اس کا حال کسی کو نہ بتا گیا، چنانچہ یہ ہیرا اسی طرح دو سو برس تک زمین ہی میں پوشیدہ رہا، اور اس دو صدی کے امتداد نے اُس کے مکان کو کہنہ و افتادہ کر کے ویران کر دیا، اور صرف کھنڈر ہی باقی رہا تھا۔ اتفاق سے کسی نے اس زمین کو خرید کر، اس پر مکان بنانا شروع کیا، کھنڈر کی صفائی وغیرہ اور پایہ کھودنے کی وجہ سے اس مکان کی مٹی دوسری طرف منتقل ہوتی رہی، یہاں تک کہ اس زمین کا وہ دفن شدہ سنگ بھی جس میں کہ ہیرا چھپا تھا سارے خس و خاشاک کے ساتھ پھینک دیا گیا اس لئے کہ ایسی حقیر چیز کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی اور اس کے راز اور بھید سے کون واقف تھا۔

اس کے بہت دنوں بعد سنہ ۱۲۰۰ھ میں اسی قصبہ کا ایک کمہار برتن بنانے کے لئے مٹی کی خاطر اس مقام پر پہنچا اور یہاں اس نے خاک میں دبی ہوئی ایک سنگ پائی، صرف اس خیال سے کہ زمین کھودنے اور مٹی حاصل کرنے میں اس سے سہولت ہوگی اٹھا لی، جب اُسے صاف کرنے لگا تو اس سنگ میں اس کو ایک خوبصورت مگر بے رونق پتھر نظر پڑا چونکہ وہ ایک گنوار تھا، اس لئے اس نے اس "سنگِ رنگین" کو کوئی اہمیت نہ دی۔ مٹی ساتھ لا دی اور اس پتھر کو بھی اپنے بچوں کے کھیلنے کے لئے رکھ لیا۔ چنانچہ گھر پہنچ کر اُس نے اس پتھر کو اپنی لڑکی کے حوالہ کیا اور لڑکی اس کی رنگینی و دل آویزی کو دیکھ کر ہیرا لئے خوش خوش باہر نکلی، اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو جمع کیا اور ان بچوں نے دوڑ دوڑ کر سیتاپھل (شریفوں) کے بیج اکھٹے کئے۔ خود بیٹھی ترازو کے ایک پلڑے میں یہ رنگین پتھر رکھے بیجوں کو اس کا ہم سنگ کرتی، اور سارے بچوں میں اُنھیں تقسیم کرتی جاتی تھی۔
ان ہی دنوں سے چند روز پہلے، لڑکی کی ماں نے اپنے گاؤں کے ایک سنار سے، اس لڑکی کے لئے کسی زیور کے تیار کرنے کی فرمایش کی تھی، اتفاق سے وہ اسی دن، چاندی لینے کے لئے اس کے گھر آیا، تو لڑکی کو گھر کے پہلو میں چند بچوں کے ساتھ بیٹھے

---

[۱] "الماس ہن" نامی ایک اور ہیرا ہے، یہ ایک علاقہ کا نام ہے، جہاں کا حاکم راجہ ہن کہلاتا ہے، چونکہ یہ الماس اُسی کے قبضہ میں ہے، اسی لئے اس نام سے مشہور ہوا۔ یہ ہیرا بھی ناتراشیدہ بیضوی شکل کا ہے، جس کا وزن (۳۶۷) قیراط یعنی ۱/۲ ۲۹ ماشہ ہے، جوہریوں نے اس کی قیمت دو کروڑ سے زیادہ قرار دی ہے، تو اس لحاظ سے غور فرمائیے کہ "الماس نظام" کس قیمت کا ہوگا جو اس سے (۱۷۲) قیراط زیادہ وزنی ہے "کوہ نور" جیسا مشہور ترین ہیرا تو غالباً بارہویں نمبر پر شمار ہوتا ہے، جس کا وزن ۱/۲ ۱۰۶ قیراط اور قیمت چودہ لاکھ ہے، صرف اس کو اس کی تاریخی حیثیت سے اتنی بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ ورنہ اس کا قیمت و وزن کے لحاظ سے کوئی درجہ نہیں۔

اس بے نظیر پتھر سے کھیلتے ہوئے پایا، اور اس نے اپنی واقفیت کی بنا پر اس پتھر کی حقیقت سمجھ لی کہ یہ ایک بے بدل آب دار ہیرا ہے، دوسرے دن جب کہ کمہار کے گھر کوئی نہ تھا، سنار موقع پاکر اپنے ساتھ مٹھائی لے آیا، اور نہایت عاجزی کے ساتھ لڑکی کو سمجھا منا کر مٹھائی دی اور اس سے وہ پتھر مانگنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کچھ ضدی تھی۔ اُس کی اِس طلب پر برہم ہوگئی، اور غصہ میں فوراً بھاگ کر گھر دوڑی چلی آئی، اور کمرے میں جاکر ہیرے کو طاق میں رکھ دیا۔ جب ماں آئی تو سارا قصہ بیان کیا کہ فلاں سنار نے مجھے مٹھائی دی، اور اس پتھر کو بڑی عاجزی سے مانگنے لگا، لیکن میں نے اُسے نہ دیا، ماں نے یہ خیال کیا کہ وہ شاید چاندی تولنے کے لئے اس کو مانگ رہا تھا، اس لئے اس نے اس پتھر کو ایک پوشیدہ مقام پر چھپا دیا۔ جب دوبارہ سنار آیا اور اس نے لڑکی سے وہ پتھر مانگا تو ماں کو معلوم ہوگیا، اُس نے سنار سے کہا معلوم نہیں کہ اس دیوانی بچی نے اُسے کہاں کھودیا۔ سنار یہ سن کر بے قرار ہوگیا، اور کہنے لگا کہ "افسوس تونے یہ کیا کیا؟ اری وہ تو ہیرا تھا!! اگر تو مجھے دے دیتی تو میں تجھے تیرے منہ مانگے پیسے دیتا۔" جب لڑکی کا باپ آیا تو ماں نے یہ سارا قصہ اُسے کہہ سنایا، اس پتھر کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد کہ یہ ہیرا ہے، شاید کمہار زرگر سے ملا، اور ان دونوں میں بعد تصفیہ یہ طے پایا کہ وہ اس معاملہ کو انتہائی پوشیدہ رکھیں گے، اور آپس میں نصف نصف تقسیم کرلیں گے، چنانچہ یہ ہزار وقت ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اُسے توڑا، اور ہیرے کا وہ حصہ، جس کو سنار نے اپنے لیے پسند کیا تھا، اس کے دو تین ٹکڑے ہوگئے، اور وہ حصہ جو کمہار کے لئے مختص تھا، محفوظ رہا، اور یہی ٹکڑا وزن میں پختہ چھ تولے پانچ ماشے نکلا۔ صاحب گلزارِ آصفیہ لکھتے ہیں کہ یہ اپنی تمام وکمال حالت میں گیارہ تولے تھا۔

سنار اپنے حصے کے ٹکڑوں کو لے آیا، اور دوسرے سناروں کے ہاتھ ایک ایک کرکے فروخت کردیا۔ اس خرید فروخت کی شہرت ہونے لگی، اور ہوتے ہوتے وہاں کے زمیندار تک بھی پہنچی، فوراً اس نے اس سنار کو گرفتار کرالیا، اور اس پر سختیاں کرکے اس ہیرے کی تحقیقات کی، واقعات کے معلوم ہونے پر ان سب سناروں اور اُس کمہار کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان دنوں، اس علاقہ کی تعلقداری پر بچھا راؤ نامی ایک شخص مامور تھا، اُس نے اس الماس کی ساری حقیقت مدار المہام وقت مہاراجہ چندولال بہادر کو لکھ بھیجی۔ مہاراجہ نے محمد قمرالدین جمعدار مندوزی کو جو تعلقدار نلگنڈہ تھے، بچھا راؤ کے ہمراہ اُس زمیندار کے پاس بھیج کر اُسے طلب کیا، زمیندار نے، نوبت ونقارہ اور دس ہزار کی جاگیر اپنے اور اپنی اولاد کے لئے بطورِ "آل تمغہ" سرفراز ہونے کی شرط پر اس ہیرے کو مہاراجہ بہادر کے حوالہ کردیا۔ راجہ صاحب نے حضور کی نظر اشرف میں گذرانا، اور اُسے حسبِ وعدہ اعلیٰ حضرت سے عرض کرکے جاگیر سے سرفراز کرایا۔ جوہریوں نے اس "نادر العصر رقم" کو دیکھ اور پرکھ کر، بالاتفاق عرض کی کہ یہ الماس عجائباتِ روزگار سے ایک لاقیمت چیز ہے، اور کسی ملک میں ہم نے ایسا نادرِ روزگار، اس قدر بڑا ہیرا دیکھا اور نہ سُنا۔ اور ایسے جوہرِ نایاب کی قیمت لگانے سے ہم عاجز ہیں۔

ہند اور ولایت، ایران کے حکاکوں کو اس الماس کی تختیاں تراشنے کے لئے حکم ہوا تو ان لوگوں نے اس کی مزدوری پانچ لاکھ روپئے طلب کی، اور کہا کہ ہم اس الماس سے سات عمدہ باریک اور شفاف تختیاں تراش کر گزرانیں گے کہ جن کے آگے "دریائے نور" اور "کوہ نور" بے رونق و بے آب نظر آنے لگیں گے۔ غالباً حضور نے اجرت کی زیادتی کی وجہ سے منظور نہیں فرمایا، یہ جس حالت میں دست یاب ہوا تھا، اسی طرح جواہر خانہ میں محفوظ کرلیا گیا۔[1]

---

[1] گلزارِ آصفیہ صفحہ ۶۰۰ مؤلفہ حکیم غلام حسین خاں مطبوعہ مطبع محمدی ۱۳۰۸ھ

"تاریخ ریاست حیدرآباد دکن"[1] کے مولف نجم الغنی خاں رام پوری نے اپنی کتاب کے صفحہ انیس[19] پر اس ہیرے کے تراشنے کی اجرت پچاس ہزار لکھی ہے جو درست معلوم نہیں ہوتی۔[2]

"آئینۂ جواہر"[3] کا مولف کہتا ہے کہ اس ہیرے کا شمار دنیا کے بڑے بڑے ہیروں میں ہے اور نظام حیدرآباد کے پاس رہنے کی وجہ سے "الماس نظام" سے مشہور ہوا ہے۔ اس کا وزن (۳۴۰) قیراط یعنی (۱۴۲؍۴) ماشہ ہے۔ یہ کان گولکنڈہ سے برآمد ہوا تھا اور ۱۸۳۵ء میں ایک شخص کے پاس بطور کھلونے کے تھا۔ ایک اور روایت یہ نقل کی ہے کہ کسی سوار نے اسے ایک مٹی کے برتن میں پایا تھا۔ جو بعد کو ایک ہندو زرگر کے ہاتھ لگا اور اس نے اس کی آزمائش کے لئے کہ یہ ٹوٹ سکتا ہے یا نہیں اس پر ضرب لگائی جس کی وجہ سے اس کے تین ٹکڑے ہو گئے۔[4] اس کی شکل ایک چینی عورت کے پاؤں کی طرح ہے جس کا انگوٹھا نہ ہو۔[5]

کنگ صاحب ( Mr King ) نے بھی اس کی شکل وشباہت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ناتراشیدہ الماس بادامی شکل کا ہے اس کے تاریخی حالات لکھنے میں انھوں نے بھی سخت غلطی کی ہے اور ہمارے نزدیک ان کے ایسے مشہور ماہر ونقاد کے بیانات بھی قابل اعتبار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "کسی حادثہ سے ہندوستان کے غدر میں اس سے ایک ٹکڑا علیحدہ ہو گیا" اور اس کا وزن (۳۴۰) قیراط ہے۔ بعضوں نے یہ شک ظاہر کیا ہے کہ کنگ صاحب نے اس کی کوئی صراحت نہیں کی کہ آیا یہ وزن اس الماس کے ٹوٹنے سے قبل کا ہے یا بعد کا؟ ایک اور انگریز ڈیولے فیٹ ( Dieula Fait ) کا بیان ہے کہ اس کا وزن اس کے ٹوٹنے سے پیشتر (۳۴۰) قیراط سے کم نہ تھا۔ مبصرین کے نزدیک صاحب گلزار آصفیہ کے سے معتبر مورخ کے آگے ان لوگوں کے گمانوں اور مختلف بیانوں کی کوئی وقعت نہیں اس لئے کہ انھوں نے وزن کی تصریح صاف طور پر کر دی ہے۔ باربٹ نامی ایک ماہر نے اس فرضی وزن کی بنا پر اس کی قیمت (۵) لاکھ فرانک لکھی ہے جو بیس لاکھ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

"آئینۂ جواہر" کا مولف امرناتھ کہتا ہے کہ اس ناتراشیدہ الماس کی قیمت ٹھیک ٹھیک نہیں کہی جا سکتی۔ کیونکہ کاٹنے کی وجہ سے ناتراشیدہ الماس اکثر وزن میں کم ہو جایا کرتے ہیں لیکن غیر تراشیدہ حالت میں اس الماس نظام کی شکل چنداں بے ڈھب بھی نہیں۔ البتہ کٹوانے میں نصف سے زیادہ کے نقصان کا احتمال نہ ہوگا۔ تاحال یہ الماس نظام حیدرآباد کے جانشینوں کے پاس خیال کیا جاتا ہے۔[6]

---

[1] تاریخ ریاست حیدرآباد دکن مطبوعہ نول کشور پریس ۱۹۳۰ء۔

[2] صاحب گلزار آصفیہ نے جو وزن چھ تولے پانچ ماشہ لکھا ہے اس کے کل (۷۷) ماشے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ وزن غلط اور ناقابل تسلیم ہے اور مولف موصوف ہی کا بیان بہت زیادہ قابل اعتبار ہے۔ ۱۲

[3] آئینۂ جواہر کے مولف نے غالباً یہ قصہ انگریزی کتابوں سے لیا ہے اور انگریز محققین نے بلا تحقیق جس طرح روایت سنا تھا اسے اپنی کتابوں میں قلم بند کر لیا گویہ قصہ ان لوگوں نے غلط لکھا ہے مگر گلزار آصفیہ کے ہی واقعہ کی الٹ پھیر ہے اور ان غلط قصوں ہی سے صاحب گلزار آصفیہ کی تحقیقات اور سچائی کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے۔ کمہار کے بجائے مٹی کے برتن کا ذکر کیا گیا ہے شاید مولف ظرف کہہ کر مظروف کا قاعدہ تو مراد نہیں لے رہے ہیں۔ سوار کا اس ہیرے کو پانا بالکل غلط ہے۔ البتہ ایک ہندو زرگر اور اس کے تین ٹکڑے ہونا یہ صحیح ہے۔

[4] آئینۂ جواہر مصنفہ پنڈت امرناتھ، حاشیہ صفحہ ۱۴۲ مطبوعہ خادم التعلیم پریس لاہور ۱۹۱۳ء۔

[5] آئینۂ جواہر صفحہ ۱۴۲۔

رہبر فاروقی

# پاؤں میز

## (یعنی پاؤں ناپنے کی رسم)

"یہ مضمون تقی عابدی صاحب کی اس دلچسپ کتاب کا ایک ٹکڑا ہے جو حیدرآباد کی شادیوں پر لکھی جا رہی ہے۔"

---

سانچے موتی کی ایک لڑ چاندی کی تھالی میں رکھ کر تھالی رسم کی کشتی میں رکھ دی جاتی ہے۔ دوسری کشتی میں بنارسی دوپٹہ جس پر مسالا ٹکا ہوا ہوتا ہے۔ رکھا جاتا ہے۔ تیسری کشتی میں مالیدہ، کھوپرہ کا چورا، مصری، ڈیٹ والے سنہرا پان، بڑلی چھباری، مالیدہ کے لڈو طشتریوں میں جما کر۔ ایک چاندی کی کٹوری میں صندل۔ چاندی کے ڈیٹ والے پان جس کو لال "اٹہ" باندھا جاتا ہے۔ چاندی کے لڈو، چاندی کی سپاری وغیرہ کو کشتی میں جما کر رکھا جاتا ہے۔ جملہ سامان رسم کو چاندی کا ورق لگا کر تھالیوں پر زردوزی تھالی پوش اڑھا کر کشتیوں کو لال بستنی میں باندھ کر زردوزی کشتی پوش اڑھا دئے جاتے ہیں۔ ایک پلہ یا آدھا پلہ مصری خوانوں میں رکھ کر بستنی سے باندھ کر ان پر مخملی خوان پوش اڑھا دئے جاتے ہیں۔ چاندی کی چنگیر میں پھولوں کا گہنا رکھ کر خاص طور پر مشاطہ کے ہاتھ چنگیر دیا جاتا ہے۔ یہ خدمت سوائے مشاطہ کے دوسرا کوئی انجام نہیں دے سکتا۔ ورنہ مشاطہ لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ رسم لیجاتے وقت مشاطہ کو لال چادر اوڑھنا ضروری ہے۔ اگر چادر سفید ہو تو اس پر لال چھینٹے دیدئے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سہاگ کے کام میں سفید چادر منحوس ہے۔ حیدرآباد میں بیوہ عورتیں سفید کپڑے استعمال کرتی ہیں۔ رنگین کپڑے، مسی، پھول، چوڑیاں وغیرہ استعمال کرنا "ترک لذت" کے منافی ہے۔ اور پھر یہ چیزیں بیوہ اور سہاگن کی علامت امتیازی قرار پا چکی ہیں۔ چنانچہ بیوہ عورتیں بجائے کانچ کی چوڑیوں یا جوڑے کے سونے یا چاندی کی چوڑیاں پہنتی ہیں جنھیں "چوڑ" کہا جاتا ہے۔ جملہ سامان رسم ایک زردوزی شامیانے کے نیچے جسے "ڈنڈا پینگی" کہتے ہیں۔ اس ترتیب سے ہوتا ہے کہ آگے آگے مشاطہ پھولوں کی چنگیر لئے ہوئے اور پیچھے مزدوروں کے سر پر جملہ رسم کی کشتیاں۔

دکن میں شامیانہ صرف میت کے وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ میت کے وقت اس کو شامیانے کا نام دیا گیا ہے۔ اس لئے اس کو ڈنڈہ پینگی کہتے ہیں حالانکہ یہ دونوں کوئی علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔ اسی طرح رواہ کھویا اور روغن زردے جو میٹھا پکایا جاتا ہے عام طور پر اس کو میٹھا یا حلوہ کہتے ہیں۔ مگر کسی کے دہم یا چہلم میں اسی میٹھے کا نام "پھیکا" رکھا جاتا ہے۔

بہرحال جملہ سامان رسم بہ ترتیب متذکرہ جب شامیانہ یا ڈنڈہ پینگی کے نیچے آجاتا ہے تو مختلف باجہ نواز "تاشہ، رفہ، روشن چوکی، ڈھول، بیانڈ وغیرہ کے ساتھ جو آگے آگے بجتا رہتا ہے۔ دلہن کے گھر بھیجا جاتا ہے۔ سرِ شام دلہن کے گھر دولہا کی سہاگن رشتہ دار عورتیں یعنی سمدھنیں رسم کرنے آتی ہیں۔ دولہا کی ماں کے ساتھ چاندی کی تھالی میں سو، سوا سو روپیہ، اشرفیاں یا کسی قسم کا زیور ہوتا ہے جو بطور "چڑھاوے" کے دلہن کو دیا جاتا ہے۔ اور سمدھنیں اپنے ساتھ ایک میراثنیوں کا طائفہ بھی ضرور لاتی ہیں۔ میراثنیں بوجہ ان کے مخصوص گانوں کی وجہ سے شادی اور رسم کا جزو لاینفک ہے۔

## ۲

ادھر دلہن کے گھر کو فرش فروش سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ دالان میں گاؤ تکیے لگائے جاتے ہیں۔ بیچ دالان میں ایک

تاش کا منڈپ باندھا جاتا ہے۔ منڈپ باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو مثل ہے بیل منڈوے چڑھے تو گویا منڈپ تو منڈوہ ہے اور بیل آل اولاد کی جو آگے چڑھے گی۔ غریبوں میں تو اب تک لکڑیوں کو رنگ کر سبز سبز پتوں سے منڈپ باندھا جاتا ہے۔ مگر امیروں اور صاحب استطاعت لوگوں نے منڈوے سے منڈپ اس طرح بنا لیا ہے۔ اسی منڈپ کے نیچے ایک لال رنگ کی "پاؤں گھڑی" یعنی پا انداز بچھاتے ہیں تاکہ سمدھنیں منڈپ کے نیچے اور اس پاؤں گھڑی پر سے چلتی ہوئیں دالان میں داخل ہوسکیں۔ منڈپ کے نیچے دلہن کی کوئی ایک ان بیاہی رشتہ دار لڑکی چاندی کی کٹوری میں صندل لے کر کھڑی ہوجاتی ہیں۔ اور جب سمدھنیں آنا شروع ہوتی ہیں تو ہر سمدھن کو "صندل ہاتھ" دیا جاتا ہے۔ صندل ہاتھ دینے کا طریقہ یہ ہے کہ صندل کی کٹوری میں چار انگلیاں ڈبو کر ہر سمدھن سے اس طرح ہاتھ ملایا جائے کہ اس کے ہاتھ میں ہی صندل لگ جائے کہ یہ نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ انہی آنے والی سمدھنوں میں اگر کوئی سمدھن "امید" سے ہوں تو وہ منڈپ کے نیچے نہیں آسکتیں اور نہ ان کا گود بھرا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قدرتاً نو وان کا گود بھرا جانے والا ہے۔ اب اگر گود بھرا جائے گا تو وہم یہ ہے کہ بچہ ضایع ہو جائے گا۔ اور گود خالی ہو جائے گا۔ اسی طرح چونکہ منڈپ میں بھی گود ڈالا جاتا ہے اس لئے یہ اس کے نیچے بھی نہیں جاسکتی۔ منڈپ میں گود اس لئے ڈالتے ہیں کہ منڈپ ایک ایسا منڈوہ ہے جس پر آل اولاد کی بیل چڑھتی ہے۔ گود میں پان شریک ہوتے ہیں اور پان کی بیل ہوتی ہے اس لئے ابتدا ہی سے گویا منڈپ میں گود ڈال کر بیل چڑھا دی جاتی ہے۔ تاکہ آئندہ آل اولاد کی بیل ہمیشہ ہری بھری اور چڑھتی ہی رہے۔

منڈپ کے قریب ہی ایک طرف میراثنیوں کا طائفہ بیٹھا ہوا گاتا رہتا ہے۔ ان لوگوں کے گانے بہت دقتیہ ہوتے ہیں۔ ہر موقعہ اور رسم کے لحاظ سے یہ لوگ مخصوص گانے گاتے جاتے ہیں۔ ان کے گانے اپنے اپنے وقت پر درج ہوں گے۔ چنانچہ جس وقت سمدھنیں آتی ہیں تو میراثنیں یہ مخصوص گانا گاتی ہیں۔

ساجن آئی رے اللہ پیر منائی رے

میری ساجن آئی رے

جب سمدھنیں دالان میں گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتی ہیں تو انھیں "مصری چنائی" جاتی ہے۔ دو مامائیں سمدھنوں کے سر پر ایک تاش کا مسالا ٹکا ہوا دوپٹہ پکڑ لیتی ہیں اور دلہن کی ایک سہاگن رشتہ دار بیوی چاندی کی طشتری میں مصری کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں جن پر چاندی سونے کا ورق لگا ہوا ہوتا ہے لاتی ہیں اور ہر سمدھن کے آگے باری باری سے پیش کرتی ہیں۔ ہر سمدھن ایسے موقعہ پر شرم اور جھینپ کا اظہار ضرور کرتی ہے اب خواہ یہ فطرتاً ہو یا رسماً بہرحال رسم کی پابندی انھیں ضرور کرنی پڑتی ہے۔ وہ لڑکیاں ہونا کتخدا ہیں مصری لینا تو کجا آنکھ تک ادھر نہیں اٹھاتیں۔ مگر مصری لانے والی بیوی جبر و قہر اور زور و زبردستی کے ساتھ ان کے منہ میں مصری ٹھونس ہی دیتی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ فقرے بھی کستی جاتی ہیں جس سے وہ بیچاری تو مارے شرم کے عرق عرق ہوتی جاتی ہے اور ادھر خوب فرمائشی قہقہے اڑتے ہیں۔ مصری چنائی جاتے وقت میراثنیاں گاتی ہیں

سمدھن میری مصری کھاوے

اس کے بعد گانا شروع ہوتا ہے۔ ٹھمری۔ دادرا غزل وغیرہ جب میراثنیں گا چکتی ہیں تو دلہن کو لانے کی جلدی شروع کی جاتی ہے۔ ادھر تو جلدی ہوتی ہے اور ادھر دلہن کو سنوارا جاتا ہے۔ دلہن بیچاری کا شروع شادی سے اخیر شادی تک

اپنے اوپر کوئی اختیار نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ اپنی آنکھوں کو بند رکھے باقی جملہ کام اوپر والے جو چاہتے ہیں کرلیتے ہیں۔

دلہن کو کسی ایک قسم کا قیمتی جوڑا کپڑوں کا پہنایا جاتا ہے اور وہ زیور بھی جو دلہن کو جہیز میں دیا جانے والا ہے۔ پہنا دیتے ہیں آنکھوں پہ "آرائش" لگاتے ہیں۔ یعنی باریک کٹے ہوئے مقیش سے افشاں چنا جاتا ہے۔ سرمہ لگایا جاتا ہے۔ اور ایک لمبا سا گھونگھٹ کھینچ کر کوئی ماما۔ انا۔ دوا یا چھوکری دلہن کو گود میں اٹھا کر باہر اس زردوزی مسند پر لا بٹھاتی ہے جو دالان میں منڈپ کے نیچے اسی رسم کے لئے بچھائی جاتی ہے۔ ایک مخصوص گیت ہوتا ہے جو ایسے وقت میں میراثنیاں نہایت جوش میں گاتی رہتی ہیں۔ اس وقت کا سماں قابل دید اور اس وقت لوگوں کے جذبات دیکھنے کی چیز ہیں سب سمدھنیں خاموش دلہن کے کمرے کی طرف نگاہیں لگائے سراپا انتظار اور مجسم اشتیاق بنی بیٹھی ہوتی ہیں۔ جیسے ہی دلہن نظر آتی ہے۔ میراثنیوں کا جوش اور بڑھ جاتا ہے۔ سمدھنوں کے چہرے پھول کی طرح کھل جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ تبسم۔ ہنسی سے بدل جاتا ہے۔

آئی بنو آئی - ہریالی بنو آئی
اماں کی پیاری بنو آئی باوا کی پیاری بنو آئی
آئی بنو آئی

گیت سمدھنوں میں ایک عجیب جوش و خروش پیدا کردیتا ہے۔ باہر نوبت نوازی شروع ہوجاتی ہے۔ اور اب رسم شروع ہوتا ہے۔ رسم دولہا کی سہاگن پھوپی یا چچی کو کرنا پڑتا ہے۔ دولہا کی والدہ ان سے نہایت عجز و انکسار اور منت کے ساتھ کہتی ہیں۔ آپ بزرگ ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ سے یہ "کاج" ہوجائے تو میری خوش نصیبی ہے۔ خدا آپ کی چھاؤں (سایہ) دلہن پر بھی ڈالے اور وہ دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ اگر دولہا کے رشتہ داروں میں سے کوئی بزرگ نہ ہوا اور خود دولہا کی ماں سہاگن ہوں تو رسم کرنے بیٹھتی ہیں۔ رسم کرنے کے لئے سہاگن کا ہونا ضروری ہے۔

کشتیاں اور چنگیر جو دولہا کے گھر سے آتے ہیں وہ مسند کے قریب رکھ دئے جاتے ہیں۔ رسم کرنے والی بیوی پہلے اپنے گلے کو صندل لگاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ خود سہاگن ہیں اور پھر وہ سہاگن جن کا سہاگ بہت قدیم ہے مطلب یہ کہ ان کی طرح دلہن کا بھی سہاگ تا دیر قائم رہے۔ اپنے گلے کو صندل لگا لینے کے بعد دلہن کے گلے۔ سینہ اور پیٹھ پر صندل لگا کر سات۔ نو یا گیارہ سہاگنوں کو بھی بہ ترتیب متذکرہ صندل لگایا جاتا ہے۔ اگر دلہن کمسن ہو تو پھر دلہن کو صندل لگانے کے بعد علاوہ سہاگنوں کے ان بیاہی لڑکیوں کو بھی صندل لگایا جاتا ہے تاکہ ان کی شادی بھی جلدی ہوجائے۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ رسم ہوتے وقت اگر کوئی چھینک دے تو رسم تھوڑی دیر کے لئے روک دیا جاتا ہے۔ حالانکہ چھینکنے کے بعد مسلمان الحمد اللہ کہہ کر شکر ادا کرتے ہیں۔ تاہم اس کو کسی کام کی ابتدا میں منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح باہر نکلتے وقت کوئی چھینک دے یا کوئی سامنے آجائے یا ٹھوکر لگ جائے تو تھوڑی دیر کے لئے باہر جانا موقوف ہوجاتا ہے۔ کیونکہ یہ ناکامیابی کی علامت ہے بجائے اس کے اگر کوئی مہتر یا کوئی شخص "دہی" لے کر سامنے آجائے تو کامیابی یقینی سمجھی جاتی ہے۔

صندل لگاتے وقت میراثنیں گاتی ہیں۔

صندل لگاؤ ہریالی بنو کو۔ راج دلاری بنو کو

منڈل لگا چکنے کے بعد گود بھرے جاتے ہیں۔ پہلے رسم کرنے والی بیوی اپنا گود بھر لیتی ہیں۔ اس کے بعد دلہن کا گود چاندی کی سپاری اور چاندی کے لڈو سے حسب مقدور روپیہ رکھ کر بھرا جاتا ہے۔ دلہن کے قریب دلہن کی ایک رشتہ دار سہاگن بیٹھتی ہیں۔ شرم کی وجہ سے دلہن جھکی ہوئی بیٹھتی ہے۔ اس لئے یہ بیوی دلہن کا سر بھی تھامے ہوئے رہتی ہیں اور موقعہ بموقعہ دلہن کو امداد بھی دیتی جاتی ہیں چنانچہ جس وقت دلہن کا گود بھرا جاتا ہے تو یہ بیوی ایک ریشمی رومال دلہن کے گود میں بچھا کر گود حاصل کر لیتی ہیں۔ دلہن کا گود بھرنے کے بعد منڈپ میں بھی ایک گود ڈالا جاتا ہے اور پھر سات "نو" یا گیارہ سہاگنوں کے گود بھرے جاتے ہیں۔ گود بھرتے وقت میراثنیاں یہ مخصوص گیت گاتی ہیں۔

ہریالی کا گود بھراؤ۔ پیا کے کارن۔ راج دلاری کے گود بھراؤ
سب مل کر گود بھراؤ۔ سہاگنوں کا گود بھراؤ پیا کے کارن
گود بھراؤ مانگ لگاؤ۔ موتیوں کے چوک پراؤ پیا کے کارن

گود بھرائی ہو چکنے کے بعد دلہن کا منہ میٹھا کیا جاتا ہے۔ رسم کرنے والی بیوی مصری دلہن کے منہ کے پاس لیجاتی ہیں اور وہ بیوی جو دلہن کے قریب بغرض امداد بیٹھتی ہیں ہاتھ بڑھا کر مصری لے لیتی ہیں۔ اس کے بعد "چوبا" کھلایا جاتا ہے۔ مصری کھلاتے وقت کا مخصوص گیت یہ ہے۔

مصری کھاوے بنو میری۔ یہ سہاگن کے ہاتھ سے کھاوے
یہ بچہ والی کھلاوے۔ بنو میری مصری کھاوے

چوبا کھلاتے وقت بجائے مصری کے چوبا کھاوے گاتے ہیں۔ بقیہ گانا یہی ہوتا ہے۔ چوبا کھلانے کے بعد دلہن کو پان کھلایا جاتا ہے۔ پان پر سونے چاندی کے ورق لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت کا مخصوص گیت یہ ہے۔

بنڈری کو پان کھلاؤ ری البیلی سہاگن

پان کھلا کر پھولوں کا گہنا اور ہار پہنائے جاتے ہیں۔ اس وقت یہ مخصوص گیت گایا جاتا ہے۔

ہارو ری ماں یہ لال بنو کے گلے۔
اماں پیاری کے گلے۔ باوا پیاری کے گلے
جائی۔ جوئی اور بیلا چنبیلی۔ اچھے گلابوں کے ہار
یہ چاند بنو کے گلے۔ ہارو ری ماں یہ لال بنو کے گلے

یہ جملہ رسوم گویا تمہید تھے اصل پاؤں ناپنے کی رسم کے۔ کیونکہ جب تک یہ سارے رسوم نہ ہوں کوئی رسم ہی نہیں کہلاتا۔ بہرحال یہ سب مراحل طے ہو جانے کے بعد وہ موتیوں کے لڑ جو ساتھ لائی گئی ہے۔ رسم کرنے والی بیوی نکالتی ہیں اور ادھر سے دلہن کے پاس بیٹھی ہوئی دلہن کی رشتہ دار سہاگن دلہن کا سیدھا پاؤں آگے بڑھا دیتی ہیں اور اس "لڑ" سے پاؤں ناپ لیا جاتا ہے۔ یہ لڑ جس سے پاؤں ناپا گیا ہے جلوہ کے روز دلہن کی نتھ میں ڈالی جاتی ہے۔

اس کے بعد "رونمائی" ہوتی ہے اور جو روپیہ، اشرفیاں یا زیور لایا گیا ہے وہ اس طرح دلہن کو "سلامی" میں

دیا جاتا ہے کہ دلہن کے قریب بیٹھی ہوئی بی بی دلہن کے دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیتی ہیں اور رسم کرنے والی بیوی "سلامی" دلہن کے ہاتھوں میں ڈال دیتی ہیں اور ساتھ ہی دلہن کے سر سے چٹ چٹ بلائیں لے لیتی ہیں اس کے بعد "وارن پھیرن" شروع ہوتا ہے۔ ایک میراثن دلہن کے قریب آکر کھڑی ہو جاتی ہے تاکہ "وارن پھیرن" کے روپے حاصل کرے کیونکہ یہ حق میراثن ہی کا ہوتا ہے اس طرح اسے بھی سو سوا سو روپے مل جاتے ہیں۔ بہر حال ایک ایک سمدھن آتی جاتی ہیں دلہن کا منہ دیکھتی ہیں اور حسب مقدور روپیہ وار کر میراثن کو دیتی جاتی ہیں۔ بقیہ میراثنیاں یہ مبارک بادی گاتی رہتی ہیں جس کے بعد یہ رسم ہو جاتا ہے اور دلہن کمرہ میں پہونچائی جاتی ہے۔

تمھیں یہ شادیاں جسم جسم مبارک ہو مبارک ہو
مچی ہے دھوم شادی کی مبارک خانہ آبادی
وہ شہزادہ یہ شہزادی مبارک ہو مبارک ہو

تقی عابدی

# کوہِ نور

(گولکنڈہ کا مشہور ہیرا جو اب شہنشاہ انگلستان کے تاج کی زینت ہے۔)

---

بحرِ ظلمات میں ڈوبا ہوا تارا تھا کوئی
پردۂ خاک سے سورج کی کرن نکلی ہے
کسی معشوق جوان سال کا نگین دل ہے
سنگ کی شکل میں اک نورِ نظر آتا ہے
شعلۂ حسن ہے یہ جلوۂ نیرنگ ہے یہ
جوہری دیکھ کے کہتا ہے کہ "لاقیمت ہے"

راکھ کے ڈھیر میں خوابیدہ شرارا تھا کوئی
جلوہ بردوش تمنائے وطن نکلی ہے
زرپرستوں کے لئے شمع سرِ محفل ہے
پرتوِ جلوہ گہہ طور نظر آتا ہے
رونقِ تاج ہے یہ زینت اورنگ ہے یہ
جس کی قسمت میں یہ آجائے وہ خوش قسمت ہے

ذرہ کہتا ہے کہ "یہ کیا ہے تماشا یارب؟
مہرِ تابندہ سے بڑھ کر ہے یہ ذرہ یارب؟
کس سے لوں نور کہ اب میری نظر ششدر ہے
چرخ پر مہر ہے اور ارض پہ یہ پتھر ہے
ایک ہے دور بہت، ایک ہے آنکھوں سے قریب
کس کو سجدہ کرے حیران ہے یہ تیرا غریب"

میکش

# سمستانِ جٹپول

ہماری سلطنت آصفیہ کے زیر اقتدار بہ عنایت الٰہی ایسے متعدد علاقے ہیں جو اپنی وسعت اور آمدنی کے اعتبار سے ہندوستان کے ان اسٹیٹوں سے بڑھے ہوئے ہیں جن کے حکمران ہز ہائینس کے خطاب سے ممتاز اور توپوں کی سلامی کا اعزاز رکھتے ہیں بلکہ ان میں کے بعض تو یورپ کی چھوٹی چھوٹی خود مختار سلطنتوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ایسے تمام علاقوں کے والی (نواب یا راجہ) کی جانشینی و علیحدگی، تبنیت و وراثت، عطائے اختیارات عدالتی و کوتوالی، اعلیٰ عہدہ دارانِ اسٹیٹ کا تقرر و تنزل کلیتہً حکومت عالیہ آصفیہ نظامیہ کی منظوری کا تابع ہے۔ انہی علاقوں میں سے ایک سمستانِ جٹ پول ہے جس کا رقبہ ۵۰، ۴۵۵ مربع میل (لوسب مانسہ یکڑ) اور جس کی مردم شماری ۵۰،۸۰۹ ہے

جٹ پول کا صحیح تلفظ جٹ پرول ہے۔ جٹایو ایک پرندہ کا نام ہے اور پرول کے معنی شہر کے ہیں۔ وجہ تسمیہ اس کی یہ ہے کہ جب راون، رام چندرجی کی باعصمت بیوی کو ان کے بن باس کے زمانہ میں اڑا لے جارہا تھا تو یہ پرندہ اس مقام پر راون کا سد راہ ہوا۔ راون کو جو نشۂ حکومت میں سرشار تھا۔ جٹایو کی یہ مزاحمت غضب آلود کردی اور اس نے اس پرندہ کو مار ڈالا یا کم از کم یہ کہ اس کو زخمی کر دیا اور اس کا بازو اسی مقام پر گر گیا جس کی یادگار میں جٹیشور نام کی ایک دیول تعمیر کی گئی جو ہنوز اب تک موجود ہے اور یہیں ایک شہر جٹ پرول نام کا بسا جو اب ایک معمولی سا قریہ رہ گیا ہے۔ بعد میں یہ علاقہ بھی اسی نام سے موسوم ہوگیا۔

سنسکرت میں سنوستھان راجہ کے رہنے کی جگہ کو کہتے ہیں کثرت استعمال سے واؤ اور ھ حذف ہوگئے اور نون، میم سے بدل کر سمستان ہوگیا اور اس سے مراد ایسا علاقہ عطیۂ شاہی قرار پایا جس میں ملک کا ایک حصہ ایک رقم معینہ کے ٹھیراؤ سے کسی کو عطا کیا گیا ہو اس رقم معینہ کو اعزازاً پیش کش کہتے ہیں۔ اس طرح ان دونوں الفاظ کی ترکیب سے اب یہ علاقہ سمستان جٹ پول کہلاتا ہے۔ مگر سمستان کا مستقر اب جٹ پول نہیں بلکہ کولا پور ہے جو حیدرآباد سے (۱۴۰) میل جانب جنوب ضلع محبوب نگر میں ہے حیدرآباد سے براہ جڑچرلہ و کتہ کوٹہ، یا پرال تک ۱۰۰ میل کی سیدھی سڑک تعمیرات کی بنائی ہوئی ہے۔ اس کے بعد ۲۰ میل کا راستہ علاقہ سمستان جٹ پول کا ہے جو دریائے کرشنا کے متوازی کولاپور تک چلا گیا ہے۔

یہاں کے راجہ ریچرلہ گوترم سے سربھی خاندان کے اراکین ہیں جو جنوبی ہند کا ایک بڑا معزز اور قدیم خاندان ہے۔ اس خاندان کے دیگر اراکین علاقہ مدراس میں بوبلی، وینکٹ گری، پنتھاپور، میلارم، کے راجہ ہیں آخری والیٔ سمستان جٹ پول راجہ وینکٹ لچھما راؤ یہاں کے ستائیسویں راجہ تھے ان کا اصلی نام کرشنا چندریا ہے راجہ وینکٹ جگناتھ راؤ نے انہیں ۱۸۸۴ء میں متبنیٰ لیا اور وینکٹ لچھما راؤ نام رکھا بعد میں اعلیٰ حضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہٗ نے نظام نواز ونت کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

مستقر سمستان کولاپور جس کی مردم شماری ۲۱۵۸ ہے دریائے کرشنا کے شمال میں ۹ میل پر ایک وسیع میدان

میں سطح سمندر سے ۵۹۴۴ فٹ مرتفع مقام پر آباد ہے اس کی جدید آبادی راجہ کے شاندار اور خوبصورت اسم باسمی چندر محل کے اطراف سلیقہ سے بسائی گئی ہے اس چھوٹی سی مگر خوشنما آبادی میں صاف و شفاف پانی ایک باؤلی پر پمپ لگا کر نل کے ذریعہ پہونچایا جاتا ہے اور بجلی کی روشنی بھی ہوتی ہے سڑکیں اگرچہ مورمی ہیں مگر صاف ستھری ہیں عوام کے مکانات گو چھوٹے چھوٹے ہیں لیکن باہر سے خوش وضع معلوم ہوتے ہیں کہ اجازت تعمیر مکان دیتے ہوئے باہر کے ایلیویشن کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

راجہ صاحب کے عالی شان چندر محل کے علاوہ یہاں ایک بڑا دو منزلہ گسٹ ہوس ہے ایک پختہ مسافر خانہ ہے ڈاکٹر خانہ کی پختہ تعمیر ہے مدرسہ وسطانیہ ہے اسٹیٹ کے دفاتر کی عمدہ پکی عمارت ہے یہ سب جدید ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ دینکٹ لچھما راؤ المخاطب بہ ناظام نواز ونت بہادر آنجہانی جو ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۲ء تک یہاں کے راجہ رہے پسند اور تزئین آبادی کے شائق تھے اور مولوی محمد علی صاحب اعلیٰ عہدہ دار اسٹیٹ کا تجربہ سلیقہ و تمیز جو انھوں نے سرکار عالی کی ملازمت میں عہدہ داران سرکار عالی سے حاصل کیا اسٹیٹ کے لئے بڑا مفید رہا صاحب موصوف ۱۹۳۱ء سے یہاں کار فرما ہیں اور تحصیلداری تبدیلی کرتے ہوئے اسٹیٹ کی سب سے بڑی خدمت پر اس وقت مامور اور جس طرح والی اسٹیٹ کی نظروں میں باوقعت رہے۔ اسی طرح عوام میں ہر دل عزیز ہیں۔

اس سمستان کے ۶۰ مواضع اور ۲۰ مزرعے ہیں جو بہ استثنا ایک موضع چیٹیال کے باقی سب ایک ہی سلسلہ میں واقع ہیں البتہ شمال میں سمستان ونپرتی اور گوپال پیٹھ یا زبردست خاں کی جاگیر کے ۳۔۴ مواضع اس علاقہ میں آگئے ہیں۔ اس سمستان کے مغرب میں تعلقہ عالم پور ضلع رائچور اور علاقہ سمستان ونپرتی ہے (ونپرتی بھی ہمارے ہی علاقہ کا سمستان ہے) مشرق میں دریائے کرشنا اور سرحد تعلقہ امرآباد ضلع محبوب نگر۔ جنوب میں دریائے کرشنا اور شمال میں تعلقہ ناگر کرنول ضلع محبوب نگر ہے۔ سمستان کی سالانہ آمدنی پانچ لاکھ ہے جس کے منجملہ کوئی ... ہزار طبابت، تعلیمات، آبرسانی، الکٹرک، سڑک کی ترمیم و نگہداشت اور خیرات مبرات میں خرچ کئے جاتے ہیں۔ بمقابلہ آمدنی ان مدات میں (تقریباً) صرف ۶ فیصد مصارف یقیناً ناکافی ہیں ... ہزار میں بھی تعلیمات کا حصہ کل ... اور طبابت کا ... ہے جو بہت ہی کم ہے لیکن یہ اطمینان بخش ہے کہ اسٹیٹ ہر حال ترقی کے لئے کوشاں ہے چنانچہ حال میں ... کے صرفہ سے ڈاکٹر خانہ کی عمارت بنائی گئی ہے مدرسہ وسطانیہ کی تعمیر میں ... ہزار صرف کئے گئے تزئین آبادی کے ساعی بھی حال کی پیداوار ہے برقی روشنی اور نل کے ذریعہ آب رسانی بھی یہاں جدید چیزیں ہیں۔

کولاپور کے مغرب میں آبادی سے کچھ ذرا سا ہٹا ہوا ایک وسیع ہموار میدان ہے یہ گویا یہاں کا فسیح میدان ہے۔ جو پولو، کرکٹ اور اسپورٹس کے کام آتا ہے راجہ صاحب آنجہانی کے داماد اور فرزند کو ایسے مردانہ کھیلوں کا شوق رہا ہے۔ اس میدان کے کنارے ایک دو منزلہ بنگلہ ہے جو بالعموم گسٹ ہوس اور دسہرہ وغیرہ کے موقع پر پویلین کا کام دیتا ہے اس بنگلہ سے سامنے کا یہ وسیع میدان اور سر سبز جنگل اور پہاڑ پر لطف منظر ہے۔

... کے مشرق میں اسٹیٹ کا ایک باغ میوہ اور پھولوں سے لدا ہوا ہے جس کے بیچوں بیچ سندر محل اسم بامسمیٰ ہے۔

سے رس
اس کی تعمیر ۱۳۱۷ف میں ہوئی۔ ڈاکٹر خانہ کی پختہ عمارت جس کی بنا مسز گرانٹن (اہلیہ صدر ناظم و معتمد مال حکومت سرکار عالی) نے ۹ اردی بہشت ۱۳۳۵ف کو رکھی اور جس کا افتتاح ۲ شہریور ۱۳۳۷ف کو ہوا ضرورت مقامی کے لئے ایک مکمل عمارت ہے اس کا نقشہ ناظم صاحب طبابت سرکار عالی نے دیا تھا۔ اس عمارت میں زنانہ اور مردانہ مریضوں کے لئے علحدہ علحدہ وارڈ ہیں۔ ادویات اور آلات جراحی کا کافی ذخیرہ ہے سند یافتہ ڈاکٹر مامور ہیں اور خوبی کی یہ بات ہے کہ دواؤں کا موازنہ جو عوام کے لئے ہے محل کی ضروریات سے متاثر نہیں ہونے پاتا بلکہ ڈیوڑھی کے ادویہ کا خرچ محل ہی کے موازنہ سے پورا ہوتا ہے۔

راجہ صاحب کے محل کے شمالی و مشرقی گوشہ پر دو ہاتھیوں کا تھان پر جھوم ہاتھی دار صدر دروازہ پر رسالہ کے باڈی گارڈ سپاہی کا ہاتھ میں برچھا لئے پہرہ دینا۔ اس دروازے کے مقابل ہی خوبصورت برجی میں برنجی گھڑیال دروازہ کے منزل بالا پر نوبت و نقارہ مشرقی امرا کے شان کا ایک پر رعب و پر جلال منظر ہے اس صدر دروازہ سے داخل ہونے پر سیدھے طرف ایک مختصر سے چمن کے وسط میں سربجی راجہ وینکٹ لچھما راؤ نظام نواز ونت بہادر کا تپلا (اسٹیچو) ہے جس کے پائین کتبہ لگا ہے جس سے واضح ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء اور تاریخ وفات ۵ اپریل ۱۹۲۵ء م ۱۱ خورداد ۱۳۳۴ف ہے۔ حکومت سرکار عالی کی منظوری کے بعد یہ ۶ مارچ ۱۸۸۷ء (مطابق ۳ فروردی ۱۲۹۶ف) کو اس علاقہ کے راجہ ہوئے۔

جو حالات سنے گئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجہانی راجہ بڑے شکاری تھے۔ ۲۹ شیر دو بونچا اور ۲۹ تیچھ مارے ہیں۔ شکار اور شکاریوں کی تاریخ میں یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ ۶ ستمبر ۱۹۲۲ء کو راجہ صاحب نے سوا گھنٹہ کے اندر ۵ شیر مارے۔ ان میں جہاں سپاہیانہ جوہر نظر آتے ہیں۔ وہیں انتظامی قابلیت بھی عیاں ہوتی ہے۔ اسٹیٹ کی موجودہ ترقیاں انہی کے عہد سے شروع ہوئی ہیں اب انہی کی رانی صاحبہ سربجی وینکٹ رتنما جو ویل واڑہ تعلقہ سرسلہ ضلع کریم نگر کے دیسائی کی صاحبزادی ہیں اسٹیٹ کے کاموں کی نگران ہیں اور باوجودیکہ گوشہ کی سخت پابند ہیں حتیٰ کہ ان کے اعلیٰ عہدہ دار بھی انھیں بے پردہ نہیں دیکھ سکے پھر بھی اسٹیٹ کا انتظام خوبی سے کرتی ہیں۔

کیا میں اس موقع پر کہہ سکتا ہوں کہ گوشہ اور پردہ کو جو تجدد پسند ترقی و انتظام دنیوی میں حارج سمجھتے ہیں وہ اس متار جائداد پردہ نشین ہندو رانی کے عمل کو دیکھیں۔ میں نے محترمہ بیگم صاحبہ سر بلند جنگ کا ایک مضمون کسی اخبار میں چند دن قبل پڑھا تھا جس میں موصوفہ نے بعض بڑے گھرانوں کی بیگمات کے نام گنائے تھے کہ وہ باوجود پردے میں رہنے کے کامیابی کے ساتھ اپنے وسیع علاقہ کا انتظام کرتی ہیں ان مثالوں میں رانی سربجی وینکٹ رتنما صاحبہ کے نام کا اضافہ کر لینا چاہیئے۔

ہم راجہ صاحب کے محل کا ذکر کر رہے تھے جس کے صدر دروازے سے داخل ہونے کے بعد آنجہانی راجہ صاحب کے اسٹیچو (تپلے) کے سلسلے میں ان کے اور ان کی رانی صاحبہ کے کچھ حالات لکھ دیئے اس محل کو جو چندر محل سے موسوم ہے ۱۸۰۷ء میں راجہ وینکٹ جگناتھ راؤ نے بنوایا۔ یہ ایک قدیم وضع کی عمارت بڑے بڑے فیل پایوں پر ہے اس کی دیواریں کسی قلعہ کی فصیل معلوم ہوتی ہیں اسی محل پر راجہ وینکٹ لچھما راؤ نے ایک اور منزل ۱۲۹۹ف میں بڑھائی اور ۱۳۲۵ف میں اسی کے عقب وجیا محل کے نام سے زنانی حصہ تعمیر کرایا۔

بہت بڑے کمپونڈ میں بلند و بالا عمارات کا تسلسل جیلیوں دریچے اور دروازے متعدد برآمدے اور شاہ نشین سے

مکین کی شوکت و حشمت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس احاطہ میں آنے کے بعد یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ ہم تین ہزار کی مردم شماری والے قصبہ میں ہیں بلکہ گمان ہوتا ہے کہ دفعتہً حیدرآباد جیسے بلدۃ الامرا میں کسی بڑے امیر کی ڈیوڑھی میں پہونچ گئے۔ چندر محل کے شان دار ڈرائینگ روم میں جس کے فرش و فرنیچر اور دیواروں پر راجہ نظام نواز ونت آنجہانی کے شکار کئے ہوئے جنگلی جانوروں کی کھالیں مختلف طرح پر بچھی یا لٹکی ہوئی تھیں ہم نے دو تصویروں کو بڑی دیر تک دیکھا۔ ان میں سے ایک تو راجہ وینکٹ جگنا تھ راؤ آنجہانی کی تھی جو بڑا سا پگڑ باندھے، انگرکھا پہنے، کندھے پر نالا لٹکائے تلوار ہاتھ میں تھامے پہچی بنے کھڑے ہیں دوسری انہی کے ہم نام انہی کے نوجوان پوتے کی جو سوٹ بوٹ میں ملبوس یوروپین وضع قطع بنائے مسکرا رہے ہیں۔ یہ دونوں تصویریں تبدیل لباس، تبدیل مذاق، تبدیل وضع کی معاشرتی تاریخ آنکھوں کے سامنے پیش کرتی ہیں۔

یہاں کی عمارتوں میں بہم رسانی قوت برقی کا مکان (پاور ہوس) بھی قابل ذکر ہے۔ اس مکان میں جو بالکل تجارتی اصول پر بقدر ضرورت اور سستے اصول میں بنایا گیا ہے۔ دو مشین لگے ہیں ایک (۲۰) گھوڑوں کی طاقت کا دوسرا اس کا نصف اس کے ذریعہ محل میں روشنی اور پنکھے دن رات اور عوام کے لئے سر مغرب سے ۹ بجے شب تک چلتے ہیں۔ آٹے کی دو چکیاں اور تیل کے دو گھانے کام کرتے ہیں تیل کے گھانوں کو روزآنہ پانچ روپے پرگتہ دے رکھا ہے۔ چاول چھوڑنے کا مشین بھی لگایا ہے مگر یہ مشین ابھی چالو نہیں کیا گیا آب رسانی کے لئے پانی بہیں کی برقی قوت سے کھینچا جاتا ہے۔ جو مشین باؤلی پر لگا ہے وہ ۲۴ ہزار گیالن روزآنہ کھینچ سکتا ہے مگر موسم گرما میں یہاں صرف ۱۰ ہزار گیالن تک پانی خرچ ہوتا ہے۔ کیونکہ پانی مقررہ اوقات پر کھولا جاتا ہے۔ اس لئے باؤلیوں کا استعمال بھی جاری ہے۔

آخری راجہ وینکٹ لچھما راؤ نظام نواز ونت بہادر متوفی کو صلبی دو لڑکیاں ہیں چونکہ اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس لئے وینکٹ جگنا تھ راؤ کو متبنیٰ لیا ہے یہ ۱۳۲۶ف میں پیدا ہوئے ۹ر تیر ۱۳۳۹ف کو ان کی شادی اندرا دیوا سے ہوئی۔ جو نظام نواز ونت بہادر کی چھوٹی صاحبزادی سرسوتی دیوی کی دختر ہیں یہ نوجوان پسر بھی اپنے سپاہی منش متبنیٰ پدر کی طرح شکار اور مردانہ کھیلوں کے شایق ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس چھوٹی سی عمر میں ۱۰ شیر انھوں نے شکار کئے ہیں۔

متوفی راجہ صاحب کی بڑی صاحبزادی راجیشورا راجہ صاحب تیپرول کو ۱۳۱۸ف میں بیاہی گئی ہیں اور دوسرے جن کا نام سرسوتی دیوی ہے وینکٹ کرشنا راؤ زمیندار پرنا پور کو دی گئی جو افسوس کہ عالم جوانی میں بیوہ ہو گئیں ان کے شوہر پرواز کے بڑے شوقین تھے چنانچہ کولاپور سے مدراس کو پرواز کرتے ہوئے ۲۵ر اگست ۱۹۳۲ء کو طیارہ کے ٹوٹنے سے گر کے مر گئے۔ کولاپور کر گسٹ ہوس کے متصل ایک سنگی ستون ان کی بیوہ رانی کی طرف سے لگایا گیا ہے جس کی عبارت ان دونوں میاں بیوی کی محبت کی خاموش داستان ہے۔

اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں اپنی اس آرزو کا اظہار کرتا ہوں جو رہ رہ کر میرے دل میں پیدا ہوتی ہے کہ کاش ہمارے ملک کے سارے جاگیرات خصوصاً بڑے بڑے علاقوں کا انتظام ایسا ہی ہوتا ہم یہ نہیں کہتے کہ سمستان جٹ پول میں ساری ترقیاں ہو چکی ہیں نہیں۔ بلکہ جس حد تک بھی یہاں ترقی کی گئی ہے۔ وہ بحالت موجودہ بھی دوسرے جاگیری علاقوں کے لئے قابل تقلید ہے۔

ابوظفر مؤید الدین حسن فاروقی

# ایک سیر میر محمود صاحبؒ کی پہاڑی پر

میر محمود صاحبؒ کی پہاڑی ہمارے وطن میں ایک مشہور مقام ہے۔ میر عالم کے تالاب کے کنارے ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے اور اس پر اُن بزرگ کی درگاہ بنی ہوئی ہے۔ درگاہ کے اس طرف گھنا جنگل ہے جہاں ہماری پردہ نشین خواتین نہایت خوشی سے اپنے بال بچوں کے ساتھ تفریح مناتی ہیں جس طرح عام دستور ہے ہم لوگ کسی بزرگ کی ذات سے اتنا فائدہ نہیں اٹھاتے جتنا ان کی درگاہ سے اٹھاتے ہیں یہی حال اس درگاہ کا بھی ہے، لوگ اس پُرسکون اور خاموش مقام میں دنیا کی فکروں کو ایک بزرگ کے فیضِ صحبت سے روحانی چین میں مبدل کرنے کم آتے ہیں اور زیادہ تر اس لئے تکلیف فرماتے ہیں کہ تالاب کا لطف حاصل کیا جائے اور مناظر کی دلچسپیوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

ایک مرتبہ ہم اس مقام پر پہنچ گئے۔ موٹر سیکل پر سوار تھے خیال ہوا چلو آج اس مقام کی سیر کرلیں جس کی شہرت مدتوں سے سنتے آئے ہیں سرما کی تعطیلات تھیں، ٹھنڈا ٹھنڈا موسم نرم نرم دھوپ، نیلا نیلا آسمان فوراً موٹر سیکل تیز کی اور درگاہ کی طرف چلے۔ لوگ کہتے ہیں سیدھا راستہ چلنا چاہئے مگر بعض وقت راستہ گم کرنے اور اٹکل پر چلے جانے میں غیر معمولی لطف آتا ہے، خصوصاً ایسے وقت جب کہ فطرت اور اس کے اسرار کے سوا کوئی رہنما نہ ہو۔ ہماری نظر پہاڑی کی طرف تھی مگر راستہ بالکل اس کی مخالف سمت نظر آرہا تھا۔ پیدل ہوتے تو دور نکل جانے کا خوف ہوتا مگر جب "پیٹ بھری" موٹر سیکل ہو (آپ پیٹ بھری کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے) تو اور ہمت بڑھتی ہے۔ ہم دیکھتے رہے پہاڑی کی طرف اور چلتے رہے دوسری طرف راستہ پیچیدہ تھا ایک شاعر کو جو معشوق کی زلفوں کے پیچ و خم دیکھ چکا ہو بھلا راستے کی پیچیدگی کیا ستا سکتی؟ ہم سبز درختوں کی چھاؤں چھاؤں چلتے ہی رہے۔ بڑی دیر کے بعد منزلِ مقصود آئی پہاڑ کے دامن میں پہنچے، موٹر سیکل گرم ہو چکی تھی، ہم نے کچھ اس خیال سے کہ پہاڑ پر جا کر آئے تک کہیں یہ غائب نہ ہو جائے اور کچھ اس لئے کہ گھنے سائے میں اس کی گرمی دور ہو گی اسے شاداب جھاڑیوں کے اندر کھڑا کر دیا اور اوپر کی طرف چلے۔ جنگل، ساگوان کے درخت، پرندوں کے چہچہے، ٹھنڈی ہوائیں اور دس بجے کی نرم دھوپ بڑا روپ دکھا رہی تھی، ہم نے خیال کیا کہ سب سے پہلے بزرگ کے مزار پر فاتحہ پڑھ لینی چاہئے۔ معاف کیجئے ہم ذرا مذہبی قسم کے آدمی ہیں فوراً جیب میں ہاتھ پہنچ گیا کہ دیکھیں پھولوں اور خیرات کے لئے کھلے پیسے ہیں بھی یا نہیں یارے ایک اٹھنی نکلی ورنہ ہر موٹر سوار کی جیب سے پیسوں سے زیادہ روپیوں کی جھنکار آتی ہے راستہ بائیں طرف کو مڑتا تھا ہم اپنی وطنی خاکساری کے ساتھ سر جھکائے زمین جھلکتے چلے جا رہے تھے۔ یکایک اوپر جو نظر پڑی تو دیکھتے کیا ہیں کہ دو فرلانگ تک اونچا راستہ ہے سیڑھیوں کی قطار ہے اور اوپر بزرگ کا مزار نظر آرہا ہے۔ فوراً دل پر اثر ہوا۔ ہم نے خیال کیا کہ سچ ہے روح کی بلندی بہ حال قائم رہتی ہے۔ ہم نے سیڑھیاں چڑھنی شروع کیں اوپر پہنچنے تک برا حال ہو گیا سب سے زیادہ تکلیف ہمارے پیٹ کو پہنچی کیونکہ ہمارا پیٹ کسی قدر گول ہے! درگاہ کے چبوترے پر پہنچنے کے بعد ایک قدیم روایت یاد آگئی۔ یہاں کے متعلق مشہور ہے کہ کسی بزرگ کی بددعا سے اس درگاہ کے تین گوشے آباد ہیں اور ایک ویران۔ ہم نے بڑے شوق سے اس کی توثیق کرنی چاہی گوشوں کی آبادی کا حال سنئے دو چار بکریاں، آٹھ دس کبوتر، تھوڑی سی عدم صفائی اور ایک حافظ صاحب! ویرانی کی طرف عمارت شکستہ اور کچھ نہیں۔ بہر حال ہم نے درگاہ کا ایک معتقدانہ طواف کیا اور درمیانی گنبد کے نیچے مزار کی ایک جانب بیٹھ گئے۔ تکان اور مراقبے میں ایک روحانی تعلق معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس وقت

کسی نہ کسی کیف میں ڈوب گئے اور آنکھیں بند کرلیں یقین مانئے ایسا معلوم ہوا ہم کسی اعلیٰ مقام میں پہنچ گئے ہیں۔ سوائے رنگینیوں کے کچھ نظر نہ آرہا تھا، مگر تموجات کی زد دل پر پڑ رہی تھی۔ ایسے وقت میں قرآن مجید بہت جلد یاد آتا ہے ہم نے قرآن خوانی اور درود پڑھنا شروع کیا جس وقت ہم پہنچے تھے تو دس بج کر بیس منٹ ہوئے تھے جب آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ بارہ بج گئے ہیں ہم نے کہا خوب اصحاب کہف کی نیند کا ایک جھولکا ہم نے بھی دیکھ لیا۔ آنکھ کھلتے ہی پھر وہی پیٹ کی تکلیف بھوک محسوس ہوی اور بری طرح محسوس ہوی۔ درگاہ کے باہر نکلے نہ تھے کہ ایک بزرگ صورت فقیر نے ہمارے سامنے قدرتی باغ کی ایک ڈالی پیش کی کچھ سیتاپھل، کچھ موز، عمدہ بیر، دو چار جام، ایک سنگترہ بیچ میں پھولوں کا ایک گلدستہ ہم نے بزرگ کو حیرت سے دیکھا اور کہا حضرت آپ کون ہیں یہہ کیا ہے؟ کوئی تحفہ تو نہیں ہمیں یہہ محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے ذریعے غیبی امداد دی جا رہی ہے۔ انھوں نے فرمایا "جی ہاں تحفہ ہے غریب کا لے لیجئے"۔ ہم نے یہہ تحفہ فوراً پیٹ میں اتار لیا اور آگے بڑھے۔ جس وقت ہم چلے تو بزرگ نے ہماری طرف غور سے دیکھا ہم نے بھی انھیں غور سے دیکھا تھوڑی دور نکل جانے کے بعد خیال ہوا کہ انھیں کچھ پیسے دیدینے چاہیں۔ ہم نے جیب ٹٹولا تو اس میں نہ چوانی نہ دوانی نہ پیسہ سب روپے آپ ہی خیال کیجئے کتنی ندامت ہوی ہوگی۔ بھلا غریب کو ایک روپیہ کیسے دے دیا جائے؟ ہم سوچ ہی رہے تھے کہ بزرگ نے کہا "میں آپ کی مشکل سمجھ گیا، تکلیف نہ کیجئے۔ اِدھر آئیے میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں"۔

اُن کے ساتھ چلتے ہوے سچ جانئے ہمیں کچھ خوف ہونے لگا کیونکہ اس جنگل میں سوائے اُن کے اور میرے کوئی نہ تھا۔ ہاں ایک تکلیف دہ ساتھی تھا جو عجیب و غریب طریقے سے ہماری رفاقت کر رہا تھا اور یہہ کوّا تھا۔ کم بخت ہمارے ساتھ ساتھ ڈالی ڈالی اڑتا اور برابر کائیں کائیں کیا جا رہا تھا۔ ایک آدھ میل چلنے کے بعد تالاب کا کنارہ آیا۔ قدرت کا سُہانا پن عجیب لطف دے رہا تھا۔ ہم پانی کے کنارے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے قریب ہی ایک جھونپڑی نظر آئی۔ ہم اور وہ بزرگ دونوں خاموش تھے کہ یکایک فضا میں ایک دوشیزہ آواز بلند ہوی "ابا جان کھانا تیار ہے" ہم نے چونک کے اِدھر اُدھر دیکھا کچھ نہیں جھونپڑی کے دروازے پر نظر پڑی۔ ایک رنگین اجالا ایک چمکتی پیشانی ایک چاندی سی کلائی اور تارے جیسی ایک آنکھ۔ ہم نے فوراً درود پڑھا اور کہا "جل جلالہٗ"۔

ہر حسن کار حسن کو بڑا مقدس سمجھتا ہے، ہم نے اس وقت یہہ محسوس کیا کہ اس نازنین کی صدا سن کر ہمارا درگاہی تقدس کچھ دور جا پڑا ہے۔ ہم نے دماغ پر زور ڈال کے سوچنا شروع کیا کہ کسی طرح اس برق تجلی کی پوری زد میں آنا چاہیے۔ ہم نے کچھ کھانس کے کچھ بزرگ کی طرف دیکھ کے ایک سوال کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ انھوں نے فرمایا "میاں چلو، کھانا کھالیں، ہم نے کہا بسم اللہ، اور موصوف سے پہلے کٹیا میں پہنچ گئے۔ ایک نازنین ہاتھ نے سلام کیا ہم نے دعا تو نہیں، سلام ہی کا جواب دیا اور بیٹھ گئے۔ سریلی آواز پھر بلند ہوی۔ جناب ہم غریب ہیں، کھانا پسند نہ آئے گا۔ ہم نے کہا۔ "جناب۔ نہیں جنابہ! آپ کیا کہتی ہیں۔ اس وقت بھوک کی شدت ہے، اور یہہ کھانا من و سلویٰ معلوم ہو رہا ہے" کھانا کھانے تک وہ توبہ شکن نظارہ آنکھوں کے سامنے ہی رہا۔ پندرہ منٹ گذرے ہوں گے کہ خدا حافظ کہنا پڑا ہم بادلِ ناخواستہ باہر نکلے۔ اتنے میں اُس نازنین نے مجھے آواز دی قریب بلوا کے ایک بلور جس پر دھاریاں تھیں میرے ہاتھ پر رکھا "ابا جان نے دیا ہے، اِسے اپنے قلمدان میں رکھا کیجئے"۔ ہم نے اس تحفے کو سر آنکھوں پر لیا اور شکریہ کر کے چلے ہم تنہا تھے راستہ بڑی مشکل سے طے ہو رہا تھا۔ روحانی دنیا میں محبت کی چاشنی!

شاید یہ لطف جنت ہی میں حاصل ہو یا نہ ہو؟ ایک درخت کے نیچے ہم نے دیکھا کہ پگڈنڈی پر دھوپ کی طرف ایک بڑا سیاہ بچھو چلا جارہا ہے ہماری نظر اس پر اس وقت پڑی جب کہ ہم اس پر پاؤں رکھنے ہی والے تھے۔ ہم دور اچھل پڑے اور بچھو کو بہت غور سے دیکھنا شروع کیا چپٹی بچھو تھا جسم پر بڑے بڑے بال تھے اور ڈنکوں کی طرف دو بڑے سیاہ پیسے ۔ اس کی جسامت بڑی ہتیلی کے برابر ہوگی ۔ تماشا دیکھئے جوں ہی ہماری نظر اس پر پڑی بچھو اس طرح تلملا اٹھا جیسے اسے کسی تیز اور گرم سیخ سے چرکا دیا گیا ہے۔ وہ سکڑنے لگا اور ایک دو منٹ میں سکڑ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ ہم نے دس منٹ تک اس کے چلنے کا انتظار کیا مگر وہ مردہ پڑا ہوا تھا ہم نے ایک بڑی لکڑی لے کر دور سے اسے چھیڑا مگر وہ مرچکا تھا! ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم اس تحفے کو ایک بڑے پتے پر اٹھا کر گھر لے آئے' دو گھنٹوں میں وہ پانی پانی ہو گیا۔ اب ہم کو میر محمود صاحبؒ کی پہاڑی کے دو تحفے اکثر یاد آتے ہیں۔ ایک تو اب تک قلمدان سے زیادہ دل میں ہے' اور دوسرا حافظے کی دنیا میں' ہماری سمجھ میں نہ آسکا کہ اس پہاڑی پر ہم کو یہ تحفے کیوں ملے۔

محمد عبدالقیوم خاں باقی

# نیا پل اور شام

شام کی سندر فضا میں دور کی تنویر ہے ۔۔۔ خوابِ دوشیزہ کی میرے سامنے تصویر ہے
ہر طرف طوفانِ نغمہ ہر طرف طغیانِ نور ۔۔۔ حضرتِ انساں کی سرگرمی میں گم شورِ طیور
نور کی سرگرمیوں میں غرق ایوانِ بلند ۔۔۔ شام کی دیوی نے بڑھ کر پھینک دی اپنی کمند
گنبدوں پر نور کی پرچھائیاں ہیں پربہار ۔۔۔ اور فضا پر چھا گیا ہے نور و ظلمت کا غبار
اِک طرف تعمیرِ عدل[1] و اِک طرف دارالشفا[2] ۔۔۔ دُور پر اک مدرسہ[3] ہے نیند میں کھویا ہوا
سامنے دارالکتب[4] کی دل نشیں تعمیر ہے ۔۔۔ جس کی خشت و گِل میں عقل و ہوش کی تخمیر ہے
رُودِ موسیٰ پر نیا پل دہر کی تصویر ہے ۔۔۔ جس کی دو رنگی میں دونوں دور کی تعبیر ہے

ایسے خوش منظر میں میری ذات ہی کھوئی ہوئی
جاگتی ہے آنکھ اور تقدیر ہے سوئی ہوئی

سید محمد اکبر وفاقانی

---

[1] عدالت العالیہ ۔ [2] عثمانیہ دواخانہ ۔ [3] کلیۂ بلدہ ۔ [4] کتب خانہ آصفیہ ۔



صاحبزادہ محمد علی خان میکش



خواجہ حمید الدین شاہد

# قطب شاہی مقبروں میں ایک شام

جھٹپٹے کا وقت ہے دھندلی فضا میں آگیا
طائروں کی آشیانوں میں چہچہائیں ہیں ابھی

اپنے جوبن پر جمالِ ماہتاب آیا نہیں
چشمِ گیتی کے لیے پیغامِ خواب آیا نہیں

نیم بیداری کا پردہ ہے سنہرے خواب پہ
جیسے کشتی کھے رہا ہو کوئی سطحِ آب پر

ہے اندھیرے کا اجالا مقبروں میں پرفشاں
شامِ گورستان پر ہے صبحِ کاذب کا گماں

قطب شاہی گنبدوں میں گھومتے پھرتے ہیں ہم
ہر نظر کھوئی ہوئی ہے جھومتے پھرتے ہیں ہم

اس سکوں آباد میں دنیا کی الجھن لائے ہیں
چند مُردے آج زندوں کے جہاں میں آئے ہیں

آنسوؤں سے گنبدوں کا فرش دھونے کے لئے
لب پہ آتا ہے تبسم بھی تو رونے کے لئے

آبِ گنگا کی طرح شفاف ہے ہر مقبرہ
پرتوِ خلدِ بریں ہے، صاف ہے ہر مقبرہ

ان کے معماروں نے لیپا ہے انھیں کافور میں
کی ہے یا تعمیر، کوثر کو ملا کر نور میں

ان کو شاعر کی زباں میں فطرتِ انساں کہوں
قلبِ پیغمبر کہوں یا جلوۂ یزداں کہوں

اس مقدس سرزمیں پر اور تو آئے غضب
قہقہے اور مقبروں میں بیٹھ کر اے بے ادب!

خلد اور تیری نگاہیں، طور اور تیرے قدم
کیا نہیں تجھ کو حیا، نا آشنائے بیش و کم!

جذبۂ احساس کو کیوں رائیگاں کرتا ہے تو
کیا شعاعِ مہر سے خوش فعلیاں کرتا ہے تو

میکش

# بچوں سے

خدا کے فضل سے سب رس کا پہلا سال اچھا گذرا۔ خدا سب رس کے بھائیوں اور بہنوں کو یہ نیا سال مبارک کرے اور ان میں نیک کاموں کی توفیق دے۔ حب وطن کا جذبہ پیدا کرے اور اپنے لوگوں کی ہمدردی اور بھلائی کے خیالات ان کے دل میں موجزن ہوں۔ اسی خیال سے دوسرے سال کا پہلا شمارہ دکن ہی سے متعلق معلومات اور مضمونوں کے لیے وقف کر دیا گیا ہے تاکہ ہم سب اپنے ملک اور اس کی دلچسپیوں سے پوری طرح واقف ہو جائیں۔

اس سال سے سب رس کو اور بھی ترقی دینے کا خیال ہے۔ آئندہ اس میں اچھے اچھے مضمون، نظمیں، قصے، کہانیاں، لطیفے، پہیلیاں وغیرہ چھپا کریں گے۔ اس پرچہ میں کئی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ آئندہ بھی اس کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ہمارا رسالہ اسی وقت زیادہ مقبول ہو سکتا ہے جب کہ ہم میں کا ہر ایک ایک خریدار بڑھائے اور جب ہی سب رس کے مضمون اور خوبیوں میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اچھا تو ہم اپنے بھائیوں اور بہنوں کے خطوں کا انتظار کریں گے۔ جو سب سے زیادہ خریدار بنائیں گے ان کو انعام میں اچھی سی کتابیں دی جائیں گی۔

دسمبر کے پرچہ میں غلام مجتبیٰ قمر کا بھیجا ہوا معمہ شائع کیا گیا تھا۔ اس کے حل اب تک برابر وصول ہو رہے ہیں۔ مگر ہم نے انہی بچوں اور بچیوں کے حل کو شمار کیا جو سب رس کے خریدار ہیں ان میں سے حسب ذیل کے حل صحیح نکلے :- محمد معین الدین جنیدی (گلبرگہ)، احسن الدین شیلی (سٹی کالج)، حفیظہ اشرف (سٹی کالج)، سید اسمٰعیل (سٹی کالج)، محمد مظفر الدین (چادر گھاٹ ہائی اسکول)، مس بی فخر الدین (سیف آباد)، ابو الحسن صدیقی، زہرہ ہاشم علی (محبوبیہ گرلز اسکول)، حبیب بخش (سٹی کالج)، سید شاہ اشرف (ناندیڑ)، غوث محی الدین (گلبرگہ)، شبیر حسین (کنڈ روڈی)، شاہجہاں (محبوبیہ گرلز اسکول)، معصوم رام پرشاد (یاقوت پورہ)، احمد علی بیگ (بانڈ گاؤں)، ذاکر حسین (سٹی کالج)، بنارسی لال (سٹی کالج)، کالی چرن گپتا (سٹی کالج)، محمد حفیظ علی (ظہیر آباد)، سعد الدین احمد (سٹی کالج)، اعجاز علی (گرامر اسکول)، منور حسین (سٹی کالج)، رگھو سوامی (سٹی کالج)، وحید عطاری (سٹی کالج)، عبد الباسط (سٹی کالج)، غضنفر علی (سٹی کالج)، الطاف علی (سٹی کالج)، سید اکبر اعظم (سٹی کالج)، آنسہ مہر اقبال (عثمان آباد)، بتول (محسن آباد)، عبد الحکیم قریشی۔

قرعہ اندازی کے بعد وحید عطاری انعام کے مستحق قرار پائے اس لیے غلام مجتبیٰ قمر کی دی ہوئی کتاب انہیں انعام میں دی گئی ہے۔ وہ دفتر سے حاصل کر لیں۔

معمہ کا صحیح حل یہ ہے :- (۱) اُردو (۲) شمع (۳) سب رس (۴) کولمبس (۵) اطفال (۶) گول گنبد (۷) نالمیہ (۸) مصطفیٰ کمال (۹) چاند سلطانہ (۱۰) سلطان العلوم۔

ہم غلام مجتبیٰ صاحب قمر کے ممنون ہیں کہ انھوں نے انعام دے کر سب ہی بھائیوں اور بہنوں کے شوق اور ہمت کو بڑھایا۔

معین الدین احمد انصاری

## (معمہ دکن انعامی)

اشارے آڑے

۱۔ دکن کا ایک تالاب۔ ۲۔ دکن کا ایک دریا۔ ۳۔ دکن کی ایک خوبصورت اور مشہور تفریح گاہ۔ ۴۔ دکن کے ایک ضلع کا نام۔ ۵۔ دکن کی ایک عالیشان عمارت۔ ۶۔ دکن کا ایک پرانا قلعہ۔ ۷۔ دکن کا ایک عالیشان کالج۔ ۸۔ دکن کی ایک قطب شاہی مشہور خوبصورت عمارت۔ ۹۔ دکن کا ایک ادارہ جو اردو زبان کی خاص خدمت کرتا ہے۔

ضروری نوٹ :-

۱۔ اس معمہ کے صحیح حل کرنے والے کو ایک عمدہ کتاب جس میں ۲۴ صفحات ہوں گے دی جائے گی نیز اس کتاب میں (۲) بچوں کی فوٹو بھی ہوں گی۔ ۲۔ اگر ایک سے زیادہ احباب انعام کے مستحق ہوں گے تو قرعہ اندازی سے اس کا تصفیہ کیا جائے گا۔ ۳۔ صحیح حل مارچ ۱۹۳۹ء کے سب رس میں شائع ہوگا۔ ۴۔ اس معمہ کے حل وہی حضرات روانہ کریں جو اس رسالہ کے خریدار ہیں۔ اس معمہ کے حل ۲۰ فروری تک دفتر میں آ جائیں۔

| | | | | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | | ی | ر | ا | | | | | | |
| ۲ | | و | | ن | ا | | | | | |
| ۳ | ب | | غ | | ا | | | | | |
| ۴ | | ا | | پ | و | ر | | | | |
| ۵ | | ک | | م | س | | و | | | |
| ۶ | | و | | ک | ن | | ہ | | | |
| ۷ | | ٹ | | ک | | ل | ج | | | |
| ۸ | | ا | | م | | ن | ا | ر | | |
| ۹ | ا | | ب | ی | ا | | ا | | ہ | و |

# میرا وطن

یہ ہے حیدرآباد میرا وطن — نہ کیوں اس پہ صدقے کروں جان و تن
یہی میرے بابا کا بھی ہے وطن — یہی میری امی کا بھی ہے وطن
وطن جان و دل سے ہے مجھ کو عزیز — نہیں اس سے بڑھ کر مجھے کوئی چیز
اسی سرزمیں پر میں پیدا ہوا — یہیں پر ہوئی میری نشوونما
اسی آب و گل سے ہے میری سرشت — ہے اس کی محبت مری سرنوشت
اسی ملک میں میری آنکھیں کھلیں — ابھی ہوش میں نے سنبھالا یہیں
نہ کیوں چاہوں اس کو کہ اتنا بڑا — اسی خاک پر کھیل کر میں ہوا
اسی خاک میں ہیں ابھی تک یہاں — ہمارے بزرگوں کی بھی ہڈیاں
سدا ملک و مالک پہ تھے وہ فدا — کرے رحمتیں ان پہ نازل خدا
ذرا میرے دل سے تو پوچھے کوئی — کہ کیا قدر و قیمت ہے اس خاک کی
یہی اپنا ماویٰ ہے ملجا یہی — یہی دیر اپنا کلیسا یہی
جو ہو جاؤں گا میں قوی اور جواں — کروں گا وطن پر فدا اپنی جاں
بہت مجھ کو پیارا ہے میرا وطن — میں بلبل ہوں اس کا یہ میرا چمن
وطن پر جو آ جائے آفت کوئی — نہ پروا کروں اپنے سر کی ذری
سدا اپنے مالک کا اور ملک کا — بھلا چاہوں گا اور کروں گا بھلا
بھری ہوگی رگ رگ میں حب وطن — یہی ہے اب و جد کا میرے چلن
بہا دوں گا مٹی کے بدلے لہو — اسی میں شریفوں کی ہے آبرو

لطیف النساء بیگم

# نظام ساگر

مسئلہ آب پاشی تقریباً سارے ہندوستان میں دشوار ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں بارش کا اوسط بہت ہی کم ہے۔ البتہ صرف جون جولائی اور اگست میں موسمی ہواؤں کی بدولت تھوڑی بہت بارش ہو جاتی ہے۔ اور اس وجہ سے تالاب اور کنٹے چند دنوں کے لئے بھر جاتے ہیں لیکن پھر وہی کتے کی دم ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔ یعنی وہی آب پاشی کی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ انہیں مشکلات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمارے بادشاہ نے نظام ساگر کو اپنے ایک قابل چیف انجینیر نواب علی نواز جنگ بہادر کی نگرانی میں تعمیر کروایا۔ نظام ساگر کا شمار دنیا کے ان تالابوں میں ہوتا ہے۔ جن کو کہ ہم انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔

جس جگہ یہ تالاب ہے۔ اُس جگہ پہلے ہی سے ایک زبردست کنٹہ تھا۔ شاید قدرت کو پہلے ہی سے اس کا علم ہوگا کہ یہاں ایک عالیشان تالاب بننے والا ہے۔ اور صرف ایک بند بنا دینے سے اس کا وجود ہوگا جس کی بدولت ہزاروں خاندانوں کو روزی مل جاوے گی۔ اور کسانوں کے اُجڑے ہوئے کھیت جہاں کہ صرف الوؤں اور گیدڑوں کا بول بالا تھا۔ ہرے بھرے لہراتے ہوئے کھیتوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔

نظام ساگر دریائے مانجرا کو روک کر بنایا گیا ہے۔ کنٹہ تقریباً دو میل لمبا ہے۔ اور چوڑائی میں دو موٹریں آسانی سے ایک دوسرے کے بازو سے گذر سکتی ہیں۔ کنٹہ میں سولہ [16] دروازے ہیں۔ اور ہر ایک دروازے پر ایک تانبی ڈبہ (Balance Box) لگا ہوا ہے۔ جس کا وزن دروازے کے وزن سے دوگنا ہے۔ اور اس ڈبے سے ایک کو کھلا ڈنڈا (Lever) دوسرے دروازے کو جاتا ہے۔ جب کبھی پانی اپنی حد سے بڑھ جاتا ہے تو ایک پمپ کے ذریعے ایک بڑے ڈبے میں چلا جاتا ہے۔ جس کے اثر سے پہلا دروازہ کھل جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک دوسرے کے اثر سے تمام دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ صدر دروازے بھی ہیں جن کے کھول دینے پر پانی اطراف و اکناف کی زمینات کو سیراب کرتا ہے۔ جہاں مہینوں بارش نہیں ہوتی لیکن بارش کا کام نظام ساگر سے ہو جاتا ہے۔

تالاب کا رقبہ چھتیس مربع میل ہے۔ اس کا پتہ ہم کو اس سے چل سکتا ہے کہ نظام ساگر کے تعمیر ہونے سے پہلے اس جگہ چالیس دیہات آباد تھے۔ اور ابھی تک یہاں کے سادے دیہاتی اس رفاہ عام کے کام کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن پھر عقیدت سے سر جھکا دیتے ہیں۔ اور فوراً کہتے ہیں کہ "خدا ہمارے بادشاہ کے سایہ میں ہم کو اس سے زیادہ فائدہ پہنچائے"

جلال صدیقی

# ترانۂ دکن

سارے جہاں سے اچھا ملکِ دکن ہمارا — ہم باغباں ہیں اس کے یہ ہے چمن ہمارا
خدمت میں اس کی تن من دھن ہم فدا کریں گے — پھولےگا اور پھلےگا ہم سے دکن ہمارا
تنگ بھدرا اور کرشنا، گوداوری و موسیٰ — دریا ہیں یہ دکن کے جو ہے چمن ہمارا
ہو شیخ، یا برہمن، ہندو ہو یا مسلماں — ہیں ہاتھ، پیر اس کے وہ ہے بدن ہمارا
کیونکر نہ ہو محبت ہم کو وطن سے اپنے — ہے جان سے بھی بڑھ کر ہم کو وطن ہمارا
پروانہ ہو کے اس کی الفت میں مٹیں ہم — روشن رہے ہمیشہ شمعِ دکن ہمارا
حبِ وطن بسا ہو دل میں ہمارے یارب — چھوٹے نہ مرتے دم تک ہم سے وطن ہمارا

ہے یہ دعا متینؔ کی کرلے قبول یارب
قائم رہے الٰہی شاہِ دکن ہمارا

**مسیح الدین خاں متینؔ**

# حیدرآباد وطن ہے اپنا

عزیز سرسی بچو! آج میرا جی چاہتا ہے کہ تم سے اچھی اچھی باتیں کروں۔ تمھیں اپنی چیزوں کا حال سناؤں جن کو تم نے غالباً کئی مرتبہ لوگوں کو کہتے ہوئے سنا ہوگا لیکن تم نے اس کو ممکن ہے اچھی طرح نہ سمجھا ہو۔ سیکڑوں بار وطن کا لفظ سنا اور کتابوں میں دیکھا ہوگا مگر اس لفظ کے معنی اور اس کی اہمیت پر تمھیں کبھی غور کرنے کا موقع حاصل نہ ہوا ہوگا۔ اکثر تم نے ناموں کے ساتھ حیدرآبادی۔ ملیح آبادی۔ دہلوی۔ لکھنوی ضرور دیکھا ہوگا مگر اس کو معلوم کرنے کی کوشش نہ کی ہوگی کہ نام کے ساتھ یہ کیوں لکھے جاتے ہیں۔ کسی کے نام کے ساتھ کسی خاص شہر یا ملک کا نام کیوں لکھا ہوتا ہے!

اب ہم تمھیں اس کی وجہ بتاتے ہیں۔ تم کو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں جہاں ہم آباد ہیں۔ سیکڑوں ملک اور لاکھوں اور بھی انسان ہیں لیکن فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ کسی جگہ رہتے ہیں اور ہم کسی جگہ۔ ان کا ملک اور ان کی قوم جدا ہے ہمارا ملک اور ہماری قوم جدا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم جانتے ہو ہمارے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیاں جس طرح چھوٹی بڑی ہوتی ہیں۔ پانچ انگلیوں میں جس طرح فرق ہوتا ہے اسی طرح خدا نے دنیا میں ہر انسان، قوم اور ملک کو بھی جدا جدا پیدا کیا ہے۔ گو سب کو آگ اور مٹی ہی سے بنایا ہے لیکن جس طرح ایک آدمی دوسرے آدمی سے شکل و صورت میں جدا ہوتا ہے اسی طرح ان کی طرز زندگی لباس اور کھانے پینے میں بھی فرق ہوتا ہے۔ جس طرح سب انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں بالکل ویسے ہی ان کے ملک بھی مختلف ہوا کرتے ہیں۔

تمھیں یہ معلوم ہوگا کہ دنیا میں جتنے بھی لوگ ہیں وہ سب ایک ہی مقام پر پیدا نہیں ہوتے۔ مختلف لوگوں کی پیدائش کے مختلف مقامات ہوتے ہیں۔ کوئی کسی شہر میں پیدا ہوتا ہے تو کوئی کسی میں۔ جو شخص جس ملک میں پیدا ہوتا اور رہتا ہے اسی مقام کو اس کا وطن کہتے ہیں۔ اور اسی لئے وہ اپنے نام کے ساتھ اپنے پیدائشی وطن کا نام بھی لکھتا ہے تاکہ معلوم ہو جائے یہ شخص کس ملک کا رہنے والا ہے اس کا کون سا وطن ہے جیسے غالب دہلوی۔ جوش ملیح آبادی اقبال لاہوری۔ ولی دکنی۔ امجد حیدرآبادی۔ غالباً اب تم اچھی طرح واقف ہو گئے ہوں گے کہ ہم ریاست حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے ہیں اس لئے ہمارا وطن دکن ہے جیسا کہ فیض مرحوم جو ایک دکنی شاعر تھے انھوں نے کہا ہے

رشک "فردوس" "دکن" ہے اپنا

حیدرآباد "وطن" ہے اپنا

تمھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ خواہ انسان ہو یا درندے ان کو اپنی جائے سکونت یعنی جس کو عام طور پر گھر کہا جاتا ہے۔ بہت عزیز ہوتا ہے جب انسان دن میں کام سے تھک جاتا ہے تو وہ شام کے وقت آرام لینے اور اطمینان سے وقت گزارنے اپنے گھر واپس آتا ہے۔ ہر انسان کی خوشگوار زندگی اس کے مکان میں چھپی ہوتی ہیں محنت اور مسلسل مشقت کے بعد انسان کے لئے آرام لینا ضروری ہے اور وہ صرف مکان ہی میں حاصل ہوتا ہے تم جب دس سے چار بجے تک اسکول میں پڑھتے ہو اور اسکول برخاست ہونے کے بعد گھر واپس آتے ہو تو تم نے محسوس کیا ہوگا کہ مسلسل ایک جگہ بیٹھ کر پڑھنے لکھنے سے تمھاری طبیعت کچھ پست ہو جاتی ہے چہرہ بھی اترا ہوا رہتا ہے جب تم گھر پہنچتے ہو تو خوش ہو جاتے ہو۔

حب وطن یا وطن پرستی ایک اچھا اور شریفانہ جذبہ ہے۔ دنیا کے مشہور اور بڑے بڑے لوگوں کی سوانح حیات پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ

ان میں وطن پرستی کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔ وہ اپنے وطن کی عزت، وقار، آن، عظمت اور راج رکھنے کی خاطر اپنا گھربار، اپنی دولت اور اپنی زندگی قربان کر دیا کرتے تھے۔ وہ اپنے وطن کو تباہی سے بچانے کے لئے غازیوں کی طرح تلوار اٹھاکر ہنستے ہوئے میدانِ جنگ کی طرف بڑھ جاتے تھے۔ براعظم کے معرکہ آرا واقعات تاریخ میں تمھاری نظر سے گذرے ہوں گے چاند سلطانہ کے حالات تم نے پڑھے ہوں گے۔ ٹیپو سلطان کی داستانیں تمھیں یاد ہوں گی جن کو مشرق بھول نہیں سکتا۔ سر علامہ اقبال، اتاترک مصطفیٰ کمال اور لارڈ نے اپنے وطن کے لئے کیا نہیں کیا۔ انسان جسمانی حیثیت سے دنیا سے گذر جاتا ہے وہ چرخ کی ستم ظریفی کے ہاتھوں مٹ جاتا ہے لیکن اس کے کارنامے نہیں مٹ سکتے۔ کسی کی محبت اور اچھائی کبھی برباد نہیں ہوتی۔ زمانہ گذر جاتا ہے لیکن بات ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ تاریخ اچھوں کے اچھے کارنامے ہمیشہ دہراتی ہے۔ بچو! وطن کی محبت میں اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دینا ہی انسانیت کی دلیل اور انسان کے بہترین خصوصیت ہے۔ وہی انسان بہت بڑا وطن پرست ہوتا ہے جو اپنے وطن کی محبت میں یہ کہتا ہو ؎

تری اک مشتِ خاک کے بدلے لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

ہاں تو اب تم اس سے آگاہ ہوگئے ہو کہ اپنے وطن سے محبت رکھنا بڑی اچھی خصلت ہے۔ ذیل میں ہم تم کو اور وضاحت کے لئے چند بڑے لوگوں کے واقعات سناتے ہیں۔ تم نے "سب رس" کا "اقبال نمبر" ضرور دیکھا ہوگا اور اس سے بخوبی واقف ہوں گے کہ علامہ سر اقبال کو اپنے وطن سے کتنی محبت تھی وہ کتنے وطن پرست تھے تمھاری دلچسپی کے لئے ہم اقبال کے چند شعر سناتے ہیں کہ ایک سچے محب وطن کو اپنے وطن کا کس قدر خیال ہوتا ہے۔

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے اس باغِ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثہ میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے
چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

اس کے بعد اب سنو اقبال ہمارے وطن یعنی دکن کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ ہمارے ملک کا وہ کس طرح ذکر کرتے ہیں۔ ہم خود جتنا کہیں کم ہیں لیکن غیر کی زبانی تعریف سے بہتر ہوتی ہے۔ دکن کے متعلق اقبال لکھتے ہیں ؎

کیا کہوں اس بوستانِ عزتِ فردوس کی جس کے پھولوں میں ہوا اے ہمنوا میر اگند
جس کے ذرے مہرِ عالم تاب کو سامانِ نور جس کی طور افروز یوں پر دیدۂ موسیٰ نثار
خطۂ جنت نما جس کی ہے دامن گیرِ دل عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں کی یادگار
جس کے ذروں سے قدرت نے بنائی یہ زمیں وسعتِ عالم میں پایا صورتِ گردوں وقار

ہم اپنے ملک کی کون کون سی چیزوں پر فخر کر سکتے ہیں ہمارے ملک میں وہ کیا خاص باتیں ہیں جو دوسرے ملک میں نہیں۔ سب سے پہلے ہم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے ہمارے ملک کے لئے ایک بلند مرتبت بادشاہ عطا کیا ہے۔ جس کی سخاوت، رحم دلی، انصاف اور علم پروریاں آج دنیا میں مشہور ہیں جس نے ہماری فلاح اور بہبودی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ ہمارے ملک میں بڑی بڑی عالیشان عمارتیں ہیں۔ چار مینار قطب شاہی دور کی یادگار ہے۔ قلعہ گولکنڈہ کے کھنڈر اب بھی ہم کو قدیم زمانہ کی داستانیں سناتے ہیں اور اپنے پیشرو پر نازاں ہیں۔ سنو بیٹے گولکنڈہ کو فخر ہے کہ اس کی آغوش میں دنیا کی لاثانی ہستیاں محو خواب ہیں کئی بادشاہ میٹھی نیند لے رہے ہیں۔ ابھی گولکنڈہ دنیا میں ہیروں کی کان کی حیثیت سے مشہور ہے جس کا بیش قیمت "کوہ نور" آج تاج انگلستان میں لگا ہوا ہے۔

نہ صرف یہی بلکہ ہمارے وطن میں عدل و انصاف ہوتا ہے۔ جس کا ثبوت عدالت العالیہ کی شان دار عمارت سے ملتا ہے۔ پولیس اور فوج بہت اچھی ہے۔ مریضوں کو بیماری سے نجات دلانے کے لیے دو دواخانے ہیں ایک تو انگریزی موسی ندی کے کنارے، دوسرا یونانی چار مینار کے قریب ہیں۔ دونوں کی بڑی اور بہترین عمارتیں ہیں۔ تفریح کے لئے باغ عام، رانی باغ اور نئے پل کا چمن ہے۔ باغ عام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں "ٹاؤن ہال" "جوبلی ہال" اور دیگر بڑی بڑی عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ مطالعہ کے لئے "کتب خانہ آصفیہ" ہے جس کی عالیشان عمارت نئے پل کے قریب موسی ندی کے پاس ہے۔ ہمارے ملک میں تعلیم کا بڑا اچھا انتظام ہے۔ بڑے بڑے مدرسے اور کالج کی عمارتیں بھی بہت اچھی ہیں۔ معذوروں کے علاوہ قیدیوں کے لئے بھی بہترین عمارتیں موجود ہیں۔ ہمارے دکن میں بھلا کن چیزوں کی کمی ہے۔ ع

"اپنے دکن میں کیا نہیں بچو"

ہمارے ملک میں کتنی بڑی بڑی اور کشادہ سڑکیں ہیں جو ہمیشہ آنے جانے والوں سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ موٹر بس چلتی ہے ریل ہے جس کے ذریعہ سے ہم آسانی سے سفر کرتے ہیں۔ ہوائی جہاز موجود ہیں جس کی مدد سے ہم آسمانوں کی سیر کیا کرتے ہیں۔ ٹیلیفون ہے جس سے ہم کو بڑی سہولت ہے۔ بڑی دوکانیں موجود ہیں جن سے ہم اپنی ضرورت کی ہر چیز آسانی کے ساتھ خرید لیتے ہیں۔ کسان ہم کو گھر بیٹھے اناج پہونچا دیتے ہیں۔ ہمارے شہر میں بڑے بڑے امیر اور جاگیردار رہتے ہیں جن کو لاکھوں روپیہ سود ملتی جاگیر کا ملتا ہے۔ ہزاروں غریب بھی ہیں جو فاقوں سے اپنی جان دے رہے ہیں اور ہزاروں بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ شہر سے دور جنگل اور دیہات میں شاداب سبزہ زار، لہلہاتے ہوئے کھیت، پر فضا مناظر ہیں جہاں غریب کسان اور مزدور جھونپڑیوں میں زندگی گذارتے ہیں۔ وہ اپنی جھونپڑی ہی میں محلوں کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ دن تمام کی دھوپ رات کی اوس اور شبنم ان کے جسم کا رنگ بدل دیتی ہے لیکن وہ برابر محنت کرتے ہیں کبھی کام سے جی نہیں چراتے۔ ان کی محنت قابل قدر ہے۔

سب سے بڑھ کر ہمارے ملک کا سرمایہ تم ہو۔ آج کے بچے کل کے بڑے۔ تم ہی پر ہمارے ملک کی آئندہ تمام ترقیوں کا انحصار ہے۔ آئندہ نسلوں کا دارومدار تم ہی کمسن اور ہونہار بچوں پر ہے۔ تم سے ملک کو بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ وطن کی عظمت کو تم ہی کو قائم رکھنا ہوگا۔ ترقی کی شاہراہ پر تم ہی کو بڑھنا ہوگا۔ ملک اور قوم کے لئے تلوار اٹھا کر تم ہی کو میدان کارزار سر کرنا ہوگا۔ ملک کو آئندہ بنانے اور چلانے والے تم ہی اور صرف تم ہی ہو۔

مرزا باقر علی زاہد

# ہمارا وطن

ہمارا وطن ریاست حیدرآباد دکن ہے۔ دنیا میں تری ۳/۴ حصہ اور خشکی ۱/۴ حصہ ہے۔ خشکی پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ ہر حصہ کو براعظم کہتے ہیں۔ جس براعظم میں ہم رہتے ہیں وہ براعظم ایشیا کہلاتا ہے۔ ہندوستان ایک ملک ہے۔ جو براعظم ایشیا کے جنوب میں واقع ہے۔ کوہ ہمالیہ ہندوستان اور ایشیا کو دو حصوں میں علیحدہ کرتا ہے۔ ہندوستان قدرتاً ۴ حصوں میں منقسم ہے۔

۱۔ میدان۔ ۲۔ ساحل۔ ۳۔ پہاڑ۔ ۴۔ سطح مرتفع۔

کوہ بندھیاچل ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اوپری حصہ شمالی ہندوستان کہلاتا ہے۔ دوسرا حصہ جنوبی ہندوستان یا دکن کہلاتا ہے۔ ہمارا وطن دکن کے درمیان میں واقع ہے۔ جو سطح مرتفع دکن کہلاتا ہے۔ یہ سطح سمندر سے ۱۹۷۰ فٹ سے لے کر ۲۵۰۰ فٹ اونچا ہے۔ حیدرآباد کے شمال میں کوہ بندھیاچل اور مشرق میں مشرقی گھاٹ اور مغرب میں مغربی گھاٹ۔ ہمارے وطن کا عرض اجنتہ کے غاروں سے لے کر جنوبی حد تک ۴۸۴ میل ہے۔ اور طول کھنڈالا سے لے کر بعید اعظم تک ۴۰۰ میل ہے۔ اور اس کا رقبہ کل ۸۲۶۹۰ میل ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ اگر طول اور عرض کو ضرب دی جائے تو اتنے نہیں ہوتے اگر زمین مربع شکل کی ہوتی تو طول اور عرض سے ضرب دی جائے تو برابر ہوتا ہے۔ ہمارا وطن مربع نہیں ہے بلکہ تکونی ہے۔

ہندوستان میں انگریز ۱۶۰۱ء میں داخل ہوئے۔ انھوں نے رفتہ رفتہ سارے ملک پر قبضہ کرلیا۔ اب حکومت کی باگ ان کے ہاتھ میں ہے۔ اور ہمارے وطن کے اطراف انہی کا ملک ہے۔

ہمارے بادشاہ کا نام (نواب میر عثمان علی خاں بہادر) ہے ہمارے بادشاہ کو دن اور رات رعایا کے آرام کا خیال رہتا ہے۔ چنانچہ ملک میں تعلیم پھیلانے کے لئے ملک میں ہر جگہ چھوٹے بڑے مدرسے قائم کئے۔

روشنی واضح اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام ترقی یافتہ ممالک کی طرح ہمارے فرمانروا نے بڑے پیمانہ پر کیا ہے۔ تعلیمی سہولت کی خاطر تعلیمی زبان اردو قرار دی گئی ہے۔ جو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔

ہمارے بادشاہ نے بڑے بڑے دواخانے بنوائے۔ عثمانیہ دواخانہ جو موسیٰ ندی کے کنارے واقع ہے۔ شفاخانہ جو حال ہی میں تکمیل پا چکا ہے اور مشہور لوگوں کو معقول تنخواہوں پر مامور کیا ہے۔ عثمانیہ دواخانہ میں اعلیٰ طبیبوں کو مریضوں کے علاج کے لئے متعین کیا ہے۔ ہم لوگوں کی تفریح کی غرض سے سرکار نے چمن اور تالاب بنوائے ہیں۔

حیدرآباد کی مردم شماری تقریباً (۵۵۰۰۰۰) لاکھ ہے۔ ہمارے شہر میں ایک ندی ہے جس کا نام موسیٰ ہے۔ اس پر پانچ پل تعمیر کرائے گئے ہیں۔

پہلا نیا پل کا پل۔ دوسرا پل چادرگھاٹ۔ تیسرا پل افضل گنج۔ چوتھا پل مسلم جنگ۔ پانچواں پرانا پل۔ اس ندی کے کنارے

عالیشان عمارتیں ہیں۔

زنگی خانہ۔ عدالت العالیہ۔ سٹی کالج کتب خانہ آصفیہ قابل ذکر ہیں۔

ہمارے ملک میں آمد و رفت کے لئے ریلوے بس جاری کی گئی ہیں۔ جو ہر جگہ چلتی ہیں۔ ہمارے ملک میں ہر جگہ ریل بھی چلتی ہے۔

ہمارا ملک چار صوبوں میں منقسم ہے۔ ہر صوبہ کا حاکم صوبہ دار ہوتا ہے۔ اور ہر صوبہ میں چار ضلع ہوتے ہیں ضلع کا حاکم تعلقدار ہوتا ہے۔ ہر ضلع میں ۹ یا ۱۰ تعلقے ہوتے ہیں۔ ہر تعلقہ کا حاکم تحصیلدار ہوتا ہے۔ ہر تعلقہ میں ۱۰۰ یا ۲۰۰ مواضعات ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں انتظام کے لئے (۹) صدر المہام اور صدر اعظم ہے۔ حال ہی میں ہمارے بادشاہ کا ۲۵ سالہ جشن منایا گیا تھا۔ ہماری آنکھیں ہمارے بادشاہ کی گولڈن جوبلی دیکھنے کے لئے ترس رہی ہیں خدا ہم لوگوں کی امیدوں کو پورا کرے اور ہمارے بادشاہ کو صدوسی سال سلامت رکھے۔ آمین ثم آمین۔

میر محمد علی

## مدراس کا تحفہ

مدراس سے نانا باجو کل شام پلٹ کر آئے ہیں
بتلاؤں آؤ میں کیا کیا وہ میرے لئے لے آئے ہیں
ایک بیاٹ ہے چھوٹا سا یہ دیکھو۔ کرکٹ کے ہیں دو گولے
یہ ایک لونڈر کی شیشی گر ڈاٹ کھلے تو گھر مہکے
یہ ننھی منی سی کنگھی۔ یہ ایک پٹاری چھوٹی سی
دیکھو تو ذرا ہے اس میں کیا مدراس کی ہے یہ چکنی ڈلی
یہ چار ہیں گولے ٹینس کے۔ یہ ایک بڑا سا ہے گولا
اور ایک ذرا سی ٹھوکر میں یہ دو دو گز ہی اچھل جاتا
کیا پیاری پیاری تصویریں یہ چارٹ ہیں اس پہ نہیں
یاں پھرتے ہیں کچھ چوپائے یاں کھیلتے ہیں کچھ بچے بھی
یاں بہتی ہے اک ندی سی۔ یہ کھیت ہیں اور یہ ہے سبزا
بس مجھ کو ان سب چیزوں میں یہ گیند بہت ہی ہے پیارا

لطیف النساء بیگم

# بھاگ نگر

یہ سہانی بستی جہاں ہم آپ چین کی زندگی بسر کرتے ہیں، سدا سے بھاگوان رہی ہے۔ پہلے اس کو بھاگ نگر کہتے تھے۔ حیدرآباد فرخندہ بنیاد بعد کا نام ہے۔

سنہ ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں پرانے پل کی تعمیر کے بعد بھاگیہ نگر کے بھاگ کھلے۔ اور شہزادہ محمد قلی کی لگاتار آؤ جاوک کے ساتھ چچلم کے ننھے سے گاؤں نے بھاگ نگر کا جنم لینا شروع کیا۔ جیسے جیسے بھاگ متی سے شہزادے کا پریم بڑھنے لگا، گولکنڈہ کی بستی ہو طبیعت الجھنے لگی۔ وہاں کی آب و ہوا کچھ ایک آن نہ بھاتی تھی۔ رہ رہ کر چچلم کی یاد دل کو ستاتی، گولکنڈے کی بڑھتی ہوئی آبادی کی بدولت یوں بھی امیرزادوں کی سیر و تفریح کے سامان کی کمی واقع ہو چلی تھی۔ چچلم کا سا دلکش منظر اور کھلی آب و ہوا گولکنڈے میں بھلا کیونکر نصیب ہو سکتی تھی۔ یہ بھی ایک وجہ ہوئی کہ شہزادے نے اپنا بہترا وقت چچلم اور اس کے نواح کی سہانی فضا میں گذارنا شروع کیا۔

سنہ ۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) میں سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد محمد قلی بادشاہ ہوئے اور سلطان محمد قلی قطب شاہ کا لقب اختیار کیا۔ بادشاہ ہوتے ہی محمد قلی قطب شاہ نے سنہ ۹۹۹ھ (۱۵۹۰ء) میں اپنی محبوبہ بھاگ متی کے گاؤں چچلم کے آس پاس ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی۔ ہوتے ہوتے یہ پریمی بستی خوب گلزار ہوئی اور بادشاہ نے اپنی محبوبہ بھاگ کے نام کی رعایت سے اس شہر کا نام بھاگ نگر رکھا۔ بڑی بڑی عمارتیں اور محل بنوائے اور امرائے سلطنت نے بھی دیکھا دیکھی بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کیں۔

محمد قلی قطب شاہ کو راج پاٹ ملنے کے بعد بھاگ متی ملکہ بنیں اور کچھ دنوں کے بعد "حیدر محل" کا خطاب پایا تو یہ بستی حیدرآباد کہلانے لگی۔ البتہ یہ بتانا مشکل ہے کہ بھاگ متی کو حیدر محل کا خطاب ملنے کے ساتھ ہی اس شہر کو حیدرآباد کہنے لگے یا کچھ دنوں گذرنے کے بعد۔ میں سمجھتا ہوں کہ کچھ دنوں بعد ایسا ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ ایک نام جب خاص و عام کی زبان پر چڑھ جاتا ہے تو بھلاتے بھلاتے انسان اس کو بھولتا ہے۔

شہر کو بس کر کوئی سات برس ہوئے ہوں گے کہ سنہ ۱۰۰۶ھ (۱۵۹۷ء) میں اس بستی کو "فرخندہ بنیاد" کا نام دیا گیا۔ یہ تاریخی نام سرکاری دفتروں میں تھا جو اب تک چالو ہے۔ اور یہ بستی بعد میں "حیدرآباد فرخندہ بنیاد" کہی جانے لگی۔

**جی سورج بھان**

# مکہ مسجد

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوئے۔ مکہ مسجد جو آج حیدرآباد کی مشہور و ممتاز عمارتوں میں شمار ہوتی ہے، انہی کی عظیم الشان یادگار ہے، اس مسجد کی تعمیر کے متعلق یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ بادشاہ حاضرینِ دربار سے یوں ہم کلام ہوا کہ کوئی ایسا شخص بھی ہے۔ جس کی ایک نماز بھی قضا نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ دربار میں کوئی ایسا شخص نہ ملا۔ جس نے ایک بھی نماز قضا نہ کی ہو، یہ دیکھ کر بادشاہ سلامت نے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ بارہ سال کی عمر سے ان کی ایک بھی نماز قضا نہیں ہوئی حتیٰ کہ نماز تہجد بھی خود اس کا سنگ بنیاد نصب کیا تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا کام ۱۰۲۱ھ میں ہنرمند خاں اور میر فیض اللہ کے زیر نگرانی شروع ہوا کئی ہزار مزدور کام پر لگائے گئے، مسجد کے مکمل ہونے پر سلطان وقت نے اس کا نام "بیت العتیق" رکھا تھا۔ اس کے بعد سلطان محمد قطب شاہ اور ان کے بعد عبداللہ قطب شاہ، ان دونوں کے بعد تاناشاہ نے اس کی درستی کی جانب توجہ کی، شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے قطب شاہیہ سلطنت کو اپنے قبضۂ اقتدار میں لایا تو اس عمارت کے اندرونی حصہ کی استر کاری کروائی علاوہ ازیں اوقات نماز معلوم کرنے کیلئے سنگ موسیٰ کی ایک دھوپ گھڑی لگوائی۔ اور کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب ہی نے اس مسجد کا نام بیت العتیق بدل کر مکہ مسجد رکھا۔

ہمارے بادشاہ ذیجاہ کے عہد ہمایونی میں بہت سے انتظامات ہوئے۔ برقی روشنی اور دیگر آرائشی چیزوں نے اس عمارت میں چار چاند لگا دیئے۔

حسین شریف درد
(سٹی کالج)

# گولکنڈہ

جب بہمنی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو دکن میں پانچ چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوگئیں۔ جس میں گولکنڈہ بھی ایک چھوٹی سلطنت تھی۔ جس کا حکمران محمد قلی قطب شاہ تھا۔ پہلے یہ ہندوؤں کا بنایا ہوا کچا قلعہ تھا۔ بعد میں جب مسلمان دکن کے حکمران ہوئے تو محمد قلی قطب شاہ نے اُس کو نئے سرے سے پتھر سے تعمیر کرایا۔ جو اب تک موجود ہے۔ جب اورنگ زیب نے اس کا محاصرہ کیا تو یہ قلعہ آٹھ مہینے تک اس کے قبضے میں نہ آسکا۔ اورنگ زیب نے بہت کوشش کی کہ قلعہ کسی طرح فتح ہوجائے۔ لیکن یہ ایسا مضبوط قلعہ تھا کہ آسانی سے فتح نہ ہو سکا۔ اور بڑی مشکلوں سے اورنگ زیب کے ہاتھ لگا۔ سنا جاتا ہے کہ یہاں ہیرے کی کان بھی ہے۔ کوہ نور جو دنیا بھر میں بہترین اور بڑا ہیرا ہے وہ یہیں سے برآمد ہوا۔ قلعہ کے اطراف خندق بھی ہے۔

یہ قلعہ بہت بلند مقام پر واقع ہے۔ لڑائی کے زمانے کے اسلحہ اس میں اب تک موجود ہیں۔ جب اورنگ زیب نے لڑائی میں کچھ دور سے توپ کا جو گولہ مارا تھا وہ اب تک اس کی فصیل میں اڑا ہوا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ اس کی فصیل بہت مضبوط ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یہاں پر چہل پہل تھی جو اب باقی نہیں رہی۔ کہا جاتا ہے کہ (کنارہ حوض) یہ جواب بھی موجود ہے۔

سب رہی
اس زمانے میں عطر بھرتے تھے۔ اس قلعہ میں بہت بڑی بڑی سرنگیں بھی ہیں۔ قلعہ سے کچھ فاصلہ پر قطب شاہی خاندان کے بادشاہوں کی گنبدیں ہیں۔

حبیب شمس
(اسٹی کالج)

# عثمان ساگر کی سیر

ہمارا شہر حیدرآباد موسیٰ ندی پر واقع ہے۔ پرانے زمانے میں جب بارش کثرت سے ہو جاتی تھی تو اس ندی کو طغیانی ہوا کرتی تھی۔ جس سے لاکھوں جانیں تلف ہو جاتی تھیں اور ہزاروں آدمی بے گھر ہو جاتے تھے اور کروڑوں روپیہ کا مالی نقصان ہو جاتا تھا رعایا کی اس پریشانی کو ہمیشہ کے لئے دور کرنے ہمارے اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں بہادر نے حیدرآباد سے ۹ میل کے فاصلے پر ایک بہت بڑا تالاب تعمیر کروا دیا ہے جہاں موسیٰ ندی کے پانی کو اس طرح روک دیا گیا ہے کہ شہر اب طغیانی کے خطرے سے محفوظ ہو گیا ہے اور اس کے علاوہ حیدرآباد کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے پینے کے پانی کا بھی معقول انتظام ہو گیا ہے۔ تالاب یا ندی کے پانی میں بہت سے جراثیم ہوتے ہیں جو انسانوں کی صحت کے لئے سخت مضر اور بیماری کا باعث ہوتے ہیں ان میں بعض کیڑے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے خوردبین سے دیکھا جائے تو یہ اچھی طرح نظر آتے ہیں ان کیڑوں کے دور کرنے کے لئے پانی کا چھاننا ضروری ہوتا ہے۔ عثمان ساگر کے پانی کو بڑے بڑے نلوں کے ذریعے ایک مقام پر لایا جا کر بڑی بڑی ولایتی مشنری کے ذریعے چھانا جاتا ہے اس مقام کو فلٹر بڈس کہتے ہیں یہاں سے پانی نلوں کے ذریعے سارے شہر میں پہنچایا جاتا ہے اور یہی صاف شفاف پانی جب ہم نل کھولتے ہیں تو ہم کو ملتا ہے۔

آج تعطیل ہے پپا سے کہیں کہ ہم کو عثمان ساگر لے چلیں۔ او ہو پپا راضی ہو گئے۔ موٹر میں تھوڑا بہت کھانے پینے کا سامان رکھا لیا گیا اور ہم لوگ روانہ ہو گئے۔ آدھے گھنٹے میں ہم لوگ سب گنڈی پیٹ پہنچ گئے ڈاک بنگلے میں سامان رکھوا دیا گیا ہم سب پھر موٹر پر سوار ہو کر باغ کی سیر کو چلے گئے واہ واہ کیا اچھا باغ ہے کیسے خوشنما پھول ہیں اور کیاریاں کیسی اچھی بنی ہوئی ہیں ایک طرف خرگوش کھیل رہے ہیں۔ دوسری طرف کبوتر ہوا میں قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ اوہو اس طرف جھولے نظر آ رہے ہیں آؤ حامد ہم تم مل کر جھولا جھولیں گے۔ جمیل تم بھی آؤ کیا بھلا معلوم ہو رہا ہے پانی کی لوٹیں کیسی بہار دے رہی ہیں۔ چلو اب طبیعت تھک گئی۔ بھوک لگ رہی ہے۔ ڈاک بنگلے کا آدمی کھانا تیار کر چکا ہوگا۔

قدسیہ ظہیر الدین احمد
(محبوبیہ گرلز اسکول)

---

بعض بچوں کو شکایت ہے کہ ان کے مضمون نہیں چھپتے۔ ہم ان کو یقین دلاتے ہیں کہ اچھے مضمون باری باری سے ضرور چھپیں گے۔ ان کا نمبر بھی آئے گا۔ وہ اچھے مضمون بھیجتے رہیں۔

# اے مرے ملکِ دکن

اے مرے ملکِ دکن — میرے شگفتہ چمن
معدنِ ہر علم و فن — اے مرے پیارے وطن
اے مرے ملکِ دکن

اے مرے جنتِ نظر — اے مرے راحت کے گھر
مسکنِ اہلِ ہنر — اے مرے پیارے وطن
اے مرے ملکِ دکن

میں ترا دیوانہ ہوں — میں ترا پروانہ ہوں
میں ترا مستانہ ہوں — اے مرے پیارے وطن
اے مرے ملکِ دکن

آنکھ کا تارا ہے تو — جان سے پیارا ہے تو
میرا دل آرا ہے تو — اے مرے پیارے وطن
اے مرے ملکِ دکن

تو تو مری جان ہے — تو مرا ایمان ہے
دل مرا قربان ہے — اے مرے پیارے وطن
اے مرے ملکِ دکن

اہلِ وطن خوش رہیں — گود میں تیری پلیں
خوب ترقی کریں — اے مرے پیارے وطن
اے مرے ملکِ دکن

آصفِ دوراں رہے — شوکتِ عثماں رہے
تیرا نگہباں رہے — اے مرے پیارے وطن
اے مرے ملکِ دکن

فیض سے تیرے دعا — کرتا ہے فیضی ترا
تو رہے قائم صدا — اے مرے پیارے وطن
اے مرے ملکِ دکن

اشرف الدین فیضی
[illegible]

# قلعہ دولت آباد کی سیر

میں عید الفطر کی تعطیلات میں اورنگ آباد کے عجائب دیکھنے کے لئے گیا تھا۔ لیکن ایک ہی وقت میں پورے عجائبات کا ذکر کرنے سے مضمون طول طویل ہوجاتا ہے اس لئے میں یہاں قلعہ دولت آباد کا ذکر کرتا ہوں۔

یہ قلعہ یادو خاندان کے شہزادہ بھیلا ما اول کے زمانے میں تعمیر کیا گیا۔ بارہویں صدی کے آخر یعنی ۱۲۹۴ء میں سلطان علاء الدین خلجی نے راجہ رام دیو کے زمانے میں قلعہ پر حملہ کیا۔ یہ پہلے دیوگڑھی کے نام سے موسوم تھا۔ راجہ گرفتار کر لیا گیا لیکن خراج دینے کے وعدے کے بعد چھوڑ دیا گیا۔

جب تغلق شاہوں کا دورِ حکومت آیا تو شہنشاہ محمد تغلق نے دیوگڑھی کا نام دولت آباد رکھا اور اُس کو اپنا دارالسلطنت بنانا مناسب سمجھا۔ ایک مرتبہ وہ تمام رعایا کو حکم دیا کہ دہلی چھوڑ کر دولت آباد آباد کریں۔ راستہ میں بہت سے لوگ مر گئے۔ اور اس کی یہ تجویز کامیاب نہ ہو سکی۔

قلعہ ۶۰۰ فٹ کی بلندی پر گاؤدم △ شکل کا بنا ہوا ہے۔ قلعہ کے دروازے کے پاس چاند مینار ہے جس کو سلطان احمد شاہ بہمنی نے ۱۴۳۵ء میں اپنی فتح کی یادگار میں بنوایا تھا۔ اس کی اونچائی ۲۱۰ فٹ ہے۔ اور تھوڑی دور کے فاصلے پر چینی محل ہے۔ جس میں تانا شاہ کو شہنشاہ عالمگیر نے گولکنڈہ کی فتح کے بعد قید کیا تھا جو مرتے دم تک وہیں رہا اور خلد آباد میں دفن کئے گئے

قلعہ کا فتح کرنا بڑی کٹھن بات تھی۔ پہلے تو دشمن اوپر آ ہی نہ سکتا تھا۔ اگر آ بھی جائے تو وہاں ایک بڑا سوراخ ہے۔ جو خندق تک چلا گیا ہے تو وہ اس میں گر کر مرجاتا تھا۔ اور اگر دشمن وہاں سے بھی آگے آجائے تو وہاں توا ہے جس پر آگ روشن کی جاتی تھی اور وہ گرمی تمام اندھیری میں بھر جاتی تھی اور دشمن کا آنا بالکل ناممکن ہوجاتا تھا۔ اور پھر توے کے پاس سے فولاد کے کانٹے بچھا دیئے جاتے تھے۔ توے سے تھوڑی دور پر بالا حصار ہے جہاں سے چاروں طرف کے مناظر دیکھ سکتے تھے۔

قلعہ کے اطراف ۲۰۰ فٹ گہری خندق ہے جس پر ایک پل ہے جو کہ لڑائی کے زمانے میں نکال دیا جاتا تھا۔

ابوالحسن

# اجنٹا کے غار

اجنٹا کے غاروں کی شہرت آج کل اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ تمام ملکوں کے لوگ اس کے دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ یہ غار اجنٹا جاگیر میں واقع ہیں۔ ان غاروں کی نگرانی کے لئے سرکار عالی کی طرف سے ایک مہتمم رکھا گیا ہے۔ اور ان کا پورا ایک محکمہ قایم ہے۔ اجنٹا سے فردا پور ۶ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جو لوگ اجنٹا دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ وہ لوگ فردا پور میں ڈاک بنگلہ میں ٹھیرتے ہیں۔ اورنگ آباد سے فردا پور تک بس جاتی ہے۔ لیکن بارش کا زمانہ بڑا خراب رہتا ہے کیونکہ ندی نالوں میں پانی آتا ہے۔ مسافروں کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ نیز اب تو پُل بن رہا ہے۔ بہرحال اب ہم غاروں کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ غار اجنٹا مستقر سے آٹھ میل پر ہیں اور فردا پور سے تین میل پر۔ اجنٹا میں جملہ ۲۶ غار ہیں جن میں مہاتما بدھ کی پیدائش سے لے کر موت تک کے حالات بذریعہ تصاویر بنائے گئے ہیں۔ یہ تصاویر چالوکیہ خاندان کے حکمرانوں کے زمانۂ حکومت میں مختلف اوقات میں بنائے گئے ہیں جو آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے ان غاروں میں غار نمبر ۱، ۲، ۱۱، ۱۷، ۱۹ و ۲۶ قابل دید ہیں جس میں ان کی استادی اور کاریگری بے نظیر ہے۔ جس کے دیکھنے کے لئے یورپ، امریکہ اور لندن سے لوگ آتے ہیں۔ ان کے کمال و ہنر کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ ان غاروں کی عظمت و شوکت آج کل بہت بڑھی ہوئی ہے۔ یہ ایک آثار قدیمہ ہے۔ ہر ایک غار میں مہاتما بدھ کا مجسمہ پتھر میں تراش کر بنایا گیا ہے۔ غاروں میں اندھیرا ہے۔ لیکن بجلی کی روشنی کا انتظام کیا گیا ہے۔ جس کی فیس ۵ روپے سکہ عثمانیہ ہے۔ پہلے غاروں کو جانے کے لئے پرانی اور خراب سڑک تھی لیکن اب نئی اور اچھی سڑک بنی ہے۔ اجنٹا جانے کا اچھا موسم سرما کا ہے۔ کیونکہ سب جنگل ہرا بھرا معلوم ہوتا ہے۔

# حب وطن

سید محمود علی
(سٹی کالج)

قایم رہے ہمیشہ ملک دکن ہمارا ۔۔۔ ہم خادم دکن ہیں وہ ہے وطن ہمارا
آپس میں مل کے باہم سیکھیں گے علم و حکمت ۔۔۔ سکھلائیں پھر جہاں کو رسم کہن ہمارا
ہردم دعا یہی ہے یارب مری زباں پر ۔۔۔ قائم رہے الٰہی شاہِ دکن ہمارا
ہردم زباں پہ سب کی آئیں خوشی کے نغمے ۔۔۔ پھولا پھلا رہے یہ پیارا وطن ہمارا

مسلم ہوں یا کہ ہندو آپس میں سب ہیں بھائی
ہندوستاں ہمارا ملک دکن ہمارا

میر محمود علی اکبر شبیر

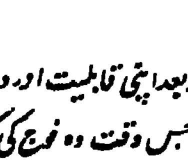
# حیدر علی سلطان

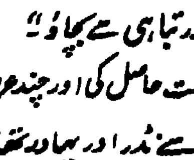
حیدر علی ۱۱۲۹ھ بہ مقام چلی پیدا ہوا۔ پیدا ہونے پر نجومیوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا ایک دن صاحب تخت و تاج ہوگا۔ اس لیے اس کی پرورش اور حفاظت بڑی سرگرمی سے ہونے لگی بچپن ہی میں اس نے فنونِ سپہ گری میں ایسی مہارت حاصل کی کہ اچھے اچھے سپاہی اس پر رشک کرتے تھے کچھ عرصہ بعد وہ علاقہ میسور کے کسی چھوٹے سے راجہ کی فوج میں بحیثیت ایک سپاہی شریک ہوا اور ترقی کرتے کرتے سپہ سالار اور سپہ سالار سے نائب وزیر بن گیا۔

اُن دنوں راجہ کی عیش پرستی اور وزیر کی ظلم و زیادتی سے ملک کی حالت نہایت ابتر ہو رہی تھی۔ اس وقت حیدر علی کسی مہم پر باہر گیا ہوا تھا۔ راجہ کی دادی نے ملک کی ایسی خطرناک حالت دیکھ کر فوراً ایک خط حسب ذیل مضمون کا حیدر علی کے نام روانہ کیا۔ "آج کل یہ ریاست بدتمیزی اور نفاقِ اعیان و ارکان سے ایسی تنزل اور بے انتظام ہو رہی ہے کہ اکثر لوگ بغاوت پر تل گئے ہیں اور بعض اس ریاست کو چھین لینا چاہتے ہیں۔ اس لئے میں تم کو اپنا فرزند سعادت مند جان کر یہ لکھتی ہوں کہ تم یہاں آؤ اور ہماری بے کسی اور بے بسی کا حال دیکھو اور ہم کو ایک ٹھکانے بٹھا کر ملک و مال کے انتظام کو اپنے ہاتھ میں لو اور رعایا کو اس زحمت اور تباہی سے بچاؤ۔"

اس طرح حیدر علی نے حکومت حاصل کی اور چند عرصہ بعد اپنی قابلیت اور دلیری سے ایک بہت بڑے علاقہ کا خود مختار بادشاہ بن بیٹھا۔ حیدر علی بچپن ہی سے نڈر اور بہادر تھا۔ جس وقت وہ فوج کی کمان کرتا اپنے ذاتی خطرہ سے بے پرواہ ہو جاتا اس سے دوسروں کی بھی ہمت بڑھ جاتی۔ وہ اپنے سپاہیوں کی پوری پوری قدر کرتا اور انہیں انعام و اکرام دیتا۔ چنانچہ وہ بڑی جانبازی سے اس کی طرف سے لڑتے تھے۔ ظالم اور رشوت خوار عاملوں کو تازیانہ سے پٹواتا اور جو لوگ اپنی خدمات اُس کی مرضی کے موافق انجام دیتے انھیں جی کھول کر انعام دیتا۔

اُس کی دماغی قوتیں ایسی زود رس اور قوی تھیں کہ ایک ہی وقت میں وہ کئی کاموں میں مصروف رہتا یعنی عرضیاں اور خطوط بھی سنتا جاتا اور ان کے جواب بتاتا اور حکم احکام بھی دیتا جاتا اور ساتھ ہی ساتھ تماشا بھی دیکھتا جاتا۔ چونکہ وہ ناخواندہ تھا اس لئے وہ اپنے میر منشی سے لکھے ہوئے احکام دوسرے میر منشی سے پڑھوا کر سن لیتا تھا۔ تاکہ کوئی خلاف بات لکھی ہو تو معلوم کر کے اپنے دستخط کرتا۔ دستخط میں اپنے نام کا سر حرف (ح) بنا دیا کرتا تھا۔ اس نے سکہ بھی جاری کیا تھا جس پر حسب ذیل حروف کندہ ہوتے تھے۔




کئی مورخ لکھتے ہیں کہ نواب حیدر علی خاں کے عزم بلند کا پلہ کسی طرح تیمور اور نادر سے گھٹ کر نہیں پایا جا سکتا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ "اگر میں اپنا جیسا ایک اور شخص پاؤں تو خدا کی تائید سے ہفت اقلیم فتح کر ڈالوں اور حضرت عمرؓ کی

فتوحات کا نقشہ دکھا دوں مجھ کو بعض لوگ اُمّی کہتے ہیں مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میرا پیغمبر بھی اُمّی تھا۔ یہ بھی خدا کی قدرت کا ایک نمونہ ہے جو اُس نے مجھ جیسے جاہل سے ایسے کارنمایاں کروائے جو بڑے بڑے عالموں سے بھی نہ ہو سکے۔ نواب حیدر علی خاں نے سپاہی ہو کر ملک گیری اور ملک داری کی تدابیر کو ایسا اخذ کیا تھا جو ایک بڑے عقلمند بادشاہ کے سزاوار ہو سکتی ہیں عدل و انصاف کو نہایت پسند کرتا اور احکام شریعت پر سر جھکاتا۔ نواب نے اپنی قلمرو میں ٹھگ، چور، ڈاکوؤں، اُچکوں کا نام و نشان باقی نہ رکھا۔ شجاعت کو اس پر فخر تھا نہ کہ اُس کو شجاعت پر۔ بڑی سے بڑی لڑائی میں بیم و ہراس اُس کے پاس نہ آتے تھے۔ وہ اپنی مستقل مزاجی کو ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔ چینا پٹن اور مدراس کے نواح میں اس کا خوف اس درجہ پیدا ہو گیا تھا کہ اُس سے چھوٹے بڑے خوف کرتے تھے اور انگریز ہر وقت اس کے ٹوٹ پڑنے سے خائف رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ولایت کے انگریز اپنے بچوں کو اس کا نام لے کر ڈراتے تھے کہ چپ رہو ورنہ حیدر علی پکڑ لے جائیگا۔

آپ نے دیکھا کہ کس طرح ایک معمولی سپاہی اپنی قابلیت اور دلیری کی وجہ سے بادشاہ بن بیٹھا اور اُس کا کیا رعب تھا لیکن آج وہی شہریار شہنشاہِ حقیقی کی بارگاہ میں جانے کے لئے سر بر کامرانی پر تھوڑی دیر کا مہمان نظر آتا ہے اس کی پیٹھ کے پھوڑے (سرطان) سے سب جراح و طبیب، مایوس ہو چکے ہیں مگر اُس کا دماغ انتظام سلطنت میں اُلجھا ہوا ہے۔ زاں بعد مقربانِ حضوری کی استدعا سے اُس نے اپنے تمام کاروبار اپنے جوانمرد بیٹے ٹیپو سلطان کے تفویض کر کے ۱۱۹۵ھ ماہ محرم میں چیتور کے قریب اپنے لشکر کے درمیان داعی اجل کو لبیک کہا۔

کارپردازانِ سلطنت نے بعد رحلت اس واقعہ کا اظہار خلافِ مصلحت سمجھ کر نوحہ و ماتم برپا نہیں کیا بلکہ کئی روز تک اس خبر کو پوشیدہ رکھا اور نواب مرحوم کے جنازے کو خفیہ طور سے سرینگ پٹن پہنچا دیا۔ وہاں بڑی عظمت اور احترام سے لال باغ میں دفن کر کے عالی شان مقبرہ بنایا گیا۔ ذیل کا قطعہ اس کی قبر کی لوح پر کندہ ہے۔

کہ ایں شاہ آسودہ را نام چیست ۔۔۔ چہ تاریخ رحلت نمود است او
یکے زاں میاں گفت تاریخ و نام ۔۔۔ کہ حیدر علی خاں بہادر بگو

۱۱۹۵ھ ہجری

محمد ظہور الاسلام خاں

## دکن کو مراجعت

میرے ایک عزیز ایک عرصے کے بعد حیدرآباد کو واپس آرہے تھے انھیں لینے کے لئے میں اور چند احباب بمبئی تک گئے تھے وہاں میں نے یہ نظم پڑھی تھی۔

دھڑک رہا ہے دلِ بے قرار سینے میں ۔۔۔ لرز رہا ہے جنوں کا شرار سینے میں
نگاہِ گرم سے پیدا ہے شوقِ دیدِ وطن ۔۔۔ کشاں کشاں لئے آتا ہے شوقِ دیدِ وطن
وہ کیف ہے وہ خوشی ہے وہ بے قراری ہے ۔۔۔ رگوں میں خون کے بدلے شراب جاری ہے
جگر گداز ہے جذبات کی فراوانی ۔۔۔ ذرا سا دل ہے، مگر اس میں اتنی طغیانی
شہرِ خدا اہلِ وطن شہرِ خدا کے لئے ۔۔۔ مجھے ہلاک مسرت نہ کر خدا کے لئے
شہر عقیدت کی حد سے نہ میں گذر جاؤں ۔۔۔ خوشی سے راہ میں ظالم کہیں نہ مر جاؤں

سید خدا بخش سلیم

# قلعہ بھونگیر کی سیر

بھونگیر ضلع نلگنڈہ میں ایک تعلقہ ہے۔ شاید کسی زمانے میں بہت بڑا شہر ہو۔ اس کے تاریخی آثار صاف ظاہر کرتے ہیں کہ یہ کسی زمانے میں ایک بڑا شہر تھا۔ یہاں کی درگاہ اور قلعہ بہت مشہور ہے ہم صبح دس بجے حیدرآباد سے نکل کر ساڑھے بارہ بجے بھونگیر پہنچے۔ قلعہ پر پہنچ کر دم لیا۔ قلعہ جس پہاڑ پر واقع ہے وہ دیکھنے پر صرف ایک چٹان معلوم ہوتا ہے۔ اس کی بلندی قلعہ گولکنڈہ سے ڈیڑھ گنی ہوگی۔ صدر دروازہ میں پہنچ کر سیتا پھلوں سے دوزخ شکم بھرا اور قلعہ پر چڑھنے لگے۔ پہاڑ کچھ حصہ جہاں ڈھلان ہے سیڑھیاں تراشی دی گئی ہیں تاکہ عوام گرنہ جائیں پہاڑ کا کچھ حصہ اوپر سے بالکل لٹو کی طرح نظر آتا ہے اگر اوپر سے نیچے کی طرف نظر دوڑائی جائے تو بستی، تھر دوزخ اور کویلو کے مکانات جلتی آگ کے توے معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال ہم قلعہ پر چڑھے پہاڑ پر بہت ایسے چشمے ہیں جن میں گھاس اور کنول کے پودے اُگے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ پودوں کے لئے تو مٹی کی ضرورت ہے اور یہاں مٹی کا نام و نشان نہیں۔ پھر یہ پودے کیسے۔ ان چشموں کے اطراف پختہ دیواریں کھینچ دی گئی ہیں اور اوپر چڑھنے کے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت عجیب ہُو کا منظر لئے کھڑی ہے۔ میرے خیال میں یہ بالا حصار ہوگا۔ اس سے بالکل قریب بارہ دری کی شکل کی ایک عمارت ہے اس کے نیچے ایک بہت گہری باؤلی ہے (ٹاکی) زمانۂ بارش میں لبالب بھر جاتی ہے اور اس میں ہوا کے زور سے چھوٹا سا گرداب بھی آتا ہے۔ شمال مشرقی و مغربی طرف نظر دوڑائیں تو ریل کی سڑک موٹر کی سڑک کے ساتھ پیچ و خم کھاتی چلی گئی ہے۔ اگر اس وقت ریل گذر رہی ہو اور اس کی مخالف سمت سے کوئی موٹر آرہی ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی یہ خونخوار سانپ چھوٹے سے بچے کو نگل جائے گا۔ کھیتوں کی طرف نظر دوڑائیے تو پان کے باغیچے شطرنج کے تختے معلوم ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ منظر یہی ہے۔ افسوس کہ ہمارے پاس کیمرا نہ تھا ورنہ ہم تصویریں آپ کے سامنے پیش کرتے۔ آخرکار دیکھتے دکھاتے سب نے اتر کر درگاہ کا رخ کیا۔ وہاں کھانا.... کھاکر آٹھ بجے راہی حیدرآباد ہوئے۔

راستے میں جگنو اڑ رہے تھے ڈرائیور سمجھا کہ ٹرین کی کھڑکیوں کی روشنی ہے۔ ۱۵/۲۰ منٹ تک موٹر ٹھیرائے رکھی۔ آخرکار صبح و سلامت دس بجے حیدرآباد پہنچے۔ ایسے مزوں سے ہمارا تاریخی سفر ختم ہوا۔

**محمد فیروزالدین صدیقی**
(سٹی کالج)

## گریہ و تبسم از صاحبزادہ میکش

ادارۂ ادبیات اردو نے خاص اہتمام سے اس مجموعے کو شائع کیا ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت بہترین۔ جلد بہت ہی خوشنما اور پائدار۔ کتاب پر دو جگہ سنہرے حروف میں گریہ و تبسم ڈالا گیا ہے جو بہت ہی دیدہ زیب اور خوشنما ہے۔ ابتداء میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری کا دیباچہ عمومی اور پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا مقدمہ ہے۔ جملہ صفحات دو سو ہیں۔ جدید شاعری کا ذوق رکھنے والے کے لئے اس کا مطالعہ کیف آور ثابت ہوگا۔ قیمت صرف عام

# فتح میدان کا سوئمنگ باتھ

فتح میدان (حیدرآباد) میں فوج کا ایک سوئمنگ باتھ بہ عہدِ اعلیٰ حضرت غفراں مکاں زیرِ نگرانی نواب افسر جنگ مرحوم تیار کیا گیا ہے۔ یہ ایک حوض ہے جس کا طول ۱۰۶ فٹ اور عرض ۵۴ فٹ ہے۔ اوپر کی جانب اس کی گہرائی ۴ فٹ اور نیچے کی طرف ۹ فٹ ہے۔ اس حوض کے اطراف کافی عریض جگہ چھوڑ کر جس میں ہریالی لگائی گئی ہے اونچی اونچی پردہ کی دیوار ہے۔ حوض کے کنارے کنارے کئی ایک چھوٹے چھوٹے کمرے تعمیر کئے ہیں جو کپڑے بدلنے اور سنگار کے لئے مخصوص ہیں۔ حوض میں ہمیشہ تازہ پانی رہتا ہے جس طرف پانی گہرا ہے اس جانب کودنے اور پھسلنے کے لئے لکڑی کا اونچا اسٹانڈ اور ڈھلوان تختے رکھے گئے ہیں۔ حوض کے کناروں سے لوہے کے ڈنڈے بھی لگا دئیے گئے ہیں کہ نوآموز تیرتے ہوئے تھک جائیں تو اس کے سہارے دم لیں۔

دھوپوں کے موسم میں تیرنے کا بڑا لطف آتا ہے گرمی اور پسینے سے جب طبیعت پریشان ہو جائے تو اس وقت تازہ تازہ ٹھنڈا پانی فرحت بخش ہوتا ہے۔ یوں بھی تیرنا ایک ہنر ہے۔ ورزش ہے۔ اس سے جسم بنتا ہے خون تازہ پیدا ہوتا ہے۔ سوئمنگ باتھ میں زنانے اور مردانے دونوں کے لئے سہولت ہے۔ ہفتہ میں دو دن سہ شنبہ اور چہارشنبہ زنانے کے لئے مخصوص ہیں سہ شنبہ کو صبح ۶ سے ۱۰ تک اور شام ۴ سے ۶ تک۔

ہمارے ملک کی عورتیں پانی سے ڈرتی ہیں۔ سمندر اور دریا تو بڑی چیز ہے چھوٹا سا تالاب یا کنٹہ ہی دیکھ لیں تو گھبرا جائیں۔ کبھی کسی کو گہرے حوض میں اتار دو تو دیکھو کیسے کیسے تماشے کرتی ہیں۔ چاہئے کہ عورتوں کے دل سے یہ ڈر نکالا جائے۔

تیرنا نہ صرف جسمانی صحت کے لئے ضروری ہے بلکہ اس سے وقت پر جان کی حفاظت بھی ہوتی ہے۔ ابا جان نے ہم سب بہنوں کو تیرنا سکھا دیا ہے۔ پہلے پہل تو ہم مشہور تالاب رامپا اور پاکھال کے نالوں میں ہاتھ پیر مارتے رہے۔ پھر سر سلہ کے ایک کنٹے میں کدو باندھ کر تیرنے لگے اس کے بعد تالاب اور باؤلیوں میں تیرتے رہے تعلقہ کریم نگر کے ایک موضع وڈیارم میں والد صاحب کا کیمپ تھا اس سے قریب ہی ایک بڑی اچھی باؤلی تھی اس میں ہم نے تیرنے کی خوب مشق کی بلکہ بلندی سے پانی میں کودنا بھی سیکھ لیا۔

جو بہنیں سمجھتی ہیں کہ گوشے میں رہنے سے ایسے کام نہیں سیکھ سکتے وہ صحیح نہیں ہے۔ ہم نے گوشے میں تیرنا، سیکل چلانا سیکھا اور گوشے کی پابندی کے ساتھ حیدرآباد سے کئی میل دور نکل جاتے ہیں اور موٹر چلانا سیکھ رہے ہیں۔ ہمارے بھائی موٹر چلانے کی ہم کو تعلیم دیتے ہیں۔ بہنو! گوشے میں رہو اور مردانہ ہنر سیکھو۔

**سلطانہ صبیہ مؤید الدین حسن**

بچے اپنے مضمون اور نظمیں خوشخط لکھ کر بھیجا کریں۔ بہت سے مضمون خراب خط ہونے کی وجہ سے نہیں چھپتے۔

# محمود گاواں

سب ر سی بھائیو! آپ لوگوں نے محمود گاواں کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ یہ قاوان کا باشندہ تھا (جو صوبۂ گیلان میں ہے) اس کے والد کا نام خواجہ محمد تھا۔ محمود گاواں کا خاندان ایران کے وزراء میں باعزت سمجھا جاتا تھا۔

محمود گاواں کا چچا خواجہ شمس الدین گیلان کے بادشاہ امیر محمد کا وزیر تھا۔

محمود گاواں نے تعلیم اپنے وطن عزیز میں پائی۔ اس کی تعلیم اعلیٰ تھی۔ چنانچہ جب جوان ہوا تو اپنے چچا کے ساتھ کاروبار کرتا تھا۔ جب گیلان کی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو محمود گاواں نے اپنے وطن عزیز کو چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ اگر وہ چاہتا تو خود ملک حاصل کرتا یا خراسان و عراق کی وزارت قبول کر لیتا۔ لیکن محمود گاواں نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ اور تجارت کرتا ہوا ہندوستان کی طرف آیا۔ ہندوستان آنے کا مطلب حضرت محب اللہ کرمانی سے ملاقات کرنے کا تھا جو اس زمانہ میں بیدر میں مسکن گزیں تھے۔ بیدر شاہانِ بہمنیہ کا پائے تخت اور عالموں کا مسکن بنا ہوا تھا۔ علاء الدین ثانی جو اس زمانہ میں تخت نشین ہوا تھا خود ایک زبردست عالم اور عالموں کا قدر دان تھا۔ محمود گاواں کو بہت پسند کیا۔ جب اس کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں بادشاہ ہوا تو اس نے محمود گاواں کو شاہی وکیل مقرر کر کے ملک التجار کا خطاب دیا۔

ہمایوں بادشاہ اپنی صفاتِ بد کے سبب ظالم مشہور ہوا تھا۔ لیکن محمود گاواں کا ایسا گرویدہ تھا کہ کبھی بھی اس کی ناقدری نہیں کی۔ لیکن محمود گاواں کا عروج اور اس کے کارنامے نظام شاہ کے عہد میں نظر آتے ہیں۔ نظام شاہ نے جب تخت پر قدم رکھا تو اس کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی اور اس کی ماں خواجہ جہاں ترک (جو ایک معزز وزیر تھا) اور محمود گاواں کے رائے مشورے سے سلطنت کے کاروبار انجام دیتی تھی۔ محمود گاواں وزیر مقرر ہوا اور اس کے خطاب میں اضافہ ہوا۔

جب ہندوستان کے بادشاہوں کو یہ معلوم ہوا کہ بیدر پر ایک آٹھ سالہ بچہ برسرِ حکومت ہے تو ہر ایک نے چاہا کہ سلطنت بیدر کو اپنے قبضہ میں لایا جائے۔ چنانچہ والی اُڈیسہ نے چڑھائی کی تو محمود گاواں اور خواجہ جہاں نے اس کو شکست دی اور پھر والی اوڑیسہ خود تحفہ تحائف دے کر صلح کر لیا۔

اس کے بعد جب محمود شاہ خلجی کے مقابلہ میں اہل بیدر کو نیچا دیکھنا پڑا تو محمود گاواں ہی کی عقل و تدبیر نے محمود شاہ گجراتی کی مدد سے شکست کو فتح سے بدل دیا۔ خواجہ جہاں محمود گاواں جیسے بڑے امیر کی زندگی کا بھی امیرانہ ہونا ضروری ہے لیکن ایسا نہیں تھا بلکہ اس کے بالکل خلاف۔ محمود گاواں فقیروں کی سی زندگی بسر کرتا۔ چٹائی پر سوتا۔ مٹی کی ہانڈی میں پکایا ہوا کھاتا جو کچھ آمدنی تنخواہ سے ہوتی تھی اس کو مساکین اور اہل اللہ میں تقسیم کر دیتا۔ اور ہمیشہ فقیروں اور طالب علموں کے ساتھ برابر کا برتاؤ کرتا۔

کہتے ہیں خواجہ جہاں محمود گاواں ہر جمعہ کو رات میں شہر میں گشت لگاتا۔ غرباء اور بیکسوں کی امداد روپیوں سے کرتا اور ان کو یہ معلوم کراتا تھا کہ یہ بادشاہ سلامت کی جانب سے ان کو ملا ہے۔ یہ تھی بادشاہ سے سچی محبت۔

محمود گاواں ایک زبردست عالم تھا۔ علوم سے اس کو ایسی دلچسپی تھی کہ شہر بیدر میں ایک عالی شان مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ جہاں طالب علموں کو کھانا مفت ملتا اور انھیں تعلیم دی جاتی۔ اُس زمانہ کے رواج کے مطابق مدرسہ کے ساتھ ایک کتب خانہ اور مسجد بھی تھی۔ کتب خانہ میں چیدہ چیدہ کتب مہیا کی گئی تھیں۔ اور قابل قابل لوگ ملازم رکھے گئے تھے۔

محمود گاواں کا بنایا ہوا مدرسہ ابھی تک موجود ہے۔ اس کا ایک مینار ٹوٹ گیا ہے لیکن وہ ابھی اپنے بنانے والے کی یاد کو اپنی عظمت سے تازہ کر رہا ہے۔

محمود گاواں کے دشمن ہمیشہ اس کی برائی میں لگے رہتے۔ ایک روز محمود کے حبشی غلام کو خوب شراب پلا کر وزارت کی مُہر اس خط پر کرالی جو اڑیسہ کے راجہ کے نام لکھا گیا تھا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا۔

"بادشاہ رات دن شراب پیتا ہے اور سلطنت کے کاروبار سے بالکل غافل۔ تم اس موقع کو غنیمت جان کر حملہ کرو۔ میں تمھاری مدد کروں گا اور فتح کے بعد دونوں آپس میں ملک تقسیم کرلیں گے۔"

سلطان یہ دیکھ کر بہت غضبناک ہوا اور جب محمود اس کے سامنے آیا تو اس نے کہا کہ اُس شخص کو کیا سزا دینی چاہیئے۔ جو اپنے مالک سے نمک حرامی کرے۔

محمود گاواں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ اگر قصور ثابت ہوجائے تو اس کی سزا موت ہے۔ محمود گاواں کو خط بتایا گیا۔ اس نے کہا کہ مُہر میری ہے لیکن خط میرا نہیں۔ بادشاہ نے نہ مانا اور قتل کا حکم دے دیا۔ محمود گاواں کی زندگی سے ہم کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

شیخ رحیم الدین (ظہیرآبادی)

# قائم رہیں ازل تک مختاریاں دکن کی

حدِ بیاں سے باہر ہیں خوبیاں دکن کی
دلکش ہیں کیسی کیسی دلچسپیاں دکن کی

دامن نظر کا شب کی بھرتی ہیں نزہتوں سے
بھائی ہیں ہر بشر کو گل کاریاں دکن کی

نظروں سے دشمنوں کی یارب بچا دکن کو
قایم رہیں ازل تک مختاریاں دکن کی

صدیوں رہیں سلامت یارب یہ شاہِ عثماں
ہوں ان کے زیر سایہ آبادیاں دکن کی

ضامن ہے ہر کسی کا ملک دکن ہمارا
ہیں دلربا جہاں کی دلداریاں دکن کی

تہذیبِ مشرقی کا گہوارہ ہے دکن ہی
ہیں مایۂ تفخر خودداریاں دکن کی

یونان و ترک و یورپ، اٹلی و چین و پیرس
حسرت سے دیکھتے ہیں دلچسپیاں دکن کی

تم بھی قمر دعا دو شاہِ دکن کو اپنے
ہیں دم قدم سے جن کے بہبودیاں دکن کی

سید نورالقمر الدین قمر
(بنگلوری)

# عہدِ عثمانی میں حیدرآباد کی ترقیاں

ہم اعلیٰحضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف جاہ سابع کے دور میں نہ صرف آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہے ہیں بلکہ تمدن و معاشرت میں بھی ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہیں مجموعی لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عہدِ عثمانی میں حیدرآباد میدانِ ترقی پر گامزن ہے۔ یورپ جو آج کل ترقی یافتہ ملک مانا جاتا ہے (اگر ترقی کی یہی رفتار رہی تو) حیدرآباد اس کی ہمسری کا دعویٰ کریگا۔ عہدِ عثمانی میں جو ترقیاں ہوئیں وہ کسی اور فرمانروائے حیدرآباد کے دور میں نہیں ہوئی تھیں۔ حیدرآباد نے اس مبارک و سعید دور میں جو زبردست ترقی کی ہے وہ ہمارے پیشِ نظر ہے لیکن ان سب میں اہم تعلیمی ترقی ہے اور بہ حیثیت ایک طالب علم ہونے کے پہلے ہم اسی سے ابتدا کریں گے۔

**تعلیمات:۔** اعلیٰحضرت کا یہ شاندار کارنامہ یعنی جامعہ عثمانیہ کا قیام جو ۱۳۳۷ھ میں عمل میں آیا، رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ یوں تو ہندوستان کے مدبرین و ماہرانِ تعلیم اس بات کو اچھی طرح محسوس کر رہے تھے کہ ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو مگر یہ ایک ایسا بھاری کام تھا کہ پیش قدمی کے لئے جھجکتے تھے لیکن اعلیٰحضرت جیسے حکیم السیاست نے عین بیدار مغزی سے ایسی یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جو آئے دن ترقی کر رہی ہے اور جس سے صدہا امیدیں وابستہ ہیں محکمۂ دارالترجمہ کا قیام اسی سلسلہ میں عمل میں آیا جو غیر زبانوں کا ترجمہ اردو میں کرتا ہے جامعہ عثمانیہ کا مقصد یہ ہے کہ مذہبی، ادبی، فلسفی، تاریخی، طبی، قانونی، تجارتی و دیگر سود مند پیشوں یعنی صنعت و حرفت سکھانے اور ان سب میں تحقیقات اور ترقی کا انتظام کرے۔ یہاں غیر ممالک سے بھی طالب علم آکر فیض یاب ہوتے ہیں۔ اس کی شاندار عمارت اڈیکمیٹ میں واقع ہے۔ جس کے لئے لاکھوں روپے صرف ہوئے اور اب بھی اس کی تعمیر جاری ہے۔ یہاں لائق پروفیسر مقرر کئے گئے۔ جب سے جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا۔ ملک کی عام تعلیمی حالت بھی درست ہونے لگی۔ تعلیمات کو ابتدائی تعلیم رائج کرنے کا جب خیال ہوا تو اس مقصد کے لئے ہوشیار لائق لوگوں کو غیر ممالک بھیجا گیا کہ طریقہ تعلیم وغیرہ دیکھ کر تجربہ حاصل کریں اور پھر اپنے ملک میں ابتدائی تعلیم کو ترقی دیں اس کی مثال ماڈل پرائمری اسکول کا قیام ہے تعلیم کے ساتھ ہی طالب علموں میں اسپورٹس کی بھی مہارت پیدا کی جارہی ہے جس کی وجہ سے وہ بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے مقابلہ کرکے جیت سکتے ہیں۔ پہلے مدارس کی تعداد بہت کم تھی جن میں قابلِ ذکر مدرسہ دارالعلوم، مدرسہ اعزہ، مدرسہ عالیہ وغیرہ ہیں۔ مگر اب ہم دیکھتے ہیں کہ کئی چھوٹے بڑے مدارس اضلاع و بلدہ میں ہوگئے ہیں۔ شہر میں ایک گشتی انٹرمیڈیٹ کالج قائم ہوا جو مدرسہ دارالعلوم کی انگریزی ترقی کا دوسرا نمونہ ہے۔ اس کی عمارت پتھر کی بنی ہوئی ہے یہ نہایت خوبصورت و شاندار ہے۔ کئی مدارس ایسے ہیں جہاں مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے غریب بھی تعلیم پانے سے محروم نہیں رہتے بعض ایسے مدارس بھی ہیں جو مفلس اور معذورین کی تعلیم کے لئے ہیں مثلاً بیت المعذور وغیرہ۔ لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم کو بھی مدنظر رکھا گیا اور اب لڑکیاں لڑکوں سے تعلیم میں پیچھے نہیں رہیں۔

کلیۂ اناث جامعہ عثمانیہ سے ہر سال لڑکیاں بھی ڈگریاں حاصل کرتی ہیں۔ ترقیٔ تعلیم کی وجہ ہے کہ بچے خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کئی علمی ادارے و انجمنیں قائم ہو رہی ہیں۔ جس کا سب سے بڑا مقصد اردو کو ترقی دینا ہے۔ کئی علمی ادبی رسائل و اخبارات شائع ہو رہے ہیں جس میں ایسے مضامین ہوتے ہیں جس سے پڑھنے والوں

سب میں
اخلاق پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ چھوٹے بچوں کے لئے ایسا انتظام ہے کہ کھیل ہی کھیل میں وہ پڑھنا سیکھ لیں ابتدا ہی سے ان کو مفید مشغلوں کی طرف راغب کرتے ہیں جس میں ان کا آئندہ فائدہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی تعلیم کا شوق اور ترقی ان تمام اقدامات کا نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ اب اہل حیدرآباد بیدار ہو چکے ہیں ان میں اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کی قوت پیدا ہو چکی ہے۔ اہل حیدرآباد میں عموماً اور طالب علموں میں خصوصاً علم و ادبیات کا ایک اچھا ذوق پیدا ہو چلا ہے۔ جس کی وجہ سے امید ہے کہ ان کی ادبی خدمات آئندہ ہندوستان میں حیدرآبادیوں کا بہترین کارنامہ ثابت ہوں گی۔ اس سے صاف ظاہر ہوا کہ عہد عثمانی میں تعلیم میں نمایاں ترقی ہوئی۔

**تعمیرات و آبپاشی:-** عہد عثمانی میں تین بڑے تالاب بنائے گئے جو عثمان ساگر، حمایت ساگر اور نظام ساگر کے نام سے موسوم ہیں۔ نظام ساگر کا شمار ہندوستان کے بڑے تالابوں میں ہو سکتا ہے۔ ان تالابوں کی تعمیر میں کئی لاکھ روپے صرف ہوئے اور بنانے والوں کی غیر معمولی قابلیت کا اظہار ہوا لیکن ان کی اہمیت کا صحیح اندازہ جب ہوتا ہے کہ ان کے فوائد پر نظر کی جائے۔ ہزارہا ایکڑ زمین جو بنجر پڑی تھی قابل زراعت و زرخیز ہو گئی جو اس وقت اور آئندہ ملک کی عام معاشی ترقیوں کی ضامن ہے۔ بے روزگاروں کے لئے یہ ایک ذریعہ معاش پیدا ہو گیا چنانچہ نظام ساگر کینل کے اطراف معاشی و زراعتی جد و جہد کے خوشگوار مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ عثمان ساگر سے نلوں کے ذریعہ پانی شہر میں پہنچایا جاتا ہے تقریباً ہر چھوٹے بڑے محلوں میں نل موجود ہیں جس سے غرباء کو بھی پانی لینے کی آسانی ہو گئی ہے۔ عثمان ساگر کے اطراف خوبصورت و خوشنما باغ لگائے گئے ہیں کہ رعایا وہاں آ کر سیر کرے اور پانی سے لطف اٹھائے بعض جگہ تفریحات کے لئے کھیل تماشوں کا بھی انتظام ہے۔ ان تالابوں سے آب پاشی و آب رسانی کا کام لیا جاتا ہے۔

دور عثمانی میں تعمیرات میں بھی کافی ترقی ہوئی۔ اس زمانے کی قابل ذکر مشہور عمارتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

جوبلی ہال، جوبلی پویلین، معظم جاہی مارکٹ، نظامیہ شفاخانہ، عثمانیہ دواخانہ، ہائی کورٹ، سٹی کالج، عمارات جامعہ عثمانیہ وغیرہ یہ عمارتیں نئی وضع پر مستحکم بنائی گئی ہیں جو صدیوں تک یادگار رہیں گی۔ شہر کی ہر شاہ راہ اور ہر گلی کی سڑکیں سمنٹ کی بنائی گئی ہیں جس سے پیدل چلنے والوں کی آمد و رفت میں بہت آسانی ہو گئی ہے۔ اضلاع میں میٹل اور مرم کی سڑکیں بنائی گئی ہیں جو باوجود بسوں کی آمد و رفت کے کئی دن تک اچھی حالت میں رہ سکتی ہیں۔ پہلے شہر میں جب کوئی سواری گذرتی تو کئی منٹ تک دھول اڑتی اور راستہ چلنے والوں کو بہت دشواری ہوتی۔ لوگ مختلف امراض میں گرفتار ہوتے مگر اب ہم دیکھتے ہیں باوجود موٹروں کی تیز رفتاری کے لوگ بہ آسانی گزر جاتے ہیں۔ غریب رعایا کے لئے ملے پلی میں کئی ہزار مکانات بنوائے گئے جو کم شرح پر کرایہ پر دئے جاتے ہیں۔ کئی مسافر خانے و خانقاہیں رعایا کی سہولت و آرام کے لئے بنائی گئی ہیں۔

**آرائش بلدہ:-** اس محکمہ کا قیام سنہ ۱۳۲۲ف میں ہوا۔ اس محکمہ کے تفویض شہر کی آرائش و زیبائش اور حفظان صحت ہے۔ اس محکمہ کے صدر شہزادہ والا شان نواب معظم جاہ بہادر ہیں جب خود ہمارے شہزادے کی صدارت میں اس کا انتظام ہے تو ظاہر ہے کہ یہ کام کس قدر بہتر ہوگا چنانچہ اس محکمہ میں بہت ترقی ہو رہی ہے۔ تعمیرات کا بھی اس میں دخل ہے یہ محکمہ بہت اہم ہے کیونکہ بڑی شہر کی آرائش کا ذمہ دار ہے۔ باغ عامہ جو ایک بہترین و مشہور تفریح گاہ ہے وہاں اس محکمہ کی جانب سے

... کا انتظام ہوا ہے۔ ... بہت سے باغ لگائے گئے جیسا ... ان کے نام سے موسوم ہیں۔
رات کے وقت روشنی کا دیدہ زیب انتظام ہوتا ہے جس سے ... کا چمن باغ فردوس نظر آتا ہے اکثر محلوں میں اس طرح
کے پارک بچوں اطفال بنائے گئے ہیں جن میں بچوں کے مختلف کھیلوں اور ورزش جسمانی کے سامان نصب کئے گئے ہیں۔ حسین ساگر
... کا بھی انتظام ہے وہاں کی سڑک بجائے سمنٹ کے تارکول ڈامبر کی بنی ہوئی ہے مگر وہ بھی بہت صاف اور کشادہ ہے۔

**صنعت و حرفت** :۔ عہد عثمانی میں صنعت و حرفت میں بھی حیدرآباد کسی ملک سے پیچھے نہیں ہے جو جو چیزیں انگلستان، امریکہ
اور دوسرے ممالک غیر سے آتی ہیں وہ سب حیدرآباد سے بھی دستیاب ہو سکتی ہیں پہلے بھی حیدرآباد میں کئی چیزیں بنتی تھیں مگر اس شہر کا
نام ایسے کام میں اس قدر مشہور نہ ہوا تھا لیکن اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ حیدرآباد کا شمار صنعتی شہروں میں ہونے لگا ہے یہاں کی مخصوص
و مشہور صنعتیں یہ ہیں۔ بیدر کا بیدری کام، کریم نگر کا جالی کا نقرئی کام، نظام آباد کا لکڑی کا کام، ورنگل کے قالین، اورنگ آباد کے ہمرو
مشروع و کمخواب، بلدہ کا لکڑی کا کام، بید بافی، سگریٹ فیاکٹری، بٹن فیاکٹری، کاغذ سازی، لوہے کا کام، ہاتھی دانت کا کام، سمنٹ کا کام
وغیرہ وغیرہ۔ بعض ایسی قابل دید صنعتیں ہیں کہ جن کی اصلیت پر شبہ ہوتا ہے کہ مثلاً تانبے کے ورک کی چیزوں کو دیکھئے ایسی معلوم ہوتی ہیں
جیسے چینی کی بنی ہوئی ہیں جن کو دیکھنے کے بعد یہ کہہ سکتے ہیں کہ "حیدرآباد کی مٹی چینی بن گئی"۔ اکثر ان چیزوں کی نمایش بھی کی جاتی
ہے۔ چنانچہ حال ہی میں باغ عامہ میں مصنوعات ملکی کی نمایش منعقد ہوئی تھی جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ صنعت میں بھی دورِ عثمانی
میں کس قدر ترقی ہوئی ہے۔

**ریلوے** :۔ (ذرائع آمد و رفت) عہد عثمانی میں آمد و رفت کی آسانی کے لئے ریلوے و ریلوے بس جاری ہوئے پہلے کئی دن
ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے درکار تھے۔ مگر اب انہی ریلوں اور بسوں کی وجہ ہے کہ صرف چند گھنٹوں میں آرام و سہولت کے ساتھ
ہم منزل مقصود پر پہنچ سکتے ہیں۔ پہلے ریلوے کمپنی کے حوالے تھی اب سرکار عالی کے اختیار میں ہے۔ پہلے نظام گیر نٹیڈ ریلوے کہلاتی
تھی اب نظام اسٹیٹ ریلوے کہلاتی ہے۔ بسیں کم شرح پر رعایا کو اکثر بغرض تفریح ایلورا، اجنٹا، نظام ساگر، علی ساگر، عثمان ساگر وغیرہ
لے جاتی ہیں۔ اور ہم انہی بسوں اور ریلوں کے ذریعہ آرام کے ساتھ ممالک محروسہ کی سیر کر سکتے ہیں اس سے ظاہر ہوا کہ ذرائع
آمد و رفت میں بھی ترقی ہوئی۔

**برقی روشنی** :۔ دورِ عثمانی میں ہر چھوٹے بڑے گھر میں برقی روشنی کا انتظام ہوا۔ راستوں پر سرکاری طور سے
... روشنی کی جاتی ہے اور جب کوئی مشہور شخص حیدرآباد آتا ہے تو پورے شہر کو برقی روشنی سے بقعۂ نور بنا دیا
جاتا ہے۔ مشہور تاریخی عمارتوں مثلاً چار مینار، ٹاؤن ہال وغیرہ پر دیدہ زیب روشنی کا انتظام کیا جاتا ہے۔

**قیام نشر گاہ و لاسلکی** :۔ عہد عثمانی ہی میں نشر گاہ و لاسلکی کا قیام عمل میں آیا جس سے ہم گھر بیٹھے دور دور کی خبریں سن
سکتے ہیں ... چند دن قبل ... کی واردات ... کہ ہم کو کتنی ... کہ ... جو جنگ شروع ہونے
... وغیرہ اور ... کا ... ہے ... کی ... جس روز کے
... لاسلکی اسٹیشن ... کے لئے روزانہ ایک گھنٹہ کا پروگرام رکھا گیا ہے جس سے ان کو ابتدائی عمر ہی
... کے خیالات ... اور ... ہے عہد عثمانی کا یہ بھی ایک

بہترین کارنامہ اور ترقی حیدرآباد کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ سنا جارہا ہے کہ اس کا اسٹیشن شاندار پیمانہ پر سرورنگر کے ایک پرفضا مقام پر کوچہ چراغ علی سے منتقل ہونے والا ہے

**عدالت و کوتوالی**: جب تک کہ کسی ملک میں امن و امان قائم نہ رہے اس وقت تک وہ ملک خوش حال کہلانے کا مستحق قرار نہیں دیا سکتا۔ اسی وجہ سے ان دو محکموں یعنی محکمہ کوتوالی و عدالت کا قائم کرنا ضروری سمجھا گیا دور عثمانی میں نئے سپاہیوں کو تعلیم دے کر پولیس میں بھرتی کیا جاتا ہے ان کا ایک علیحدہ مدرسہ قائم ہے۔ پولیس کے گشتی دستے رات دن راستوں پر پہرے دیتے رہتے ہیں۔ جس سے ہر طرف اطمینان و خوش حالی پھیلی ہوئی ہے۔ چھوٹے مقدموں کا تصفیہ عدالت خفیفہ میں ہوتا ہے اور بڑے مقدموں کا عدالت العالیہ میں ہوتا ہے۔

یہ مضمون یعنی "عہد عثمانی میں حیدرآباد کی ترقیاں" اتنا دلچسپ ہے کہ اگر ایک ایک ترقی کا علیحدہ علیحدہ تفصیلاً ذکر کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے مگر نہ ہم میں اتنی لیاقت نہ اس قدر لکھنے کی ہم کو فرصت لیکن ان مختصر حالات سے بھی جو یہاں لکھے گئے ہیں بہ آسانی ثابت ہو سکتا ہے کہ عہد عثمانی میں ہر چھوٹے بڑے شعبے میں قابل ذکر ترقی ہوئی اور یہ دور اس قابل ہے کہ تاریخ دکن میں زریں الفاظ سے لکھا جائے عہد عثمانی کے قابل قدر کارنامے ہمیشہ ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

دعا ہے کہ حیدرآباد عہد عثمانی میں یونہی ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے اور اس عہد بابرکت سے فیض یاب ہوتا رہے ؎

الٰہی تو سرسبز رکھ اس چمن کو — الٰہی منور رکھ اس انجمن کو
الٰہی تو رکھ شاد اہلِ وطن کو — رعایا کو بھی اور شاہِ دکن کو

شاد

**معین الدین احمد انصاری**

---

# چاند سلطانہ

چاند سلطانہ اپنے زمانے کی عورتوں میں سب سے زیادہ دانشمند اور خوبصورت تھی۔ یہ انگلستان کی ملکہ الزبتھ کی ہم عصر تھی۔ احمد نگر کے شاہی خاندان کی یہ ممتاز لڑکی ایک باکمال موسیقی داں ہونے کے علاوہ ماہر السنہ بھی تھی۔ اس کو ترکی، فارسی اور عربی زبانوں پر کافی عبور تھا۔

کم سنی ہی میں اس کی شادی بیجاپور کے بادشاہ علی عادل شاہ سے ہوئی۔ علی عادل شاہ کو اپنی بیوی سے اس قدر محبت تھی کہ اس نے کوئی دوسری شادی نہیں کی۔ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا چاند سلطانہ کی غیر معمولی قابلیت کا اظہار ہوتا گیا۔ اس نے کئی بہترین عمارتیں تعمیر کرائیں جس سے اس کے دارالسلطنت کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا۔ ہر تعمیر کا کام بڑے وسیع پیمانہ پر ہوتا تھا۔ وہ عالی شان مسجد جو اس نے تعمیر کروائی تھی صرف دہلی کی جامع مسجد سے چھوٹی ہے۔ "چاند باؤلی" ایک بڑا عالی شان ذخیرۂ آب ہے۔ جس سے بیجاپور میں آب رسانی کا کام لیا جاتا ہے۔ اور یہ چاند بی بی کی بہترین یادگار ہے جس کی دنیا میں نظیر نہیں۔

سنہ ۱۵۸۰ء میں جب کہ اس کی خوش نصیبی اوجِ کمال پر تھی۔ سلطان علی عادل شاہ کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت چاند سلطانہ کی عمر ۲۹ سال کی تھی۔ علی عادل شاہ لاولد ہونے کی وجہ سے اس کا کمسن بھتیجا سلطنت کا وارث قرار پایا اور چاند سلطانہ اس کمسن بادشاہ کی نیابت کے فرائض انجام دینے لگی۔ سلطانہ نے اپنے شوہر کی یادگار میں ایک عظیم الشان مقبرہ تیار کروانا شروع کیا لیکن اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے اس عجیب و غریب مقبرہ کی تعمیر مکمل نہ ہو سکی۔ اپنی نیابتِ شاہی کے زمانے میں چاند بی بی نے سلطنت بیجاپور کو طاقتور بنا دیا اور نہایت عقلمندی کے ساتھ حکومت کی۔ چاند بی بی دربار میں اپنے چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے سلطنت کے تمام کام انجام دیتی تھی۔ آخر کار اس کی نیابت کا زمانہ ختم ہوگیا اور اس کے شوہر کا بھتیجا ابراہیم ثانی تخت نشین ہوا۔ چاند بی بی کو سلطنت کے کاموں سے نجات ملی۔ لیکن جب کبھی بادشاہ باہر چلا جاتا تو سلطانہ سلطنت کے کام انجام دیا کرتی۔

اس فرصت کے موقع کو غنیمت جان کر چاند بی بی اپنے وطن احمد نگر کو گئی۔ اس وقت احمد نگر میں ایک خاندانی جھگڑے نے بڑھتے بڑھتے بغاوت کی شکل اختیار کر لی تھی اور چاند بی بی کا باپ اور بھائی دونوں لڑائی میں مصروف تھے۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے چاند سلطانہ نے بیجاپور کی فوجوں کو طلب کیا اور اس طرح احمد نگر میں امن قائم ہوگیا۔

کچھ دنوں بعد اس کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اور احمد نگر میں اس کو اپنے بھتیجے بہادر نظام شاہ کی طرف سے نیابت شاہی کرنی پڑی۔ لیکن اس وقت بھی اس کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ سلطنت کے اور چار دعویدار پیدا ہوگئے۔ قبل اس کے کہ یہ نہ ختم ہونے والی خانہ جنگیاں چھڑیں۔ شہنشاہ اکبر کی فوج دکن پر حملہ آور ہوئی۔ چاند بی بی نے جب یہ دیکھا کہ یہ تقسیم شدہ سلطنت آسانی سے مغلوں کے قبضے میں آ جا سکتی ہے تو اس نے شاہ بیجاپور سے مدد مانگی اور ان چاروں دعویداروں سے درخواست کی کہ وہ سب مل کر اس دشمن کا مقابلہ کریں جو سب کے لئے تباہی کا باعث ہے۔

ان شہنشاہی فوجوں نے جو شہزادہ مراد کی سرکردگی میں روانہ ہوئی تھیں شہر کا محاصرہ کر لیا۔ سلطنت کا دعویدار

بیجاپور کی فوج کے ساتھ مل گئے جو محصور شہر کی حفاظت کر رہی تھی۔ مغلوں نے نہایت شدومد کے ساتھ شہر کا محاصرہ کر لیا۔ چاند بی بی شہر کے انتظامات کرنے لگی اور خود زرہ بکتر پہنے اور کبھی کبھی چہرے پر نقاب ڈالے لڑائی کی مصیبتوں کا ایک بہادر سپاہی کی طرح مقابلہ کرتی رہی۔ اس نے نہایت دلیری سے غنیم کے اکثر حملوں کو روکا۔ مغلوں نے دو مرتبہ فصیل میں سرنگیں لگائیں لیکن چاند بی بی کی چوکسی نے ان کو کامیاب ہونے نہ دیا لیکن تیسری دفعہ کی سرنگ نے قلعہ کی دیوار میں ایک بڑا رخنہ ڈال دیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ چاند بی بی دوسرے انتظامات میں مشغول تھی اور اس سرنگ کی اس کو خبر نہ ہونے پائی۔ ان مسلسل ہمت شکن حملوں سے سلطانہ کی فوج اس قدر پریشان ہوئی کہ بغیر مدافعت کے اپنی جگہ چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ چاند سلطانہ بغیر پس و پیش کئے چمکدار زرہ بکتر پہنی ہوئی اور ننگی تلوار کھینچے ہوئے بہادری کے ساتھ اس رخنہ میں گھس پڑی۔ اس کی بہادری کو دیکھنے کے بعد اس کی فوج نے بھی فصیل سے باہر نکل کر دشمن کے حملہ کی مدافعت کی۔

مغل سپہ سالار نے اپنے سپاہیوں کی جانوں کی کوئی پرواہ نہ کر کے فصیل کی دیواروں کی طرف بندوقیں لگوا دیں لیکن جو فوج قلعہ کی حفاظت کے لئے متعین کی گئی تھی اندر سے نہایت ہی بہادری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرتی رہی لیکن رات ہو جانے کی وجہ سے حملہ ناکام رہا اور دونوں فوجوں کو سخت نقصان پہنچا۔ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر بہادر سلطانہ نے جتنے آدمی مل سکے ان سب کو جمع کیا اور دیواروں میں جو رخنے پڑ گئے تھے ان کو راتوں رات بند کرا دیا۔ صبح ہوئی تو دشمن کی فوج نہایت پریشان ہو گئی کیونکہ قلعہ فتح کرنے کے لئے ان کو از سر نو سرنگیں کھودنی ضروری تھیں۔ اب ایسا معلوم ہونے لگا کہ بیجاپور کی فوج شہر سے دشمن کو باہر نکال دے گی۔ شہزادہ مراد یہ نہیں چاہتا تھا کہ جنگ کو جاری رکھ کر اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالے حالانکہ اس کی فوج بیجاپور کی فوج سے کہیں زیادہ بہتر تھی۔ اس نے مناسب یہ سمجھا کہ عارضی صلح کر لی جائے۔ چنانچہ ۱۵۹۶ء میں جنگ ختم ہو گئی۔ اور برار مغلوں کے حوالہ کر دیا گیا۔

چاند سلطانہ پھر نائب بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کرنے لگی اس کے وزیر اعظم محمد خاں نے خود بادشاہ بننے کی خاطر شہزادہ مراد سے سازش شروع کی کہ وہ اس کی مدد کرے۔ دوبارہ بہادر سلطانہ نے دریائے گوداوری کے کنارے مغل فوج کا مقابلہ کیا۔ اور دو دن تک گھمسان لڑائی ہوئی۔ شہنشاہ اکبر چاند بی بی کی اس غیر معمولی بہادری اور اپنی فوج کی شکست کی خبر سن کر بہت پریشان ہوا اور اپنے تجربہ کار سپہ سالار عبدالعزیز کو دکن روانہ کیا۔ مگر جب اس سے بھی کچھ بن نہ پڑا تو خود پنجاب کو چھوڑ کر دکن کا رخ کیا۔ اس نے سب سے پہلے دولت آباد اور کئی پہاڑی قلعے فتح کئے۔ اور شہزادہ دانیال کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ چاند بی بی کے پاس بھیجا تاکہ اس کو اطاعت کرنے پر مجبور کرے۔ جب مغل احمد نگر کے قریب پہنچے تو شہر سے باہر ایک فوج آتی ہوئی دکھائی دی جس کا سپہ سالار نہنگ نامی حبشی تھا۔

نہنگ شہنشاہی فوج کو آتے دیکھ کر راستے سے ہٹ گیا اور مغل فوج احمد نگر میں داخل ہو گئی۔ سلطانہ نہنگ کی منافقانہ فطرت سے خوب واقف تھی۔ لہٰذا اس نے شہنشاہ سے صلح کر لی۔

محمد خاں اس صلح سے فائدہ اٹھا کر رعایا کو سلطانہ کے خلاف ابھارا اور سلطانہ قتل کر دی گئی۔ شہزادہ دانیال سلطانہ کے قتل کر دیئے جانے سے متاثر ہو کر شہر کو تباہ و برباد کر دیا اور کمسن بادشاہ کو قید کر کے گوالیار روانہ کر دیا۔

ہے

بیجاپور اور احمد نگر کی چاند سلطانہ اپنے زمانہ کی سب سے مشہور خاتون ہے۔ اس نے اپنی ذاتی قابلیت اور بہادری سے اپنے دشمنوں کو کئی مرتبہ شکست دی جب اس کو سلطنت کے کاموں سے فرصت ہوتی تو وہ نقاشی اور موسیقی سے اپنا دل بہلاتی۔

مورخوں کا بیان ہے کہ وہ ایک سادہ مزاج، سخی، صاف گو، رحم دل، باعصمت، اور خداترس عورت تھی اور اپنے زمانہ کی عورتوں میں ایک ہیرا تھی۔

(ترجمہ) مرزا شاہد علی خاں

---

# رُودِ مُوسیٰ

یہ حیدرآباد دکن کی خاص ندی ہے جسے رُودِ موسیٰ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ مغربی پہاڑوں سے نکل کر ریاست حیدرآباد کے ایک وسیع خطۂ ارض کو سیراب کرتی ہوئی بیچوں بیچ شہر حیدرآباد سے گذر کر دریائے کرشنا سے جو دکن کا ایک بڑا اور قدیم دریا ہے جا ملتی ہے۔

فروری سنہ ۱۹۳۳ء کو جب کہ وائسرائے ہند کی تشریف آوری کے موقع پر میں حیدرآباد گیا ہوا تھا۔ اس یادگار زمانہ شہر کی زیارت کی اور یہاں کی جدید و قدیم یادگاریں دیکھ کر اپنی عقیدت و خوش بختی کی آنکھیں روشن کیں۔

ایک روز شام کو نئے پل سے رودِ موسیٰ کے ساحل کا نظارہ کیا۔ اس خوش فضا، دلکش، جاذبِ نظر کیف آرا منظر کو دیکھ کر روح نے وجد کیا۔ تاریخ حیدرآباد کے گذشتہ واقعات کی ایک جیتی جاگتی زندہ تصویر نظر کے سامنے آگئی اور شاعر نہ ہونے کے باوجود یہ معذول نغمہ میرے خاموش سازِ دل سے ادا ہوا۔

رُودِ موسیٰ رُودِ موسیٰ تیرا یہ دلکش سماں
تجھ میں ہے حبِ وطن کا جذبۂ آبِ رواں

تو ہے دریا چھوٹا سا یا رحمتِ عالم ہے تو
دیکھنے میں خرد لیکن موسیٰ اعظم ہے تو

آج کل خاموش کیوں ہے سچ بتا اے رازداں
باغبانی کر رہا شاید کہ ہے آبِ رواں

ہے دکن میں بادشاہی دور کا آغاز تو!
اک زمانہ سے رہا ہے ہمدم و ہم ساز تو

راج بھوی کے گلے میں شہ رگِ اعظم ہے تو
خون ہے آبِ رواں اور رحمتِ عالم ہے تو

تجھ سے بڑھ کر کون جانے تو بتا پوشیدہ راز
تیرے ساحل ہی پہ ٹھیرا تھا قلی قطب کا جہاز!!!

اِن بھٹکتے قافلے کا تو ہی خضرِ راہ ہے
تو ہماری آصفی تاریخ سے آگاہ ہے

تیرا ہر قطرہ تمنا آرزو ارمان ہے
ہر نفس میں تیرے زندہ باد یا عثمان ہے

فخرالدین ارماںؔ (کجگرگ شریف)

# "خدابندے" سے

(قیدی بادشاہ کی اپنے فرزند خدابندہ سے آخری گفتگو)

تاناشاہ کی آخری گفتگو

جو دنیا تھی ہماری اب وہی دنیا ستائے گی ۔۔۔ کلی بھی خار بن کر تیرا نازک جی دکھائے گی
غرض سو سو طرح سے زندگانی آزمائے گی ۔۔۔ فقط تقدیر تیرے حال پر آنسو بہائے گی

ستم تو نے نہیں دیکھا، جفا تو نے نہیں دیکھی
ابھی بچہ ہے، دنیا کی ہوا تو نے نہیں دیکھی

ان آنکھوں سے وطن والوں کا غم دیکھا نہیں جاتا ۔۔۔ ستم ناآشناؤں پر ستم دیکھا نہیں جاتا
فلک کے کاکلوں کا پیچ و خم دیکھا نہیں جاتا ۔۔۔ غلامی چھین لے ہم سے بھرم! دیکھا نہیں جاتا

دیا تھا جس نے سکھ ہم کو اسے میں کیا سناؤں گا
میں اپنی بے گناہی اپنے خالق کو دکھاؤں گا

مرے دل کی تمنا، ماہ پارے، جا رہا ہوں میں ۔۔۔ نہ گھبرا، زندگانی کے سہارے، جا رہا ہوں میں
خدا حافظ، مری آنکھوں کے تارے، جا رہا ہوں میں ۔۔۔ خدا رکھے تجھے خوش، غم کے مارے جا رہا ہوں میں

جہنم سے اٹھا کر خلد میں آباد کرتی ہے
مجھے رنج اسیری سے اجل آزاد کرتی ہے

خزاں کے جور سے تو نے وفاداری نہ کھو دینا ۔۔۔ ہجوم یاس میں احساس غمخواری نہ کھو دینا
طلسم خواب کی قیمت میں بیداری نہ کھو دینا ۔۔۔ کہ تو خوددار کا بیٹا ہے خودداری نہ کھو دینا

مجھے ڈر ہے، نہ گھبرا جائے تو نازوں کا پالا ہے
خدا رکھے تجھے تو "گولکنڈہ" کا اجالا ہے

جگا تقدیر کو پھر دولت بیدار پیدا کر ۔۔۔ نہ اندازہ دگر ہنگامۂ بازار پیدا کر
ارادے میں بلندی ہاتھ میں تلوار پیدا کر ۔۔۔ جو ممکن ہو تو خارستان میں گلزار پیدا کر

تجھے میری قسم منت کش احسان بن جانا
"خدابندے" خدارا "بندۂ سلطان" نہ بن جانا

میکش

# مزارِ عالمگیر

کس قدر دلدوز صیادِ اجل کا تیر ہے
دیر سے آسودۂ خوابِ ابد نخچیر ہے

خاک کا تودہ نہیں، یہ قبرِ عالمگیر ہے
بادشاہ ہو یا گدا سب کی یہی تقدیر ہے

پل میں سب کس بل نکل جاتے ہیں جب آتی ہے موت

جسم ہی کیا شان و شوکت کو بھی کھا جاتی ہے موت

ہاں! یہ مشتِ خاک ہی تھا مالکِ ہندوستاں
تیغ گردن تھی جس کی خون کے دریا رواں

حکم سے جس کے برستی تھیں سروں پر بجلیاں
جس کی ہیبت سے لرزتے تھے زمین و آسماں

آج آغوشِ لحد میں کس قدر خاموش ہے

ہوش والا اب ہمیشہ کیلئے بیہوش ہے

صاحبِ سیف و قلم تھا، صاحبِ کردار تھا
موت کی ضرب سے کاری جس کا ادنیٰ وار تھا

جس کا غصہ فرقِ دشمن کیلئے تلوار تھا
جس کے دم سے ہند سارا عرصۂ پیکار تھا

زندگی جس کی سراسر اک مسلسل جنگ تھی

جس کے دشمن کیلئے ساری خدائی تنگ تھی

جس کی تیغِ تیز تر تھی برشِ شمشیر سے  
جس نے تقدیریں بدل دیں فوج کی تدبیر سے

بچ سکا خاطی نہ ہرگز جس کی دار و گیر سے  
ہے عیاں شانِ سیاست جس کی ہر تحریر سے

موت نے جوہر مٹا ڈالا اُس شمشیر کا  
ایک ہی سیلی میں منکا ڈھل گیا تدبیر کا

جو لیا کرتا تھا راجوں اور مہاراجوں سے باج  
فوجیوں نے جس کے چھینے سیکڑوں شاہوں کے تاج

خود سروں کے جس نے دم میں ٹھیک کر ڈالے مزاج  
قبر کے پنجہ میں مٹی کی طرح بے بس ہے آج

ایک ہی انجام ہے کمزور اور شہ زور کا  
پیس کر دونوں کو رکھ دیتا ہے کونا گور کا

عمر ڈھلتی دھوپ ہے اس کی حقیقت کچھ نہیں  
مال و دولت سب عبث ہیں شان و شوکت کچھ نہیں

شادی و غم دو گھڑی کے عیش و راحت کچھ نہیں  
سارے خالی ڈھول ہیں اقبال و عظمت کچھ نہیں

صاف سیدھا فیصلہ ہے یہ دلِ آگاہ کا  
نقش مٹ جاتے ہیں سب رہتا ہے نام اللہ کا

سکندر علی وجد

# "گولکنڈہ" کے زائر سے

چشمِ زائر! دیدۂ دل کی نگاہیں چاہئیں
آنکھ میں آنسو کا دریا، لب پہ آہیں چاہئیں

خود کو پہلے اس جہاں کی دید کے قابل بنا
ذرے ذرے کو یہاں کے رہبرِ منزل بنا

حق شناسی چاہئے اس آستانے کیلئے
دل میں پیدا کر تڑپ، آنسو بہانے کیلئے

آنسوؤں میں درد، آہوں میں اثر بھی چاہئے
دیکھنے کے واسطے ذوقِ نظر بھی چاہئے

یادِ ماضی چھوڑ دے جب فکرِ مستقبل نہیں
اشک افشانی سے کیا حاصل جو سوزِ دل نہیں

اپنے آئینے میں دیکھا ہے کبھی اپنا جمال
کیا تجھے آتا ہے گم کردہ بلندی کا خیال

غیر کی چوکھٹ پہ سجدہ کر کے اتراتا ہے تو
نور ہو کر جلوۂ باطل میں کھو جاتا ہے تو

زندگی آزار ہے، چہرے پہ غم کا رنگ ہے
ہاتھ ٹوٹے ہیں ترے، تیغوں پہ تیری زنگ ہے

عمر کتنی ہے مگر بے کیف ہے تیرا شباب
تیری آنکھوں سے ہٹے گا کب غلاکت کا نقاب

تجھ کو کر دے گی فنا اک روز بیہوشی تری
ختم بھی ہوگی کبھی یہ خود فراموشی تری

حریت کے نام سے ذہنی غلامی چھوڑ دے
سوزِ کامل مانگ، سوزِ ناتمامی چھوڑ دے

ان شکستہ بام و در کو تو نے پہچانا نہیں
شان و شوکت کا یہ قبرستان ہے جانا نہیں

سو رہی ہیں رونقیں، ویرانیاں بیدار ہیں
سن سکے تو سن کہ ذرے مائلِ گفتار ہیں

اس قفس میں اب بھی کتنے آشیاں آباد ہیں
دیکھ اس جنگل میں کتنے گلستاں آباد ہیں

تیری من بیتی ہے افسانہ سمجھتا ہے جسے
شمعِ آبادی ہے ویرانہ سمجھتے ہیں جسے

گر رہا ہے خود ہی جو اس کو اٹھا سکتا ہے کون؟
کور چشموں کو رہِ منزل دکھا سکتا ہے کون؟

میکش

# ادارۂ کی خبریں

ادارۂ ادبیاتِ اردو نے اپنے دائرۂ عمل کو وسیع تر کرنے کے لئے مختلف شعبے قائم کر دئے ہیں تاکہ تقسیمِ کار کے باعث آسانی کے ساتھ ہر کام اپنے حلقہ میں بروقت ہوتا رہے۔ حسنِ اتفاق سے جن اصحاب نے مختلف شعبوں کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے وہ ملک میں اپنے علمی کاموں کے باعث کافی مشہور ہیں۔ ان شعبوں کی جانب سے ہمیں دسمبر کی روئدادیں وصول ہوئی ہیں جن کو اجمالی طور پر ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

## شعبۂ زبان

شعبۂ زبان کا جلسہ ۹ دسمبر ۳۷ء کو منعقد ہوا جس میں یہ اصحاب شریک تھے۔ پروفیسر سروری ایم اے ایل ایل بی۔ ڈاکٹر زور ایم اے پی ایچ ڈی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ڈی لٹ۔ ڈاکٹر جعفر حسن پی ایچ ڈی، پروفیسر ہیڈلے، منشی دھرم دیا الکار، سید محمد صاحب ایم اے، پروفیسر ضیاء الدین انصاری ایم اے بی ایس سی اور ناظمِ شعبہ۔ اس جلسہ میں اردو زبان کے مختلف پہلوؤں پر بحث رہی اور حسبِ ذیل امور طے پائے کہ (۱) اردو زبان پر عربی اور فارسی کا اثر قدرتی ہے اس لئے لسانی وسعت کے پیشِ نظر ان لفظوں کو جو پہلے سے موجود ہیں باقی رکھ کر نئے لفظوں کی جو لائے جا رہے ہیں جانچ کی جائے کہ کونسے ہم نسبہ لے لینے کے قابل ہیں۔ کن کو کسی قدر تبدیلی کے ساتھ اپنا بنالیا جا سکتا ہے اور کن کے لئے اردو لفظوں کے وضع کرنے کی ضرورت ہے۔

(۲) زبان کو سہل بنانے کے لئے لفظوں کی جمع اردو کے قاعدے سے بنائی جائے مثلاً کتاب کی جمع کتابیں نہ کہ کتب (ب) اضافی اور توصیفی مرکب اردو کے قاعدوں سے بنائیں مثلاً جماعت سالِ اول کی جگہ پہلے سال کی جماعت استعمال کریں تو مناسب ہے (ج) عربی علامت "ال" سے پرہیز کیا جائے مثلاً بین الاقوامی کی جگہ بین قومی۔

(۳) مرکب لفظ بنانے کے لئے بعض فارسی لاحقے بہت کارآمد ہیں مثلاً خانہ، نامہ، دار وغیرہ ان کو اردو لفظوں کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے۔ مثلاً باورچی خانہ، چھاپہ خانہ (مطبع)، گھڑی ساز، سمنٹ کاری، پچی کاری وغیرہ۔

(۴) اردو میں تذکیر و تانیث کا بہت جھگڑا ہے اس لئے اختلافی لفظوں کی ایک فہرست ترتیب دی جائے گی اور اردو کے مختلف مرکزوں سے ان کی تذکیر و تانیث کے متعلق استفسار کیا جائے گا۔

(۵) اردو میں املا کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ املا کے متعلق آئندہ غور کیا جائے گا۔

(۶) کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ سرکاری دفتروں کی زبان کی اصلاح کی طرف متعلقہ عہدہ داروں کو ادارہ کی طرف سے توجہ دلانی چاہئے

## شعبۂ شعراء و مصنفین

۱۱ دسمبر ۳۷ء کو اس شعبہ کا پہلا جلسہ منعقد ہوا۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر، ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، نواب میر سعادت علی صاحب رضوی ناظم اور سید محمد صاحب وغیرہ موجود تھے۔ حسبِ ذیل قرار دادیں منظور ہوئیں۔

(۱) حیدرآباد سے ایسے شاعروں کی ایک فہرست مرتب کی جائے جن کا ذکر مرقع سخن میں نہیں آیا ہے۔ ممکن ہو تو ان شاعروں کے متعلق مرقع سخن کی تیسری جلد شائع کرائی جائے۔ یہ کام نواب میر سعادت علی صاحب رضوی کے تفویض کیا گیا۔

(۲) حیدرآباد کے اردو نثر نگاروں کی ایک فہرست ترتیب دینے کا کام مولوی سید محمد صاحب کے تفویض ہوا۔

(۳) ادارہ کے زیر اہتمام دکن کی تمام قلمی و مطبوعہ کتابوں کا جو وسیع کتب خانہ قائم کیا جا رہا ہے اس کے لئے کتابوں کے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۴) دائرۃ حضرت میر مومن صاحبؒ میں جو دکن کے جو شاعر یا اہل قلم آسودہ ہیں، ان کی قبریں دریافت کرنے کا کام مولوی میر سعادت علی رضوی کے سپرد کیا گیا۔ تاکہ ان پر کتبے لگا کر یا ان کو محفوظ کرانے کی طرف توجہ کی جائے۔

(۵) ادارہ نے جن شعرا کی قبروں کے کتبے تیار کرائے ہیں، ان کو نصب کرایا جائے۔

## شعبۂ تراجم

[illegible] کو اس شعبہ کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ پروفیسر عزیز احمد صاحب، بی اے، محمد عبدالقیوم خاں صاحب باقی ام اے، فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ، پروفیسر سید فضل حق صاحب ام اے اور ظہیرالدین احمد صاحب ام اے ایچ سی ایس ، ای شریک ہوئے۔ طے پایا کہ

(۱) سب سے پہلے مقبول عام کتابوں کے ترجمے کئے جائیں۔

(۲) تصرف قطعاً جائز نہ ہوگا۔ صرف ترجمہ پر زور دیا جائے۔

(۳) فی الحال انگریزی ادب کی کتابوں سے آغاز کیا جائے لیکن اگر دوسری زبانوں کی کتابیں یا ان کے ترجمے مل سکیں تو ان کا بھی ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔

(۴) ترجموں کے لئے حسب ذیل شعبے منظور کئے گئے
1) Light and Popular Literature
2) Social Sciences 3) Romance, Travel + adventure 4) Art
5) Literary masterpieces
6) Popular Sciences 7) Education

حسب ذیل حضرات نے ذیل کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کا وعدہ کیا۔

(الف) ظہیرالدین احمد صاحب　Methods of Social Study by Webb
مسٹر ویب آئی سی ایس کی تصنیفات متعلقہ ویلیج سدھار

(ب) مولوی سید فضل حق صاحب　Gulliver's Travels.

(ج) فیض محمد صاحب　فارسٹر کی کتاب　A passage to India

ایسی چند کتابوں کا ترجمہ کیا جانا قرار پایا جن کو نوبل پرائز کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

## شعبۂ تنقید

اس شعبہ کا پہلا جلسہ [illegible] ۱۳۵۱ف کو منعقد ہوا۔ مرزا آصف علی خاں صاحب جاگیردار، سید محمد صاحب، نصیرالدین صاحب ہاشمی، پروفیسر سید فضل حق صاحب

ڈاکٹر زور اور پروفیسر سروری داعی موجود تھے۔

اس شعبے کے حسب ذیل مقاصد قرار پائے۔

(الف) اردو تنقیدوں کا معیار بلند کیا جائے۔

(ب) ترقی یافتہ زبانوں کی بہترین اور جدید ترین تنقیدوں کے نمونے اردو میں پیش کئے جائیں اور ان نمونوں پر اردو کتابوں پر تنقیدیں مرتب کی جائیں۔

(ج) ادارے کے رسالہ "سب رس" کو ان کی اشاعت کا ذریعہ بنایا جائے۔

(د) عام ادبی تنقیدوں کے جدید ترین اصول، اسالیب اور نظریوں کو مضمونوں اور کتابوں کی صورت میں شائع کیا جائے۔

(ہ) تنقیدی ادب کو اردو ادب کے شائقین کی رہنمائی کے لئے عوام تک پہنچایا جائے۔

(و) تنقید کے ذریعہ موجودہ اردو ادب کی کتابوں کا صحیح پایہ معین کرنے کی کوشش کی جائے۔

(ز) ترقی یافتہ زبانوں کی مستند علمی ادبی کتابوں اور مضامین کے خلاصے اور ان پر تنقیدی نوٹ شائع کئے جائیں۔

(ح) بلند پایہ ادبی تحقیقات کے نمونے اردو میں پیش کئے جائیں اور ان کی توضیح کی جائے۔

(ط) ایسے اردو ادیبوں کو جو اپنے علمی اور ادبی امور میں مشورہ کرنا چاہیں، شعبہ مشورہ دے۔

(ی) زیادہ سے زیادہ ہر چھ مہینے کے ختم پر اردو اور خاص طور پر حیدرآباد کی جدید مطبوعات کا تعارف عوام سے کرایا جائے اور ان پر تنقیدیں بھی شائع کی جائیں۔ چنانچہ اس نمبر میں اسی شعبہ کی مرتب کردہ تنقیدیں شائع ہو رہی ہیں اور آئندہ بھی یہ کام اسی شعبہ کے سپرد رہے گا۔

اس شعبہ کے لئے مولوی فضل حق صاحب نے مغربی نظریات تنقید پر اور پروفیسر سروری نے شعری نظریوں پر مضامین لکھنے کا اور مولوی سید محمد صاحب نے میتھیو آرنلڈ کی کتاب "تنقیدی مضامین" کے پہلے مضمون کا ترجمہ کرنے اور مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے تمام اردو مطبوعات کی فہرست مع تصریحات مرتب کرنے اور مولوی مرزا سیف علی خاں صاحب نے ہندوستان کی جدید مطبوعات کی فن وار فہرست اور ان پر نوٹ مرتب کرنے کا کام قبول کیا۔ چنانچہ موخر الذکر صاحب نے ہندوستان کی جدید مطبوعات کی فہرست مرتب کر کے روانہ کر دی جو آخر میں درج ہے۔

## شعبۂ نسوان

اس شعبہ کے دو جلسے منعقد ہوئے۔ پہلے جلسے میں رابعہ بیگم صاحبہ، لطیف النساء بیگم صاحبہ بی۔ اے، جہاں بانو بیگم صاحبہ بی۔ اے اور سکینہ بیگم تمنا داعی شعبہ اور دوسرے میں ان کے علاوہ سارہ بیگم صاحبہ بھی شریک تھیں۔

ان جلسوں میں ایک فہرست ایسی خواتین کی مرتب کی گئی جو علمی دلچسپی رکھنے کے علاوہ ادارے کے شعبۂ نسوان کے ساتھ تعاون کر سکیں گی۔ یہ فہرست ان رودادوں کے آخر میں درج ہے۔

(۲) شعبۂ نسوان کی زندگی کا عملی ثبوت دینے کے سلسلے میں یہ طے پایا کہ فی الحال "سب رس" کے دکن نمبر میں خواتین کے مضامین شریک

نہ کئے جائیں بلکہ یہ کام شعبۂ نسوان کے تفویض کردیا جائے جو خواتین سے دکن کے متعلق مختلف مضمون اور نظمیں فراہم کرکے علاوہ کتابی صورت میں شائع کرے۔

(۳) سب رس کے لئے نسوانی فلاح و بہبود سے متعلق مضمونوں کی فراہمی کا کام شعبہ کے سپرد رہے گا۔

(۴) شہزادیانِ والاتبار، لیڈی حیدری اور بیگم صاحبہ ولی الدولہ بہادر سے شعبہ کی سرپرست یا معاون بننے کی استدعا کی جائیگی۔

(۵) زمانۂ ماضی و حال کی مشہور خواتین حیدرآباد کا ایک تذکرہ مرتب کیا جائے جس کے چند مضامین محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ کے سپرد کئے گئے اور بقیہ محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ کے۔ موخرالذکر نے زنانہ کالج کی لڑکیوں سے اس تذکرہ کے لئے مضامین لکھوانے کا ذمہ لیا۔

(۶) انشاء پرداز خواتین کے مضمونوں یا تقریروں وغیرہ کے مجموعوں کے اشاعت کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اور طے پایا کہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے محترمہ طیبہ بیگم صاحبہ مرحومہ کے مضامین کی اشاعت کا انتظام جلد از جلد ہونا چاہئے۔

(۷) شعبہ کے پیش نظر ایسے نسوانی لٹریچر کی تیاری بھی ہے جس میں (ل) امور خانہ داری سے متعلق کتابوں کی تصنیف یا ترجمہ (ب) دوسرے ملکوں میں نسوانی ضرورتوں کے پیش نظر جو کتابیں چھپ رہی ہیں ان کی فراہمی کی کوشش اور ان سے اخذ و اقتباس کرکے سب رس کے لئے مضامین تیار کئے جائیں۔

(۸) ایک ایسے نسوانی کتب خانہ کے قیام کا مسئلہ پیش ہوا جہاں خواتین بلاتکلف جاکر مطالعہ کرسکیں۔ اس بارے میں مجلس نے ادارہ سے خواہش کی ہے کہ اس تجویز کو جلد از جلد عملی جامہ پہنانے میں شعبہ کی مدد کرے۔

(۹) اردو میں بچوں سے متعلق لٹریچر کی کمی کے پیش نظر شعبۂ نسوان نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ اراکین شعبہ اس کی فراہمی کا مستقل انتظام کریں۔ بچوں کے لئے نصیحت آمیز کہانیوں، تاریخی مضمونوں، مشاہیر ہند و دکن کی سوانح حیات آسان اور شستہ عبارت میں فراہم کرنے کی کوشش اور تاریخی واقعات کو کہانیوں اور ڈرامہ کے پیرایہ میں لکھوانے کے انتظام کا ذمہ لیا۔

(۱۰) شعبۂ نسوان نے علمی دلچسپی رکھنے والی خاتونوں کی حسب ذیل فہرست مرتب کی ہے۔

(۱) سارہ بیگم صاحبہ
(۲) تسنیم سلطان بیگم صاحبہ
(۳) نوشابہ خاتون صاحبہ
(۴) قمر النساء بیگم صاحبہ
(۵) ممتاز جہاں بیگم صاحبہ
(۶) افسر جہاں بیگم صاحبہ
(۷) محمدی بیگم صاحبہ
(۸) رحمت النساء بیگم صاحبہ آسیر
(۹) محل مولوی سید امیر حسن صاحب
(۱۰) محل سید ہمایوں مرزا صاحب
(۱۱) راقیہ بیگم صاحبہ
(۱۲) رضیہ بیگم صاحبہ
(۱۳) شاکرہ بیگم صاحبہ
(۱۴) تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ
(۱۵) بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر
(۱۶) بسم اللہ بیگم صاحبہ
(۱۷) عظمت النساء بیگم صاحبہ
(۱۸) محترمہ محبوبہ بیگم صاحبہ
(۱۹) محترمہ درۃ البیضا بیگم صاحبہ
(۲۰) محترمہ معصومہ بیگم صاحبہ
(۲۱) محترمہ رفیعہ سلطانہ بیگم صاحبہ
(۲۲) محترمہ کشور جہاں بیگم صاحبہ
(۲۳) محترمہ امیر النساء بیگم صاحبہ
(۲۴) محترمہ سعیدہ بیگم صاحبہ
(۲۵) احمد النساء بیگم صاحبہ
(۲۶) محترمہ صوفیہ بیگم صاحبہ
(۲۷) محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ ادا
(۲۸) محترمہ صغرا عبدالسبحان صاحب
(۲۹) محترمہ بیگم احسن یار جنگ بہادر
(۳۰) محترمہ نجم النساء بیگم صاحبہ
(۳۱) محترمہ سلامت النساء بیگم صاحبہ
(۳۲) محترمہ انور جہاں صاحبہ قریشی
(۳۳) محترمہ فہیم النساء بیگم صاحبہ
(۳۴) محترمہ سعید النساء بیگم صاحبہ
(۳۵) محترمہ شاہ زمانی بیگم صاحبہ
(۳۶) محترمہ نور النساء بیگم صاحبہ

(۳۷) محترمہ عشرۃ النساء بیگم صاحبہ
(۳۸) محترمہ صبورۃ النساء بیگم صاحبہ
(۳۹) ۔ پاشا بیگم صاحبہ صوفی
(۴۰) ۔ شاہ جہاں بیگم صاحبہ صوفی
(۴۱) ۔ افتخار النساء بیگم صاحبہ
(۴۲) ۔ محبوب النساء بیگم صاحبہ
(۴۳) ۔ شہر بانو بیگم صاحبہ
(۴۴) محترمہ خدیجہ بیگم صاحبہ
(۴۵) ۔ حامد بیگم ۔
(۴۶) ۔ قمر النساء بیگم صاحبہ
(۴۷) ۔ پیاری بیگم صاحبہ
(۴۸) ۔ ممتاز بیگم ۔
(۴۹) ۔ خورشید بیگم ۔
(۵۰) ۔ مریم بیگم صاحبہ
(۵۱) محترمہ اصغری بیگم صاحبہ
(۵۲) ۔ زہرا بیگم صاحبہ
(۵۳) ۔ واحد النساء بیگم صاحبہ
(۵۴) ۔ سرفراز النساء بیگم ۔
(۵۵) ۔ خیر النساء بیگم ۔
(۵۶) محل مولوی لیاقت حسین صاحب بلگرامی
(۵۷) محترمہ صفیہ بیگم صاحبہ صدیقی
(۵۸) محترمہ شیروانی [illegible]
(۵۹) ۔ محل نواب عزیز یار جنگ بہادر
(۶۰) ۔ ۔ ۔ عزیز جنگ ۔ مرحوم
(۶۱) اختر النساء بیگم صاحبہ
(۶۲) حامد النساء بیگم ۔
(۶۳) بیگم صاحبہ ہارون خاں صاحب شیروانی

# مسندِ آصف جاہِ اوّل دیکھ کر

پھر آنکھ میں پھرنے لگیں آزاد فضائیں — پھر جھومتی آنے لگیں عشرت کی ہوائیں
پھر چشمِ تصور میں سمانے لگی دنیا — بے ہوشی سے پھر ہوش میں آنے لگی دنیا
واپس ہوئی رفتارِ فضا آب و ہوا میں — جاں پڑنے لگی وقت کے نقشِ کفِ پا میں
چلنے لگی نوکھنڈے میں اک بادِ بہاری — آنے لگی آصف جہہ اول کی سواری
اب شاہ کو میں جلوہ نما دیکھ رہا ہوں — "اک خواب کی دنیا کو کھڑا دیکھ رہا ہوں"
جب نزع کے عالم میں تھی آزادیٔ اقوام — ہر سمت نظر آتی تھی بربادیٔ اقوام
ظلم اور جفاکاری میں تکرار نکالی ! — اِس ہستیٔ آزاد نے تلوار نکالی
آزادیٔ دامن اور سیاست کو جگایا — ہر دشمنِ انصاف کو دنیا سے مٹایا
شاداب کیا مسلم خستہ کے چمن کو — آزاد کیا سلطنتِ ملک دکن کو
زندہ کئے تہذیب کے مٹتے ہوئے آثار — اور خفتہ تمدن کو کیا خواب سے بیدار
مغلوں کے زمانے کی جو تصویر دکھا دی — اس خاک پڑا آوار کی تقدیر بنا دی
اِس مسندِ خاموشی سے آتی ہے یہ آواز — شاعر کہ ہے افلاک پہ تو مائلِ پرواز
پھر شوکتِ ماضی کو تصور میں بسانے — اس شاہدِ بیتاب کو پہلو میں بٹھانے

شاید ترے رونے سے ہو بیدار زمانہ
پھر کھینچ لے آزادی کی تلوار زمانہ

باقی

---

نوکھنڈے (اورنگ آباد) میں عید کے دن حضرت آصف جاہ اول کی مسند زیارت خاص و عام کے لئے نکالی جاتی ہے۔

# تنقید و تبصرہ

**فٹ بال** مولفہ سید محمد ہادی صاحب ایم اے کنٹب قیمت عہ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد۔ فٹ بال ہندوستان کا سب سے زیادہ مقبول کھیل ہے نہ صرف مدرسوں ہی میں کھیلا جاتا ہے بلکہ خانگی طور پر بھی حیدرآباد کے کھلاڑی زیادہ تر اسی کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ جدید کھیلوں میں یہ بہت کم خرچ بھی ہے۔ باوجود اس مقبولیت کے اس کے متعلق اردو میں سوائے ایک دو رسالوں کے جو پنجاب سے شائع ہوئے ہیں کوئی مستقل کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے حیدرآباد کے مشہور کھلاڑی اور انجمن ورزش جسمانی حیدرآباد کے اعزازی معتمد مسٹر سید محمد ہادی نے جو اس کھیل کے ایک اعلیٰ درجے کے ماہر بھی ہیں، ایک مستقل کتاب مرتب کرکے شائع کی ہے۔ ابتدا میں فٹ بال کی مختصر سی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ کھیل کے ضروری قواعد و ضوابط کو کافی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اگرچہ جو لوگ فٹ بال کھیلتے ہیں وہ ان قواعد کو اپنے روزمرہ عمل کے سلسلے میں جانتے ہیں اور یوں بھی عام طور پر فٹ بال کے اکثر قواعد سے عام کھلاڑی واقف ہیں لیکن بعض موقعوں پر حل طلب مسائل پیدا ہو ہی جاتے ہیں۔ ایسے موقعوں کے لئے یہ کتاب ان کے لئے بھی کارآمد ہو سکتی ہے۔ اساتذہ مدارس اضلاع اور وہ نونہالان ملک جو ابھی اس کھیل کو شروع کرنا چاہیں اس سے خاص طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔ دیہی مدارس وغیرہ کو اس کھیل کی تنظیم کے لئے اس کتاب کی سخت ضرورت تھی۔ کتاب میں ضروری تصویریں بھی ہیں اور چھپائی بھی اچھی ہے مگر قیمت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اچھا ہوتا اگر یہ کتاب کثیر تعداد میں طبع کی جاتی۔ ہر مدرسے میں اس کا ایک نسخہ مہیا کیا جاتا اور کتاب سستی بھی ہوتی۔ س۔م

**حیدر علی** (تاریخی ناول) مصنفہ محمود خاں صاحب [illegible] صفحہ ۱۴۲ سطر ۱۷ کتابت طباعت کاغذ دیدہ زیب قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ محمود [illegible] بک ڈپو ملٹری ڈکنسن روڈ بنگلور مسٹر محمود خاں بنگلور کے مشہور اہل قلم ہیں، جو "سلطنت خداداد" کے مصنف اور رسالہ کوثر کی اڈیٹری کی حیثیت سے دنیائے اردو میں کافی طور پر روشناس ہو چکے ہیں۔ ان کی کتاب "سلطنت خداداد" حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے عہد کی مستند تاریخ ہے۔ رسالہ کوثر نے بھی اردو زبان کی خدمت کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب "حیدر علی" ایک تاریخی ناول ہے جس میں حیدر علی کے "بدنور" فتح کرنے کے حالات درج ہیں۔

"رانی ویرماجی" کی بدچلنی، اپنے شوہر راجہ بسوتاپا نائک کو زہر سے ہلاک کرانا، اس کے متبنیٰ "چن بسویا" کے قتل کی ناکام کوشش، حیدر علی کا بدنور فتح کرنا، اور چن بسویا کو راجہ بنانا، اور اس کے بعد رانی کی سازش اس کا انتشار اور انجام، ہندوؤں کی عیاشی زندگی، مرلیوں اور دیوداسیوں کے حالات وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاریخی مواد کو معتبر تاریخوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ قصہ کا پلاٹ دلچسپ اور اسلوب بیان پسندیدہ ہے۔ اس کا مطالعہ قصہ اور تاریخ دونوں حیثیتوں سے مفید ہو سکتا ہے۔ ن۔ش

**خضر منزل** پرنیہ سائز، صفحہ ۲۰۰، سطر ۱۷ کاغذ طباعت کتابت وغیرہ دیدہ زیب مصنفہ عبدالشکور خاں صاحب بی اے بی ٹی (علیگ) اکبرآبادی۔ صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ [illegible] ضلع عثمان آباد دکن۔

سفرنامہ ادب کا ایک اہم جز ہوتا ہے۔ اس کا مقصد تاریخی، جغرافی، معاشرتی غرض ہر قسم کی معلومات بہم پہنچانا ہو سکتا ہے۔ سفرنامے کا اسلوب بھی ایک خاص چیز ہوتی ہے۔ ان امور کو پیش نظر رکھ کر جو سفرنامے لکھے گئے، وہ آج تک پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں، اور بلاشبہ ادبیات میں اعلیٰ پایہ رکھتے ہیں۔ "سفرنامہ" کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ محض ذاتی واقعات کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ وہ ایسے واقعات کا مجموعہ ہوتا ہے جو عام دلچسپی رکھتے ہیں۔

زیر نظر سفرنامہ تین حصوں میں منقسم ہے، پہلا حصہ ۶۲ صفحات پر ہے آگرہ، اجمیر، دہلی، اور کشمیر وغیرہ کے حالات پر مشتمل ہے، دوسرے حصے میں بنگلور، نیلگری کا تذکرہ ہے جو ایک جز میں آیا ہے، تیسرے حصے میں جو ۱۳ صفحوں پر ہے۔ سیاحت دکن کے عنوان سے حیدرآباد، اورنگ آباد، ایلورہ اور اجنتا کے حالات پر مشتمل ہے۔

سفرنامہ روزنامچہ کی طرز میں لکھا گیا ہے۔ طرزِ نگارش دلچسپ ہے، گیارہ فوٹو بھی شامل ہیں۔ سیاحت دکن کے تذکرہ میں حیدرآبادی طرزِ معاشرت پر بھی مختصر صراحت کی گئی ہے۔ بعض جگہ شہروں وغیرہ کے تاریخی حالات بھی لکھے گئے ہیں، پیش لفظ منظر اکبرآبادی مدیر اخبار "ایشیا" نے لکھا ہے۔ قلیل عرصہ میں کئی مقامات کی سیاحت کرنے والے سیاح کے لئے مفید ہے۔ ایک روپے میں مصنف یا مکتبہ قصر الادب مائی سنڈیا آگرہ سے طلب کی جا سکتی ہے۔ ن م

## طلسم حیات

از جناب ماہر القادری صاحب۔ حجم ۲۲۴ صفحات قیمت مجلد عالی ملنے کا پتہ ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور

بائیس طویل ادبی، سماجی، معاشرتی اور اخلاقی افسانوں کا یہ ایک دلچسپ مجموعہ ہے، ہر افسانہ معاشرت کے کسی نہ کسی پہلو کی اصلاح کا حامل ہے اور اس کے اندر بنی نوع کے لئے مختلف پیام نہاں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے سچے تاثرات، اچھے جذبات، بلند احساسات اور نیک خیالات کے تحت ان افسانوں کو لکھا ہے۔ ان میں ہماری سماج اور معاشرت کی اصلاح کی بہت کچھ کوشش کی گئی ہے۔ یہ افسانے ہماری عادات و اطوار اور اخلاق و کردار کے تعمیری سامان اپنے اندر کافی سے زیادہ رکھتے ہیں

افسوس کہ ایسے اچھے افسانوں کی کتابت غلط ہوئی ہے۔ بے موقع "وادین" کا استعمال پڑھنے والے کے لئے سوہانِ روح ہے۔ جملہ ختم ہی نہیں ہوتے پاتا کہ " وادین " لگا دئے جاتے ہیں۔ ایک دو جگہ نہیں ہر جملہ میں یہ غلطی موجود ہے۔ مشتی نمونہ از خروار سے پہلا افسانہ " دیوانہ ہو گیا ہوں کہ دیوانہ کر دیا " اس طرح شروع ہوتا ہے۔

" تم کو پنیلٹی کے ساتھ کرایہ "

" دینا ہوگا " ـــــــــــ ٹکٹ چیکر نے جھلا کر کہا

پنیلٹی تو میں قیامت تک نہیں دوں گا میں کہہ "

" رہا ہوں کہ آپ گارڈ سے دریافت کر لیجئے " اس کو "

" میں نے ٹرین پر سوار ہوتے ہوئے مطلع کر دیا تھا ـــــــــــ "

سمجھ میں نہیں آتا کہ " وادین " کا یہ بیجا استعمال اور ان کا یہ کثرت کیوں جائز سمجھی گئی۔ اس قسم کی غلط کتابت شروع سے آخر تک ایک طرف پڑھنے والے کو دق کر رہی ہے اور دوسری طرف کتاب کے حجم میں خواہ مخواہ اضافہ کا باعث ہو رہی ہے۔ سرورق پر جو بھدی تصویر بنائی گئی ہے اس کے دیکھنے سے کسی "شاہد بازاری" کی تصویر کا گمان ہوتا ہے۔ ایک سنجیدہ ادبی افسانوں کے مجموعہ پر یہ تصویر کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتی۔ امید ہے کہ جناب مصنف دوسرے ایڈیشن میں کتابت کی ان غلطیوں کی ضرور اصلاح فرماویں گے۔ سرورق کی تصویر کو بھی قطعاً اڑا دینے کی ضرورت ہے۔ س س

## احسن الخیال

مصنفہ مولوی محمد بشیر الدین صاحب آفسر اورنگ آبادی حجم ۶۴ صفحات قیمت ۶ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد

یہ جناب آفسر کی ایک مختصر سی مثنوی ہے۔ جو دراصل مصنف کے خیال کے مطابق صحیح قوم یا مرقع زمانہ ماضی و حال بھی سمجھی جا سکتی ہے۔ جناب آفسر حضرت داغ دہلوی کے تلامذہ سے ہیں۔ لیکن بعد کو اپنے تحاریت ماش جناب احسن مارہروی سے بھی مشورہ لیتے رہے ہیں چنانچہ انہی کے نام سے اس کتاب "احسن الخیال" کو معنون کیا ہے۔ اور ان کے کلام میں بھی داغ سے زیادہ احسن کا رنگ نظم جھلکتا ہے۔

مثنوی احسن الخیال میں مصنف نے تقریباً ساٹھ موضوعوں پر اظہار خیال کیا ہے۔ کلام سے پختہ مشقی ظاہر ہے، زبان سلیس و سادہ اور خوب دلچسپ ہے۔ بطور نمونہ دکن نمبر کی مناسبت سے جناب افسر کی نظم حبِ وطن کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

میرا مولد ہے سرزمینِ دکن ... میرا مسکن یہی، یہی ہے وطن
فطرتاً اس سے اک محبت ہے ... ذرہ ذرہ سے اس کے الفت ہے
مرتے دم تک نہ چھوٹے اس کا ساتھ ... ہے مگر بات یہ خدا کے ہاتھ
چاہیئے عزتِ وطن دل سے ... کیجئے خدمتِ وطن ملی سے
خاک بھی ہے وطن کی اک اکسیر ... نہیں ملتی جہاں میں اس کی نظیر
ہے گلِ تر نظر میں خارِ وطن ... سنگ سبزہ وطن کا ہے مخملی
اور ہوا بھی ہوائے جنت ہے ... ہر گلِ اس کا اک نفائے جنت ہے

# اُردو کی جدید مطبوعات

گذشتہ چند ماہ یعنے ۱۹۴۳ء کے آخر میں اُردو کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں اُن کی فہرست جس کو مولوی مرزا اسیف علی خاں صاحب نے ادارہ کے شعبۂ تنقید کی طرف سے تیار کی ہے۔

۱۔ انسان (انسانیت اور اخلاقیات کے اعلیٰ درس) از جناب کاشی رام صاحب چاولہ حجم ۳۰۰ صفحات قیمت ۸ر
ملنے کا پتہ۔ جناب کاشی رام صاحب چاولہ سپرنٹنڈنٹ ڈپٹی کمشنر آفس ہوشیار پور (پنجاب)

۲۔ ہٹلر اعظم (ہٹلر کی سوانح حیات) از جناب پروفیسر چندر شیکر صاحب شاستری۔ حجم ۴۰ صفحات مجلد قیمت سے
ملنے کا پتہ۔ سیاسی لٹریچر کمپنی۔ (دہلی)

۳۔ باغی (باغیانہ نظمیں) از جناب جاذب قریشی صاحب حجم ۱۲۵ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ
ملنے کا پتہ۔ ایوان ادب۔ اُردو بازار (دہلی)

۴۔ تعمیر نو۔ (زوال اسلام کے اسباب اور تعمیر کے طریقے) از جناب عبداللہ انور بیگ صاحب ام اے حجم ۳۰۰ صفحات قیمت مجلد عہ ۱۴ر
ملنے کا پتہ۔ اُردو اکاڈیمی لاہور

۵۔ سات تارے۔ (سات افسانوں کا مجموعہ) از جناب ایم اسلم صاحب قیسی صاحب رام پوری، انصار ناصری صاحب، فضل حق صاحب قریشی سید ابوطاہر صاحب۔ اشرف صبوحی صاحب، شاہد احمد صاحب
قیمت عہ ملنے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب۔ اُردو بازار دہلی

۶۔ گلستان شرت (اُردو و فارسی کلام کا مجموعہ) از جناب سید ابوالفتح محمد شرف الدین الحسینی صاحب۔ شرت۔ حجم ۱۲۰ صفحات
قیمت ۸ر ملنے کا پتہ حضرت شرت بیگم بازار ڈھاکہ بنگال

۷۔ تین ایکٹ اور دو ڈرامے (تعلیم بالغاں کا خاص نصاب حصہ اول) از آغا محمد اشرف صاحب ام اے و آغا احمد حسین صاحب قیمت ۱۴ر

۸۔ دیو مالا (حصہ دوم تعلیم بالغاں) از سید ابن حسن صاحب جارچوی ام اے۔ بی ٹی قیمت ۱۴ر

۹۔ ڈاکٹر صاحب (حصہ سوم تعلیم بالغاں) از آغا محمد اشرف صاحب ام اے۔ قیمت ۱۴ر

۱۰۔ نئی ایجادیں (حصہ چہارم تعلیم بالغاں) از نفیس احمد صاحب ام اے۔ قیمت ۱۴ر
چاروں حصے ملنے کا پتہ۔ عالی پبلشنگ ہوس۔ اردو بازار دہلی

۱۱۔ بالشتیوں کی دنیا (گلیورز ٹریولز کا ترجمہ) از جناب فخرالدین صاحب باتصویر حجم ۱۲۴ صفحات قیمت ۶ر
ملنے کا پتہ۔ دفتر اخبار ہند۔ ساگر دت لین۔ کلکتہ

۱۲۔ ماہ درخشاں (ناول) از محترمہ بیگم مرزا احمد علی صاحب۔ حجم ۵۰۰ صفحات قیمت مجلد عال
ملنے کا پتہ۔ عالی پبلشنگ ہاوس اُردو بازار دہلی

۱۳۔ قاتل۔ از جناب میاں محمد اسلم صاحب حجم ۲۵۱ صفحات
ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ صور اسرافیل نیلمنگ روڈ لاہور

۱۴۔ طلسم حیات (بارہ افسانوں کا مجموعہ) از جناب ماہر القادری صاحب حجم ۲۴۴ صفحات قیمت عال ۸ر
ملنے کا پتہ ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور

۱۵۔ عدل جہانگیری فارسی مثنوی از پروفیسر محمد عبدالقوی صاحب فانی ام اے۔ قیمت عال
ملنے کا پتہ۔ دفتر البیان محمود نگر۔ لکھنو

۱۶۔ مقالات یوم اقبال۔ مرتبہ انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ۔ لاہور۔ قیمت اردو انگریزی سے
ملنے کا پتہ۔ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور

۱۷۔ نور مشرق (نظموں کا مجموعہ) از جناب مہر لال صاحب ضیاء فتح آبادی۔ حجم ۱۳۲ صفحات مجلد قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ۔ گجندر لال۔ کڑلہ کرانہ۔ پھاٹک حبش خاں دہلی

۱۸۔ علم خانہ داری۔ از محترمہ ممتاز شاہ نواز صاحبہ۔ حجم ۲۷۰ صفحات
قیمت عہ

ملنے کا پتہ۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور

۱۹۔ فرہنگ عامرہ (عربی، فارسی اور ترکی کی لغات کا فرہنگ) مؤلفہ جناب محمد عبداللہ خاں صاحب خویشگی خورجوی۔ حجم ۸۰۲ صفحات۔
قیمت عاں۔

ملنے کا پتہ۔ جناب مولف فیروز منزل۔ متصل جامع مسجد۔ خورجہ

۲۰۔ دہلی کی دو سو برس کی تاریخ۔ از جناب سید حسن صاحب برنی
ام، اے۔ ال ال، بی۔ حجم ۴۸ صفحات
ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

۲۱۔ نیرنگ فطرت (نظموں اور غزلوں کا مجموعہ) از جناب
پنڈت اندر جیت صاحب شرما۔ حجم ۱۷۲ صفحات۔ قیمت عہ ۱۲ر
ملنے کا پتہ۔ مینجر اردو بک ڈپو چھیپرہ۔ میرٹھ

۲۲۔ افکار سلیم (مولانا وحید الدین صاحب مرحوم سلیم کی نظموں کا مجموعہ) مرتبہ جناب محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی حجم ۳۱۸ صفحات
قیمت سے۔

ملنے کا پتہ حالی اکیڈمی پانی پت۔

۲۳ جواہرات (افسانوں کا مجموعہ) از چودھری افضل حق صاحب
حجم ۲۲۴ صفحات
ملنے کا پتہ۔ مسلم پرنٹنگ پریس لاہور

۲۴ پری اور دیگر افسانے (مختصر افسانوں کا مجموعہ) از محترمہ
راحت آرا بیگم صاحبہ۔ حجم ۱۲۸ صفحات
ملنے کا پتہ۔ فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور

۲۵ دیوان بیدار (میر محمدی صاحب بیدار کا دیوان) مرتبہ مولوی
محمد حسین صاحب محوی لکچرار اردو مدراس یونیورسٹی قیمت عاں ہر

۲۶ آئی۔ سی۔ ایس (چودہ افسانوں کا مجموعہ) از جناب
سید علی عباس حسینی صاحب قیمت عہ ۸ر
ملنے کا پتہ۔ انڈین پریس الہ آباد

۲۷۔ کلیات ادویہ (متعلق علم الادویہ) از جناب حکیم کبیر الدین صاحب
حجم ۹۰۰ صفحات قیمت مجلد عہ
ملنے کا پتہ۔ دفتر المسیح قرول باغ دہلی

۲۸۔ تحریک ترقی مملکت آصفیہ۔ از جناب خواجہ حمید صاحب بی، اے (عثمانیہ) حجم ۱۴۴ صفحات
ملنے کا پتہ۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

۲۹۔ جنون و حکمت (جناب جوش ملیح آبادی کی رباعیات کا مجموعہ)
قیمت سے
ملنے کا پتہ۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن

۳۰۔ الو کمی مصیبت (افسانوں کا مجموعہ) از جناب حیات اللہ صاحب انصاری۔ قیمت ۱۲ر
ملنے کا پتہ۔ حالی پبلشنگ ہاؤس اردو بازار دہلی

۳۱۔ من کی دنیا (جدید طرز کے افسانوں کا مجموعہ) از جناب
رشید قریشی صاحب۔ ۱۶۰ صفحات قیمت مجلد عہ
ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد۔

۳۲۔ مدراس میں اردو (ایک مستند تاریخی تذکرہ) از جناب
نصیر الدین صاحب ہاشمی ۲۰۰ صفحات قیمت مجلد ۸ر
ملنے کا پتہ۔ سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد

۳۳۔ تلوار۔ (فن شمشیر زنی پر اردو کی پہلی کتاب) از کیپٹن
اعجاز علی صاحب شہرت قیمت ۶ر

۳۴۔ الخیام (خیام کی رباعیوں کا اردو ترجمہ) از جناب
رائے گورسرن لال صاحب آزاد قیمت ۱۲ر

۳۵۔ دشمن (ایک مثنوی) از گورسرن لال صاحب آزاد قیمت ۴ر

# چار مینار

تکلم بن ہی جاتی ہیں کبھی خاموشیاں تیری
سنی ہیں عرشیوں نے چرخ سے سرگوشیاں تیری

نگاہیں سب پہ ہیں تیری، وطن کا پاسباں ہے تو
تری رفعت کا کیا کہنا، زمیں پر آسماں ہے تو

ترے مینار اکثر کھیلتے ہیں چاند تاروں سے
زمیں پر رہ کے اونچے آسماں کے ماہ پاروں سے

انھیں یہ تفرقہ پردازیاں بھاتی نہیں یکسر
وہ اپنی برچھیاں تانے کھڑے ہیں آسمانوں پر

قطب نے مہر سے لے کر تجھے تابندگی دی ہے
خدا نے تجھ کو شائد جاودانی زندگی دی ہے

نہیں آنکھیں مگر تو آشنائے بیش و کم نکلا
ہزاروں گردشیں آئیں مگر ثابت قدم نکلا

گلے میں اپنے ڈالا سبحہ و زنار کو تو نے
مٹایا امتیازِ کافر و دیندار کو تو نے

"حدیث بود" میں تیری "ثباتِ ہست" ہے اب تک
ترا نقشِ قناعت سیم و زر پر ثبت ہے اب تک

جہاں کے انقلابوں نے کیا ہے تیرا نظارہ
ترے قدموں کا بوسہ لے رہا ہے وقت کا دھارا

تری پیرانہ سالی بھی بہارِ نوجوانی ہے
قطب شاہوں کے ذوقِ حسن کی زندہ نشانی ہے

تصور مٹ چکا بھولے ہوئے خواب پریشاں کا — ہے تیرے سر پہ سایا آصفی شاہوں کے داماں کا
وہی موجِ مسرت اب بھی بہتی ہے جو بہتی تھی — وہی رونق ہے اب بھی تجھ پہ جو ماضی میں رہتی تھی
نگاہوں سے ترے دیوار و در کو چوم لیتے ہیں
ترے اطراف اب بھی جانے والے گھوم لیتے ہیں

میکش

## چار مینار کے بانی سے

اے قطب شاہ چہارم اے دکن کے حکمراں — تیرا چرخِ جلالت نازشِ ہندوستاں
قابلِ عزت ہے تیری ذات اے شاہِ دکن — کیونکہ تو نے اس دکن کو کر دیا رشکِ چمن
اس دکن ہی پر نہ تھی موقوف ایجادِ سخن — تو نے سارے ہند میں ڈالی تھی بنیادِ سخن
قدردانِ شعر تھا تو اے دکن کے حکمراں — عندلیبانِ سخن سے پر تھا تیرا گلستاں
کیا کروں تعریف تیری اے قطب شاہ دکن — فیض سے تیرے ہوی پیدا یہہ اردو انجمن
تو نہیں دنیا میں لیکن اب بھی تیرا نام ہے
اور دکن میں آج تک جاری یہہ فیضِ علم ہے
بعد تیرے یہہ دکن برباد ویراں ہو گیا — شاہ عثماں کی بدولت پھر گلستاں ہو گیا
عشق کی جولانیوں کی یہہ دکن ہے یادگار
حشر تک باقی رہے گا یہہ گلستانِ بہار

محمد مظفر الدین مظفر



شیخ محبوب قریشی

بانی و مہتمم محبوبیہ کارخانہ جلد سازی حیدرآباد دکن

ہر اقسام کی جلد سازی کیلئے ایک دفعہ ہم سے ضرور مشورہ فرمائیے۔

# سب رس کتاب گھر

حیدرآباد، اضلاع اور بیرونی ہند سے دفتر سب رس کو ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات کے علاوہ عام اردو ادب اور خاص کر دکن کی مطبوعات فراہم کرنے کے لئے فرمائشیں وصول ہوتی ہیں لیکن ابھی دفتر نہیں چاہتا کہ ایک مکمل اردو بک ڈپو کے انتظامات کی ذمہ داری لے۔ تاہم اہل ذوق اصحاب کے اصرار پر حیدرآباد کے خاص خاص اور مشہور و معروف مصنفین و شعراء کی کتابیں دفتر سب رس میں فروخت کے لئے حاصل کی گئیں اور خواہشمند اصحاب کے یہاں روانہ کی جاتی ہیں۔ دوسرے اہل ذوق اصحاب کی اطلاع کے لئے ذیل میں ان کتابوں کی فہرست دی جاتی ہے جو سب رس کتاب گھر سے عام بازاری قیمت پر حاصل کی جا سکتی ہیں۔

## تصنیفات حضرت حکیم الشعراء سید احمد حسین امجد

- رباعیات امجد حصہ اول — عہر
- رباعیات امجد حصہ دوم — عہر
- ریاض امجد حصہ اول — عہ
- ریاض امجد حصہ دوم — عہ
- خرقۂ امجدی پیوند — عہ
- نقد امجد — ۱ر
- حج امجد — عال
- میاں بیوی کی کہانی — عہر
- حکایات امجد — عہ
- جمال امجد — سے
- گلستان امجد — سے

## تصنیفات و تالیفات مولوی سید محمد صاحب ایم اے

- ارباب نثر اردو — عال
- گلشن گفتار — ۱۲ر
- مثنویات میر — عال
- ابتدائی قواعد — ۱۲ہر
- یادگار ولی — عال

## کلام استاد سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

- ارمغان عزیز — عال
- متاع سخن — ۱۲ر

## تصنیفات ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

- اردو کے اسالیب بیان — عہر
- اردو شہ پارے — ہے عہر
- روح تنقید — ۱۲ر
- تنقیدی مقالات — ہے عہر
- عہد عثمانی میں اردو کی ترقی — عہر
- محمود غزنوی کی بزم ادب — عہ
- ہندوستانی لسانیات — عال
- ہندوستانی صوتیات (انگریزی) — عال عہر
- فن انشا پردازی — عہر
- طلسم تقدیر — ہر
- سیر گولکنڈہ — ۱۵ر
- گولکنڈے کے ہیرے — ۱۱ر

## تصنیفات و تالیفات پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری

- دنیائے افسانہ — عہر
- کردار اور افسانہ — عہر
- جدید اردو شاعری — عال عہر
- حیدرآباد کی تعلیمی ترقی — عہ
- چینی اور جاپانی افسانے — ۱ر
- انگریزی افسانے — عہر

## کلام سید محمد حسین صاحب آزاد

- خیالات آزاد جلد اول
- خیالات آزاد جلد دوم

## تصنیفات و تالیفات مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی

- یورپ میں دکنی مخطوطات — عہ
- دکن میں اردو — سے عہر
- خواتین عہد عثمانی — عہر
- حضرت امجد کی شاعری — ۱۲ر
- مکتوبات امجد — ۱۲ر
- رہبر سفر یورپ — ۱۲ر
- دکنی — ۱۲ر

ان کے علاوہ ادارۂ ادبیات اردو کی جملہ کتابیں بھی سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہیں

مہتمم

# ادبی شہ پارے

۱۹۳۹ء کا شاہکار

# سالنامہ ادبِ لطیف

دسمبر کے پہلے ہفتے میں

اپنی تمام خصوصیات لئے ہوئے شائع ہو رہا ہے

جو ادبیات کے گرانمایہ ذخیرہ کے لحاظ سے ایک انسائیکلوپیڈیا

اور بہترین مصوروں کی شاہکار تصویروں کا ایک مکمل البم ہو گا!!

## ایک ہی پرچے میں بیک وقت

مسکراہٹیں اور آنسو — قہقہے اور آہیں — طرب و حزن — مسرت اور غم

زندگی کے مست انگیز نغمے — زندگی کی دکھ بھری کہانیاں

## ناممکن ہے کہ آپ ان سے متاثر نہ ہوں

یہ ادبی ذخیرہ ایک آئینہ ہو گا جس میں مشرق و مغرب کی ادبیات کے گوناگوں جلوے اپنی بہار دکھا رہے ہوں گے۔

مستقل خریداروں کو بالکل مفت

مقامِ اشاعت مکتبۂ اردو ۵ اسرکلر روڈ لاہور

پیغمبرِ صحرا — علامہ خالد لطیف گابا — مجلد مطلا عمر

چاند کا گناہ — مجلد

دنیا کی حور — کرشن چاند پوری — مجلد

شہنشاہ حبشہ — اختر اورینوی ایم اے — قیمت ۵

حسن — مجلد

ادبی — مجلد

خیال — نارنگ

کنواروں کے افسانے — کرشن چاند پوری — مجلد

نغمۂ حرم — اختر شیرانی — مجلد

باسی پھول — سید علی عباس حسینی

ترکی جمہوریہ — ضمیر ہاشمی — مجلد

آہنگِ ترنم — قیمت

مکمل فہرست